زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہار سُو

جلد:۱۵' شمارا جولائی' اگست ۲۰۰۶ء

مجلسِ مشاورت

قارئینِ چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

چہار سُو کا زیرِنظر شمارا'
سیاہ بادلوں کی اوٹ سے مشرق کی جانب
پھوٹنے والی
نئی روشنی' نئی امید' نئے حوصلے اور نئے ولولے
سے منسوب ہے۔

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

مدیر معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537' ویسٹریج-III' راولپنڈی۔فون:92-51-5462495 فیکس:5467235 ای۔میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ جہارسُو

سرِ ورق، پسِ ورق...... شعیب حیدر زیدی

قرطاسِ اعزاز...................ادارہ 3

قلبِ منور...................فاری شا 4

نیا عالمی معاشی نظام......ڈاکٹر محمد علی صدیقی 6

براہِ راست.................. گلزار جاوید 11

ادب کا محمد علی پاشا.......... سید ضمیر جعفری 15

تازہ ہوائیں.........ڈاکٹر فرمان فتح پوری 18

ادبی معیارات..............جوگندر پال 21

اردو تنقید..............ڈاکٹر انور سدید 23

محمد علی صدیقی کا عہد.......... قمر جمیل 28

نئی تنقید کا شہسوار..........ریاض صدیقی 30

نقادِ زیست.......... ابوالمعانی عصری 33

صاحب علم تنقید نگار......پروفیسر قیصر نجفی 36

ادبی جہاد...................جاوید منظر 39

منفرد نقاد............... محمود احمد قاضی 40

حقیقت یا افسانہ......ڈاکٹر محمد علی صدیقی 41

سخن تازہ

اشتیاق وانہماک.......... مصطفےٰ ملک 44

محسن احسان، نامی انصاری، مشکور حسین یاد، مرتضےٰ برلاس، نقاش کاظمی، عبدالعزیز خالد، محمود الحسن، کرشن کمار طور، جاوید شاہین، مامون ایمن، یوگیندر بہل تشنہ، سرور انبالوی، عبدالرحمان عبد، اکبر حمیدی، علیم صبا نویدی، صابر آفاقی، قیصر نجفی، غلام مرتضٰی راہی، غالب عرفان، ماجد سرحدی، خیال آفاقی، صدیق شاہد، اصغر مہدی، ملک زادہ جاوید، سید خورشید انور رضوی، شاہد واسطی، انور جاوید ہاشمی، بھگوان داس اعجاز، کاوش پرتاب گڑھی، شارق بلیاوی، غفار بابر، شگفتہ نازلی، حصیر نوری، علی آذر، امتیاز دانش، فیصل عظیم، نوید سروش، خاور خان سرحدی، سیف الرحمٰن، حسن عباسی، پرویز ساحر، مظہر بخاری۔

افسانے

سٹرپِ ٹیز.................جوگندر پال 62

زندگی جاگتی ہے............عذرا اصغر 65

بکائن کی کہانی............انور زاہدی 68

ایلڈرلی لیڈی.............عابدہ تقی 71

مشتاق نگاہیں........... گلزار جاوید 77

نظمِ عصر

حسنِ تدبیر.................وقار جاوید 82

ستیہ پال آنند، حمایت علی شاعر، یوگیندر بہل تشنہ، عبدالعزیز خالد، رفعت سروش، نقاش کاظمی، علیم صبا نویدی، قیصر نجفی، دِل نواز دِل، بھگوان داس اعجاز، سجاد مرزا، خیال آفاقی، شگفتہ نازلی، کرامت بخاری، صابر عظیم آبادی، کاوش پرتاب گڑھی، علی آذر، حصیر نوری، فیصل عظیم، مدن لعل گلاٹھی۔

نشانِ راہ

غالب کی نعتیہ غزل......ڈاکٹر سید تقی عابدی 94

آئینۂ فن

مجھے نہ کرو وداع.............پروفیسر قیصر نجفی 97

اعترافِ ہنر

کیول دھیر کی کہانیاں............ منشایاد 99

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف...... عطیہ سکندر علی 101

رس رابطے

جستجو، ترتیب وتدوین.......... اعجاز کھوکھر 109

☆☆☆☆☆☆☆

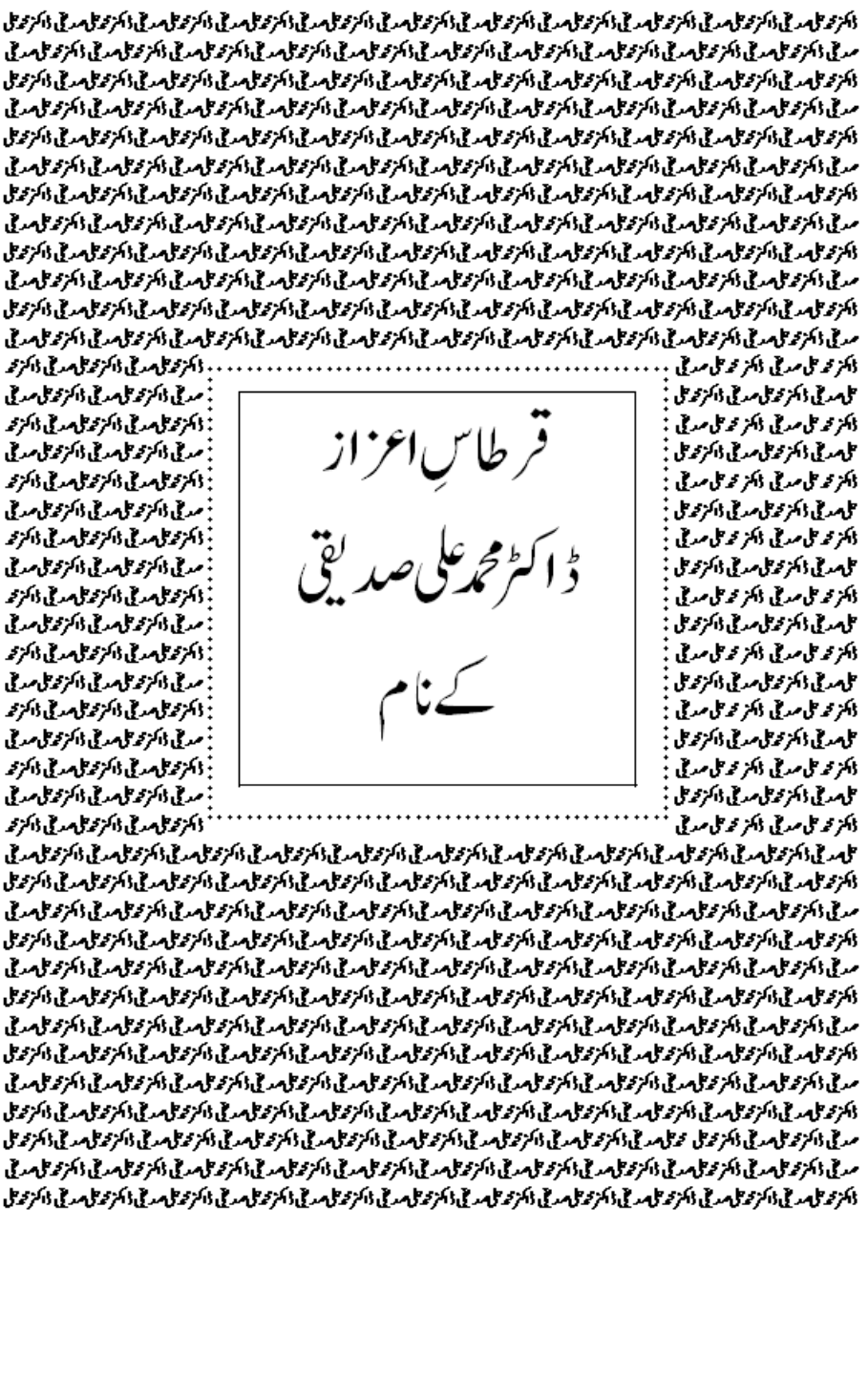

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

کے نام

قلبِ منوّر

قاری شا

نام: محمد علی صدیقی

پیدائش: 7مارچ1938'امروہہ

قومیت: پاکستانی

معاشرتی حیثیت: شادی شدہ

علمی استعداد: ایم اے انگلش کراچی یونیورسٹی

پی۔ایچ۔ڈی پاکستان اسٹڈیز' کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹرآف لٹریچر پاکستان اسٹڈیز' کراچی یونیورسٹی

زباں فہمی: اردو' انگلش' فرینچ' فارسی' سندھی' پنجابی اور سرائیکی

ذمہ داریاں:

1۔ ڈائریکٹر (پروفیسر) قائداعظم اکیڈمی' حکومت پاکستان 1994-1998' 1999-2001

2۔ ڈیوٹی ایمنٹ پروفیسر' کراچی یونیورسٹی 1998

3۔ اسسٹنٹ پروفیسر' کراچی یونیورسٹی1988-1998

4۔ اسسٹنٹ پروفیسر' ادبی و ثقافتی ورثہ پاکستان اسٹڈیز سینٹر یونیورسٹی آف کراچی 1988-1998

5۔ ادبی کالم نگار 1964تا حال

6۔ سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر پاکستان اینڈ گلف اکانمسٹ' 1981-1998

7۔ سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ حریت' 1975-1981

8۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر بزنس ریکارڈر 1962-1975

تصانیف:

1۔ توازن (تنقید) پاکستان رائٹرز گلڈ سے بہترین کتاب کی حیثیت سے انعام یافتہ 1976

2۔ کروچے کی سرگزشت (ترجمہ) 1976

3۔ نشانات (تنقیدی مضامین کا انتخاب) 1981

4۔ پاکستانیت (حصہ اول) ڈاکٹر ایچ۔ایم جعفری کے تدوین شدہ 1989

5۔ مضامین (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 1991

6۔ اشارے (تنقیدی مضامین کا انتخاب) 1994

7۔ قائداعظم' حالاتِ زندگی (اردو) اہتمام اشاعت' قائداعظم اکیڈمی کراچی

8۔ قائداعظم حالاتِ زندگی (انگلش) اہتمام اشاعت' قائداعظم اکیڈمی کراچی

9۔ قائداعظم کی تقاریر (انگلش) اہتمام اشاعت' قائداعظم اکیڈمی کراچی

10۔ قائداعظم اردو ادیبوں کی نظر میں (اردو)' اہتمام اشاعت' قائداعظم اکیڈمی کراچی

11۔ ذکرِ قائداعظم (اردو) اہتمام اشاعت' قائداعظم اکیڈمی کراچی

12۔ سرسید احمد خان اور جدت پسندی (اردو) اہتمام اشاعت ارتقا مطبوعات کراچی 2003

13۔ سرسید احمد خان اور جدت پسندی (اردو) دوسرا ایڈیشن اہتمام اشاعت مختصر اکیڈمی کراچی

14۔ تلاشِ اقبال (اردو) اہتمام اشاعت کراچی یونیورسٹی 2002اور 2003

15۔ مطالعۂ جوش ملیح آبادی (اردو) اہتمام اشاعت ارتقا مطبوعات' کراچی

16۔ غالب اور آج کا شعور (اردو) اہتمام اشاعت ادارہ یادگارِ غالب کراچی

17۔ اردو تنقید دورِ حاضر میں (اردو) زیرِ اشاعت

مضامین اور کالم: ایک ہزار ایک سو سے زائد انگریزی اور دو ہزار سے زائد اردو زبان میں

رُکن:

1۔ پاکستان رائٹرز گلڈ پاکستان

2۔ انجمن ترقی اردو پاکستان

3۔ ڈیوی ایشن لٹریچر کریٹک انٹرنیشنل پیرس

4۔ یورپین یونین آف رائٹرز اینڈ سائنٹسٹ' روم

5۔ فونڈر میر انٹرنیشنل کونسل آف آرٹس' کراچی

6۔ ارتقا انسٹیٹیوٹ آف سوشل سائنس' کراچی

7۔ اکادمک کونسل' ہمدرد یونیورسٹی' کراچی

8۔ ممبر' ریسرچ کمیٹی پاکستان اسٹڈی سینٹر یونیورسٹی آف جامشورو (سندھ)

9۔ ممبر' پاکستان کونسل آف سوشل سائنٹسٹ' اسلام آباد

10۔ ممبر بورڈ آف گورنرز اردو ڈکشنری بورڈ فیڈرل منسٹری برائے تعلیم، کراچی

11۔ ممبر بورڈ آف سٹڈیز اردو ڈپارٹمنٹ فیڈرل یونیورسٹی کراچی

12۔ ممبر گورننگ باڈی مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

13۔ چیئرمین مجلسِ فروغِ ادب انعام کمیٹی دوحہ، قطر

ادارتی رکن:

1۔ انٹرنیشنل بورڈ آف ڈائریکٹرز (ریسرچ) آئی او سی، کیمبرج

2۔ ممبر بورڈ آف سٹڈیز، اردو ڈپارٹمنٹ فیڈرل اردو یونیورسٹی کراچی

3۔ ممبر بورڈ آف گورنرز اردو لغت بورڈ اور ممبر ایگزیکٹو کمیٹی اردو لغت بورڈ، کراچی

4۔ ارتقا، کراچی

5۔ سپوتنک لاہور

6۔ الزبیر بہاولپور

7۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ

ممتحن برائے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی:

1۔ ہمدرد یونیورسٹی

2۔ یونیورسٹی آف کراچی

3۔ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

4۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

5۔ کول کتہ یونیورسٹی بھارت

مقالے، مضامین:

1۔ سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی برطانیہ 1981

2۔ سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی برطانیہ 1982

3۔ کارلٹن یونیورسٹی اٹاوہ، کاناڈا 1984

4۔ اکیڈیا یونیورسٹی ہیلیفیکس، کاناڈا 1984

5۔ ونڈسر یونیورسٹی، کاناڈا 1984

6۔ ٹورنٹو یونیورسٹی، کاناڈا 1984

7۔ یونیورسٹی آف البرٹا، کاناڈا 1984

8۔ سیمن فریزر یونیورسٹی، وینکوور، کاناڈا 1984

9۔ وکٹوریا یونیورسٹی، وکٹوریا، کاناڈا 1984

10۔ یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا، وینکوور، کاناڈا 1984

11۔ یونیورسٹی آف گلف، کاناڈا 1984

12۔ مک ماسٹر یونیورسٹی، کاناڈا 1984

13۔ یورک یونیورسٹی، کاناڈا 1984

14۔ کنکورڈیا یونیورسٹی، کاناڈا 1985

15۔ اوسلو یونیورسٹی، ناروے 1985

16۔ AICL سالانہ اجتماع سٹیونجر، ناروے 1986

ادبی اجتماعات میں شرکت:

1۔ انٹرنیشنل اردو کانفرنس، نیو یارک، امریکہ 1983

2۔ انٹرنیشنل اردو کانفرنس، مانٹریال، کاناڈا 1983

3۔ انٹرنیشنل اردو کانفرنس ٹورنٹو، کاناڈا 1983

4۔ انٹرنیشنل اردو کانفرنس، اوسلو، ناروے 1985

5۔ انٹرنیشنل آف لٹریری تنقیدی کانفرنس AICL، سٹیونجر، ناروے 1985

6۔ اردو انٹرنیشنل کانفرنس (سجاد ظہیر کی ادبی خدمت) کاناڈا 2005

7۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سیمینار (غالب کی تفہیم) دہلی، بھارت

8۔ ساہتیہ اکادمی سیمینار (سجاد ظہیر، فکر اور ادبی مقام) دہلی بھارت

اعزازات: 1۔ پرائیڈ آف پرفارمنس (ادب) 2003

2۔ بابائے اردو ایوارڈ 1995

3۔ منتخب سکالر برائے کینیڈین ایسوسی ایشن آف ساؤتھ ایشیا سٹڈیز 1984

4۔ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی کے طالب علم محمد اقبال نے ڈاکٹر قاضی عابد کی نگرانی میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی فن و شخصیت پر 2004 میں ایم اے کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔

موجودہ حیثیت: ڈین فیکلٹی آف ہمدرد اینڈ سوشل سائنسز اور ایکٹنگ ڈائریکٹر ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ سوشل سائنسز، مدینۃ الحکمت، محمد بن قاسم روڈ، کراچی۔

رہائش: A-592، بلاک J، ناظم آباد کراچی 74600 فون: 0092-21-6633638

نیا عالمی معاشی نظام اور تیسری دنیا

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

سب سے پہلے تو میں پروفیسر ممتاز حسین میموریل سوسائٹی اور دوتا ادبی فورم کا شکر گزار ہوں کہ ان اداروں کے عہدیداروں نے اس سال کے ممتاز حسین یادگاری لیکچر کے لئے میرا انتخاب کیا۔ مجھے اس انتخاب کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ میں پروفیسر ممتاز حسین اور ان کی فکر سے بہت متاثر رہا ہوں اور ہنوز ہوں۔ یہ "ہنوز" والی بات بھی خوب رہی لیکن ماجرا اس دور میں جب متعدد حضرات نے اپنے نظریات کو خیرباد کہہ دیا ہے اور Post Modernism کی لہر نے بنیادی مسائل کو حاشیوں کے سپرد کر دیا ہے پروفیسر ممتاز حسین کے ادبی نظریات زیادہ روشن ہوئے ہیں اور دھندلانے کے بجائے روشن تر ہو چکے ہیں۔

سرد جنگ کے زمانہ میں دو باہم متضاد نظریات کا تضاد کرشن چندر کے افسانہ "مہالکشمی کا پل" کے قطبین کی طرح واضح تھا لیکن ہمارے دور میں Socio-linguistics اور Psycho Linguistics نے اس درجہ ترقی کی ہے کہ اب سامراج اپنے دشمن کو بھی "حقیقی دوست" اور اس کے خلاف جنگ کو بھی Operation Fair Play کہہ سکتا ہے اور کیا مجال کہ بیان کرتے ہوئے اس کی آنکھ ایک لمحہ کے لئے بھی نیچی ہو جائے۔ اب سفاک اور ہولناک مقاصد کے بیان میں نیتوں کا اخفاء اس درجہ مہارت کے ساتھ ہونے لگا ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ دشمنی کے لئے دلداری اور بہی خواہی کی اصطلاحیں کیوں استعمال ہو رہی ہیں۔ شاید علامتوں کو تصورات اور استعاروں کے اضدادی جوڑوں binary opposites کے ذریعہ سمجھنے کی ایک دلیل یہ بھی ہو کہ اب حقیقت حال یا مافی الضمیر ہماری لغات Dictionaries میں دیئے گئے معانی کے برعکس مفاہیم کے ذریعہ ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس قانون کا ہر تحریر پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ دریدا Derrida نے بھی اپنے نظریہ کی کسری fractional or partial صداقت پر اصرار کیا ہے۔ ہمارے یہاں بالعموم سیاہ اور سفید کے مابین خاکی grey علاقہ نہیں ہوتا اس لئے grey علاقہ کی دریافت ہی علم کا وظیفہ بن کر رہ گیا ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین اور ان کے بعض معاصر بالخصوص سجاد ظہیر جیسا کہ ہم ان کی Literary Theory سے بخوبی واقف ہیں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ عہد کے ادب میں بالائی طبقہ کی خواہش پر اس عہد کے infarstructure کو قائم و دائم رکھنے کے expressions کے پس پشت دیکھنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ نقاد کے فرائض میں سے ایک فرض "ادبی اظہار" کے پیچھے حقیقی مفاہیم کی پرتوں کی تلاش سمجھتے تھے جبھی تو یہ ممکن ہوا کہ سجاد ظہیر "ذکر حافظ" میں حافظ شیرازی کے اشعار میں گل و بلبل اور صیاد کے پیچھے استحصال کی anatomy سمجھ سکیں اور یہ کہہ سکیں کہ حافظ کے یہاں ازمنہ وسطیٰ کے ظلم و ستم کے لئے جواز کے بجائے انسان دوستی کی زیریں لہر تلاش کی جائے۔ اب ظاہر ہے کہ ظ۔ انصاری نے اس توجیہ کے لئے گنجائش چھوڑی تھی۔ پروفیسر ممتاز حسین نے "رسالہ در معرفت استعارہ" اور پھر "غالب" پر اپنی تصنیف کی کلید سے لغوی مفاہیم کے بجائے اصلی مفاہیم کے دروازے کھولے۔

میں اپنے لیکچر میں کوشش کروں گا کہ جبر و استبداد کے infrastructure میں ادبی تفہیم کے لئے نئی کھڑکیوں کی ضرورت پر زور دیا جائے۔ یہ کام بہت مشکل سہی لیکن ایک ایسے دور میں جب جبر و استبداد کو سمجھنے کے لیے استعارہ اور علامتوں کی کھڑکیوں کے بجائے دروازے اور پھاٹک کھل چکے ہوں اور دنیا unipolar بن چکی ہو ادبی اظہار کے اصل متن تک رسائی وقتاً زیادہ مشکل بنتا جا رہا ہے۔ اب اس پیچیدگی سے نمٹنے کا صرف ایک راستہ یہ ہے کہ ہم آج کی دنیا کی ان سیاسی و معاشی حقیقتوں پر تجزیاتی نظر ڈالیں جنہوں نے ہمارے دور کو ایک عجیب دور بنا دیا ہے جو بیک وقت انتہائی سادہ اور انتہائی پیچیدہ ہے۔ سادہ ان معنوں میں کہ اب صرف ایک سیاسی طاقت دنیا پر بلا شرکت غیرے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنا چاہتی ہے اور ادب، کلچر، معیشت اور مخصوص نظام حکومت کے متعین پروگرام کے علاوہ کسی متبادل راستے یا vision کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لئے ہم 1960 کی دہائی کی طرف چلتے ہیں۔ 1960 کے عشرہ کا خاتمہ اقوام متحدہ کی طرف سے پہلے ترقیاتی عشرے سے موسوم ہے۔ جنرل اسمبلی کے ۲۵ویں سیشن میں معاشی ترقی کے بلند تر اہداف مقرر کئے گئے۔

ستمبر 1976 میں جنرل اسمبلی بین الاقوامی صنعتی restructuring کا پہلے ہی اعلان کر چکی تھی جس کی رو سے عمل سے بعض صنعتوں کی جنوب کی جانب منتقلی تھی تا کہ بین الاقوامی صنعتی تعاون کی شکل میں resoruce transfer ہو سکے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ صنعتی ممالک اپنی ان صنعتوں کا رخ کم ترقی یافتہ ممالک کی طرف موڑ دیں جو معاشی طور پر مسابقت کھو رہی ہیں۔ ان سے structural adjustment کا کام لیا گیا تا کہ تیسری دنیا کے قدرتی اور انسانی وسائل کو بہتر طور پر استعمال کیا جائے۔ نیتیں بہت اچھی تھیں اور اس نئے عالمی معاشی نظام میں وعدہ کیا گیا تھا کہ عالمی معاشی نظام کی بنیاد انصاف، اقتدار اعلیٰ کی مادی حیثیت، مشترکہ مفادات، باہمی انحصار اور ملکوں کے مابین تعاون پر قائم ہوگا۔

نئے معاشی عالمی نظام کا اعلان اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے

اجلاس منعقدہ 1979ء میں اس وقت ہوا جب معاشی حقوق کے نئے چارٹر کے ضمن میں ایک پروگرام آف ایکشن کے عملی اقدامات کا آغاز ہوا یعنی ہم آج جس globalization کے خطرے سے دوچار ہیں وہ مغربی ممالک کی طرف سے اقوام متحدہ کے ذریعہ ایک نیا عالمی معاشی نظام قائم کرنے سے شروع ہوا تھا جس کا مقصد غریب اور پسماندہ تیسری دنیا کے ممالک کی معاشی ترقی میں ممد و معاون ہونا تھا۔

گذشتہ تیس (۳۰) سال کے عرصہ میں جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اب بھی ملٹی ممالک کے پاس نہ اقتدار اعلیٰ ہے نہ ان کے ساتھ انصاف ہو رہا ہے اور نہ باہمی مفادات کا تحفظ ہے بلکہ جو ملک بھی ان میں سے کسی ایک نکتہ پر لب کشائی کرے اس کا خمیازہ تنہا اور بدحال ممالک میں ہوگا۔

اب یہ حقیقت فراموش کی جا چکی ہے کہ ہم جسے globalization کا عمل کہتے ہیں اس کے پس پشت اقوام متحدہ ہے مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ کم ترقی یافتہ ممالک کا عالمی تجارت میں حصہ ۲۵ فی صد تک بڑھایا جائے جبکہ اب تک حاصل یہ ہوا ہے کہ یہ حصہ ۱۳ فی صد سے آگے نہیں بڑھ سکا گزشتہ ۲۵ سال میں یہ ہوا کہ ہم تیسری دنیا پر مغربی دنیا کے معاشی تسلط کی بحالی سے اقوام متحدہ کے کردار کو طاقتور نیاں کے حوالہ کر چکے ہیں اور اب اس بحیاتک انسانی ذرائع کے key players میں سے بھی کم ہوتے ہوئے صرف دو تین ممالک بلکہ Neo-Conservativism کے فلسفہ کو انسانی فلاح و بہبود کا واحد نظریہ حیات تسلیم کروانے کے حق میں ہو رہے ہیں۔

اب اقوام متحدہ کے اہداف اگر نہیں اہداف تسلیم کرلیا جائے تو وہ پس پشت چلے گئے ہیں یعنی اب یہ اہداف عالمی تجارت کا کارپوریٹ نظام بن کر رہ گئے ہیں اور MNCs کے کام کی نوعیت ترقی پذیر ممالک کی صنعت اور زراعت کے دروازے ترقی یافتہ ممالک پر کھول دینے اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کو Parent Countries میں بھیج دینے کے حق سے غریب ممالک مزید غریب ہو رہے ہیں۔ صنعتوں کو ایک جگہ locate نہ ہونے، مصنوعات کے پرزے ایک ملک میں نہ بننے اور خام مال ایک source سے حاصل نہ کرنے کی وجہ سے ایک entrepreneur اپنی مصنوعات کو ٹاپ ریکٹر پر بیٹھے ہوئے متعدد ممالک سے پرزے بنوا کر کسی بھی ملک میں assemble کروا سکتا ہے اور اس طرح مصنوعات کی تیاری میں محنت کش مزدوروں کا حصہ کم سے کم ہو سکے۔ اس لئے کہ یہ دور ایسی technology کا دور ہے جو مزدوروں کی جگہ لینا چاہتی ہے شاید اسی لئے اسے post industrial age کہا جا رہا ہے۔

اس وقت دنیا بڑے giants کے حصار میں ہے کہ ۲۰۰ بڑی کمپنیوں میں سے امریکہ کی 80، جاپان کی 55، برطانیہ کی 18، جرمنی کی 17 اور فرانس کی 16 کمپنیوں کے پاس 200 بڑی کمپنیوں کے 85 فی صد Assets ہیں۔ یہی صورت حال مالیاتی اداروں کی ہے۔ اگر ہم دنیا کے 100 بڑے بنکوں کے assets کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس وقت بڑے امریکی اور جاپانی بنکوں کے پاس دنیا کے سو بڑے Assets میں سے آدھے assets ہیں۔ امریکی دانشور اور ماہر معاشیات پروفیسر گالبراتھ نے ایک امریکی رسالہ (American Economic Review, March 1983) میں لکھا ہے کہ:

''جب جدید کارپوریشن کو مارکیٹ پر اقتدار حاصل ہو گیا تو اقتدار انسانی کمیونٹی Community تک پھیل گیا اور پھر ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ اقتصادیات پر بھی یہ اقتدار مملکت کے اقتدار ہی کے مانند ہے'' یہ معاملہ ادب اور کلچر تک جا پہنچا ہے اور اب ادب ہوا تو ان نظریہ کی دوسری شاخیں جو نظریہ بھی سکہ رائج الوقت ہے وہ بین الاقوامی کارپوریشن اور بین الاقوامی مارکیٹ کے تابع ہے۔ ادب میں متن کی اضافت یعنی یہ کہ جتنے قاری اتنے متن۔

یہ ایک نیا مابعد صنعتی دور ہے جس میں پیداوار کے تینوں معروف ذرائع زمین، زر اور سرمایہ کی ایک جگہ نہیں ہیں صرف منافع ایک جگہ ہے جیسے ادب میں بھی اب متن کی مرکزیت ختم کی جا رہی ہے اور peripheral معانی کے نظام کو Core Meaning کے نظام پر فوقیت دی جا رہی ہے۔

ترقی پذیر ممالک کی غالب اکثریت مختلف enterprizes کی free mill کی مدد سے کم پیچیدہ، زیادہ پیچیدہ اور بہت زیادہ پیچیدہ ٹیکنالوجی حاصل کرتی ہے اور پھر ایک وہ وقت آتا ہے کہ وہ اپنی حاصل کردہ technology سے حاصل شدہ مصنوعات سے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی سے مقابلہ بھی نہیں کر سکتیں۔ آپ اندازہ لگائیں ترقی یافتہ ممالک اقوام عالم پر تحقیق R&D پر ہونے والے خرچ کا 97 فی صد خرچ کرتی ہیں جبکہ باقی دنیا صرف 3 فی صد۔

اس وقت دنیا کی حالت یہ ہے کہ دنیا کی سو (۱۰۰) اہم معاشی units میں سے ۵۰ حکومتیں اور ۵۰ بین الاقوامی Multinationals اور ان Multinationals میں بھی 62 امریکی اور 35 یورپی ہیں اور صرف 12 یا 3 جاپان کی ہیں۔ اس وقت بین الاقوامی کمپنیوں کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے بعض کمپنیاں متعدد ممالک کے بجٹ سے بھی زیادہ ہیں مثلاً پورے براعظم افریقہ کی کل آمدنی سے زیادہ صرف دس بین الاقوامی کمپنیوں کی آمدنی ہے۔ پاکستان کے بجٹ سے زیادہ متعدد Multinationals کا بجٹ ہے۔ یہ Multinationals حکومتیں بناتی ہیں اور تبدیل کرتی ہیں۔ خود امریکہ پر بین الاقوامی کمپنیوں کے Republican اور Democratic Cartles حکومت ہوتی ہے۔ جب امریکہ کی یہ حالت ہو تو پھر امریکہ کے اشاروں پر رقص کرتے ہوئے ممالک کی حیثیت اور سیاست کا اندازہ لگایا جا سکتا

ہے حقیقت یہ ہے کہ اب دنیا شطرنج کے کھیل کی ایک بڑی بساط ہے اور ممالک اس بساط پر رکھے ہوئے pawns ہیں اور شطرنج کے اس کھیل کے لئے Corporate Capital نام نہاد حکومتوں کا نمائندہ ہے اور ساری جنگ Corporate Capital کے لئے مکمل اقتدار کی ہے جب کہ نام نہاد حکومتیں اقوام متحدہ کے ذریعہ ایک ایسی make-believe کیفیت قائم رکھنا چاہتی ہیں جس سے یہ باور کیا جا سکے کہ کارپوریٹ capital کو ایک حد تک شکنجے میں بند کرنے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے یعنی گرفتار حکومتیں اپنی اسیری کے لئے کاوش کرنے والے Corporate Capital سے یہ کہہ رہی ہیں:

اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کے لئے
تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

صرف کوکا کولا کمپنی کا بجٹ پاکستان کے بجٹ سے چوگنا زیادہ ہے

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ ادب اور ثقافت کے شعبوں میں مابعد جدیدیت Post-modernism نئے عالمی نظام کا حصہ ہے جس کی اضافت کے سارے مباحث "تاریخ کے خاتمہ" End of History کے نظریہ سے جڑے ہوئے ہیں یعنی دنیا جن کلاسیکی مسائل مثلاً غربت اور امارت کے مابین آویزش سے گھری ہوئی تھی اور اس کے خاتمہ کے لئے جمہوریت اور سوشلزم کے درمیان جو رسہ کشی ہو رہی تھی وہ اب ختم ہو چکی ہے اب صرف جمہوریت ہی واحد طرز حکومت ہے اور جمہوریت کے ساتھ اس کا وہ illusion یا myth بھی جو ایک سماجی طور پر قلاش اور بے زر delinquent فرد کو مسند اقتدار پر براجمان ہونے کے خواب دکھاتا ہے صرف خواب ہی نہیں دکھاتا بلکہ اس یقین میں مبتلا کر دیتا ہے کہ غربت ایک بے معنی صورت حال ہے۔ مابعد جدیدیت ضروری کو غیر ضروری اور غیر ضروری کو ضروری گرداننے کا نام ہے حالانکہ اسے زیادہ اہم اور کم اہم مسائل کو یکساں طور پر اہم گرداننے والے Discourse کا مؤید اور وکیل بھی سمجھا جا سکتا تھا لیکن جب طبقاتی سماج اہم وجود ہی نہ رہے بلکہ ختم شدہ مسئلہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر reason کی کیا ضرورت ہے کہ یہ تو Modernism کے ساتھ قصۂ پارینہ قرار دے دیا گیا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے گردان لیا گیا ہے فرض کر لیا گیا ہے وہ اس وجہ سے باقی ہے کہ جب تک ہم ان Hypotheses کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں اور انہیں اپنے عمل سے Invalid قرار نہ دے سکیں اس وقت تک ہماری دنیا کلاسیکی مسائل کے ہوتے ہوئے بھی مسائل کے بارے میں خواب خرگوش یا تجاہل عارفانہ میں گرفتار ہے۔

آخر یہ سب کیوں ہے؟ اس مقالہ میں میری کوشش ہوگی کہ میں جس صورت حال سے بخوبی واقف ہوں اس کے بارے میں یہ فرض کروں کہ کئی نسل کے سامنے جس نے ابھی تک زندگی کے کھیل میں تمام تر جوانیوں کے ساتھ جذبہ اور جوش کو زیادہ اہمیت دی ہے اس کے سامنے کچھ پیش پا افتادہ حقائق سامنے رکھوں۔ ان حقائق سے بخوبی واقف حضرات اسے گفتگو کا غیر ضروری حصہ قرار دے سکتے ہیں لیکن بہر حال یہ حصہ باقی حصوں کے ساتھ مربوط ہے اور اس لئے آپ سب کی توجہ کا مستحق بھی۔

آج کی دنیا امریکی مفکر خاجہ کے جون جوڈس (John Judes) کے خیال میں ایک ایسے عبوری دور میں داخل ہو چکی ہے جو اُنکی ازم سے Anachronism کی حدود میں داخل ہو رہا ہے۔ ہم اس وقت (۲۰۰۰ء سے) نو رجعتی (neo-conservatism) دور میں داخل ہو چکے ہیں جس کے مسلمات (Postulates) میں درج ذیل عقائد شامل ہیں:

☆ فی زمانہ فنائی صورت حال خیر اور شر کے درمیان انتخاب چاہتی ہے اور سیاسی کریکٹر کی صحیح پہچان یہ ہے کہ صاحبان خیر جب شر سے مقابلے کے لئے پوری طرح تیار رہیں۔

☆ مملکتوں کے مابین روابط متعین کرنے کا واحد ذریعہ فوجی طاقت اور اسے استعمال کرنے کے لئے رضامندی ہے۔

☆ مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام امریکہ کے بیرون امریکہ مفادات کی بنیادی آماجگاہ ہے۔

مندرجہ بالا تین بنیادی عقائد پر عمل پیرا ہونے کے لئے نو رجعت پسند:

☆ بین الاقوامی مسائل کو اخلاقی طور پر قطعیت کے حامل قضایا (absolutist categories) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اب صرف وہی اس اخلاقی ترفع کے اونچے مقام پر ہیں اور کہتے ہیں کہ اصحاب خیر یعنی نو رجعتی (neo-conservatives) کے درمیان اختلاف رائے صرف دشمن کو فائدہ پہنچا سکتا ہے (یعنی اب اسلام ہی دشمن نمبر ایک ہے اور ہر وہ اقدام جو اسے نقصان پہنچائے "خیر" ہے)۔

☆ نو رجعت پسند امریکی طاقت کے یک قطبی ذخیرہ پر اصرار کرتے ہیں اور وہ فوجی کارروائیوں کو آخری ترجیح کے بجائے پہلی ترجیح سمجھتے ہیں۔ وہ "ویتنام سے سبق" لینے کے ذریعہ کی مذمت کرتے ہیں جس کا مقصد امریکی طاقت کے استعمال سے روکنا ہے بلکہ وہ "میونخ کے سبق" پر یقین رکھتے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ حملے کے خطرہ سے پہلے حملہ کرنے کی پہل اور جرات سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔

☆ نو رجعت پسند روایتی سفارتی اداروں جیسا کہ امریکی محکمۂ خارجہ یا مخصوص ممالک کے لئے عملی حکمت عملیوں کے بارے میں تجربات کی بنیاد پر حکمت عملیاں وضع کرتا ہے اسے یکسر غلط خیال کرتے ہیں جو کہ وہ امریکی پالیسیوں کی نظریاتی صاف گوئی کو کم کر کے پیش کرتی ہیں بلکہ ان حکمت عملیوں

کے بارے میں مغالطے پھیلاتی ہیں۔

☆ قدامت پسند کثیر الجہاتی (یا کثیر الاقوامی) اداروں اور معاہدوں کو ناپسند کرتی ہیں بلکہ انہیں ناروا سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ بین الاقوامی اداروں کی طرف سے تنقید غیر ضروری اور نیکی کی امریکی منشا اور حکمتِ عملی کو حق بجانب ٹھہراتی ہے۔

اس سلسلہ میں گزشتہ سال دو اہم Policy Statements سامنے آئی ہیں۔ جون لیوس گیڈس (John Lewis Gaddis) کی Surprise, Security & the American Experience اور والٹر رسل میڈ (Walter Russell Mead) کی کتاب Power, Terror, Peace & War۔ ان دونوں مطالعوں / کتابوں کا خیال ہے کہ امریکہ روز اول ہی سے جارحانہ قوم پرستی پر عمل پیرا ہو رہا ہے۔ ان مطالعوں کا لب لباب یہ ہے کہ امریکی جارحیت پسند حکمتِ عملی محض ایک تاریخی غلطی نہیں ہے بلکہ یہ امریکہ کی تاریخی روایت کا حصہ ہے۔ ان مطالعوں کا خیال ہے کہ 9/11 کے بعد امریکہ جس تذبذب کا شکار ہے وہ غلط ہے امریکہ پر لازم ہے کہ وہ دنیا بھر میں امریکی اقدار قائم کرنے کے لئے طاقت استعمال کرے۔

امریکی وزارتِ خارجہ کے ایک اہم سفارت کار رہ چکنے والا انتہائی اہم مطالعے جنہیں Stefan Halper/Jonathan Clarke کی کتاب OPEN DEMOCRACY سے ما بعد جدیدیت کے پس پشت سیاسی عزائم اس قدر واضح ہیں کہ سرد جنگ کے زمانہ میں سوشلزم کی مخالفت میں جمہوریت کا صرف چہرہ ہی نظر آیا کرتا تھا لیکن سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد سوچنا پڑے گا کہ آیا جمہوریت سے مراد امریکہ کے نو قدامت پسند رجحان (neo-Conservatives) کا تصورِ جمہوریت ہے جس کا تصور "خیر" اور "شر" ہی مغرب کے معاشی و سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لئے فوجی طاقت کا بے دریغ استعمال ہے۔

اب آپ بین الاقوامی معاشی سیاست پر نظر دوڑائیے WTO میں امریکہ اور دیگر بڑی مغربی طاقتوں کو ان کی بڑی معیشتوں کی رعایت سے غیر متناسب حق حاصل ہے جسے آپ حقِ استرداد بھی کہہ سکتے ہیں۔ WTO کے معاہدہ کے تحت بڑے ممالک کو صنعت اور زراعت کے بعد سروسز خدمات فراہم کرنے پر بھی مکمل آزادی ہوگی۔ WTO کے تحت غریب ممالک کے وسائل اور زمینوں پر قبضہ کا پروگرام ہے کارپوریٹ فارمنگ اور اناجوں کے بیجوں (seeds) کو Patent کرانے پر غریب ممالک کو ان کے روایتی بیجوں سے بھی محروم کیا جا رہا ہے۔ اب باسمتی چاول کے بیج بھی امریکی کمپنیوں نے اپنے نام رجسٹرڈ کرا لیا ہے۔ اس وقت براعظم افریقہ کی حالت اس قدر دگرگوں ہے کہ غریب افریقی ممالک کے قرضے معاف کر دینے کی تجویز کے بعد بھی زیمبیا، کانگو اور جنوبی افریقہ جیسے معدنی ذخائر سے مالا مال ممالک بھی اپنے عوام کو Aids کی دوائیں بھی فراہم نہیں کر سکتے۔ ان ممالک پر multinationals کے پسندیدہ منشا مسلط ہیں اور ان مالدار ممالک میں غریب عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہیں۔

صنعتی شعبہ میں زبردست عالمی مسابقت کے علاوہ زراعت بھی بہت خطرناک مسائل سے دوچار ہے۔ (1) زراعت میں سو فی صد بیرونی سرمایہ کاری کی اجازت دی جا چکی ہے (2) سرمایہ دار کو تمام منافع باہر پہنچانے کی اجازت ہے (3) سرمایہ دار کو آسان شرائط پر قرضے دئے جائیں گے (4) اس پر زمین خریدنے کی کوئی پابندی نہیں ہے (5) مشینری اور آلات کی درآمد پر ڈیوٹی میں مکمل چھوٹ (6) علاوہ ازیں فارم کا منافع ٹیکس سے آزاد ہو گا۔

اس تفصیل سے مترشح ہوتا ہے کہ اب ملکتیں نہ تو اپنی صنعتوں اور نہ اپنی زراعتوں کو زیادہ طاقتور ممالک کی حریصانہ اور جارحانہ حکمتِ عملیوں سے محفوظ رکھ پائیں گی۔ نہ صرف یہ بلکہ ان حکمتِ عملیوں کے خلاف احتجاج بھی مغربی ممالک کے اربابِ حل و عقد کے لئے "شر" اور "غیر جمہوری طرزِ عمل" کے مترادف ہوگا۔

اسٹیفن ہالپر اور جاناتھن کلارک نے اپنی تصنیف OPEN DEMOCRACY میں جسے OPEN SUBJUGATION بھی پڑھا جا سکتا ہے، جس طرح آزاد دنیا کی تنقید کو امریکی حکمتِ عملیوں کے لئے باعثِ راحت و اطمینان ثابت کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف وہی ٹھیک ہے جو امریکہ کے Neo-Conservatives یا اس سے بہتر اصطلاح Neo-Liberals کے لئے ٹھیک ہے۔ ہمارے ملک میں جمہوریت کے بعض بڑا جمہوریت کے اس نئے تصور سے پوری طرح آشنا معلوم نہیں ہوتے جس میں امریکی جمہوری اقدار کے فروغ کا مطلب صرف امریکی غلامی کی دستاویز پر دستخط کرنے کے مترادف ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر ہمارے یہاں کی قوم پرست طاقتیں نام نہاد مغربی جمہوریت کی حاکمیت اعلیٰ کی چھتری سے پہلو تہی کریں اور اپنی معاشی و سیاسی ترقی کے لئے اپنے قومی مفادات کے لئے جمہوریت کے آبرو مندانہ تصور کی وکالت کریں تو غلط نہ ہوگا چونکہ نئی اور پرانی طرح کی عالمی سیاست میں جمہوریت کمزور اقوام کو سرنگوں کرنے کے لئے ایک مجرب ہتھیار ہے۔

شاید اسی لئے 9/11 کے واقعہ سے بہت پہلے برازیل کے شہر پورٹو الیگرے Porte Alegro کے پہلے ورلڈ سوشل فورم (25 تا 31 جنوری 2001) میں منعقد ہونے والے ورلڈ سوشل فورم نے کچھ اصول و ضوابط وضع کئے تھے جنہیں تسلیم کئے بغیر کوئی فرد یا تنظیم ورلڈ سوشل فورم کا حصہ نہیں بن سکتی۔ ذیل میں چند اصول درج کئے جاتے ہیں:

1۔ ورلڈ سوشل فورم سوچ بچار، بحث مباحثہ اور مکالمہ کے لئے ایک کھلا فورم ہے جہاں تجربات، خیالات اور تصورات کا تبادلہ ہو سکتا ہے نیز ان تنظیموں اور تحریکوں کو ایک مشترکہ آواز دی جائے جو سامراجی گلوبلائزیشن اور سرمایہ دارانہ غلبہ کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں اور ایک پرامن اور خوشحال انسانی برادری تشکیل دینے کی خواہاں ہیں۔

2۔ ورلڈ سوشل فورم میں جس نئی دنیا کا خواب دیکھا گیا وہ اس دنیا سے یکسر مختلف ہوگی جس پر آج کثیر قومی کارپوریشنیں، قومی حکومتوں اور عالمی مالیاتی اداروں کی مدد سے حکومت کر رہی ہیں۔ یہ دنیا تمام انسانوں کو مساوی احترام دے گی اور ایسے جمہوری عالمی ادارے تشکیل دے گی جو سماجی انصاف، برابری اور آزادی کے لئے کام کریں گے۔

3۔ ورلڈ سوشل فورم معاشرے اور معیشت کے بارے میں ہر قسم کے غیر لچکدار خیالات کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ ورلڈ سوشل فورم کے نزدیک سچائی کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا کسی کو اپنے خیالات کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے دباؤ، دھاندلی اور تشدد کا استعمال کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ ورلڈ سوشل فورم جمہوریت، انسانی حقوق بجائے باہم انسانی مساوات اور نسلوں، صنفوں اور ثقافتوں کے درمیان امن و آشتی کا پرچار کرتے ہوئے غلبہ، تشدد اور ناانصافی کی ہر شکل کی مذمت کرتا ہے۔

4۔ ورلڈ سوشل فورم تبادلۂ خیال اور برداشت کا کلچر قائم کرنے کا خواہش مند ہے۔ ورلڈ سوشل فورم سمجھتا ہے کہ ماحولیات کو تباہی سے بچانے، معیشت اور سیاست کو امن و انصاف کی راہ پر گامزن کرنے نیز سماجی برابری اور امن پر مبنی معاشرے کے قیام کے لئے سیاسی و ثقافتی رنگارنگی کا احترام انتہائی ضروری ہے۔

گزشتہ سال وینزویلا میں منعقد ہونے والے ورلڈ سوشل فورم کے اجلاس میں واضح طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ سوشلزم ہی آج بھی عالمی مسائل کا حل ہے۔

ورلڈ سوشل فورم کی طرف سے عالمیانے (Globalization) اور اس کے مضمرات پر تنقید ہمارے اس دعوٰی کی دلیل ہے کہ جس طرح مابعد جدیدیت کی ادبی تھیوری کے لئے وہ سارے مسائل حل ہو چکے ہیں جو طبقاتی سماج کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح عالمی نظام میں بھی امریکہ کے رجعت پسندوں یا نیولبرل ازم کے حامیوں کے لئے جمہوریت کے ایک ایسے تصور کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جو قوموں کے درمیان جمہوریت کی حامی ہو، اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے جمہوری فیصلوں پر عمل پیرا ہونے کی حامی ہو یعنی جمہوریت اب صرف خودغرض، غاصب کارپوریٹ سرمایہ (Capital) کے حامیوں کی داشتہ لونڈی ہے جو تیسری دنیا کے کمزور ممالک کو اپنے دامِ فریب میں پھانسنے ہی کو اہلِ خیر کا شیوہ سمجھتی ہے اور اپنے خلاف ہر آواز کو فی الفور حملہ کی دھمکی سے نیچا دکھانا چاہتی ہے۔

تو پھر حقیقی جمہوریت سوائے تیسری دنیا کے عوام کے لئے اس حق کے علاوہ اور کیا ہے کہ ہم جمہوریت کی اس نئی تعریف کے خلاف صف آرا ہو جائیں اور ایک ایسی جمہوریت کے لئے کام کریں جو ایک ملک کے اندر تمام عوام کے حقِ ملکیت اور دنیا میں اقوامِ عالم کی اکثریت کے فیصلوں پر عمل درآمد کی حامی ہو۔

لسانیات کی سطح پر تصورات، اعتبارات اور عقائد کو سماجی، تہذیبی، جغرافیائی اور نفسیاتی علتوں کے تحت پرکھنا بجائے خود ایک فکری بحران کا باعث بنتا چلا گیا۔ یہ سلسلہ خیال، ڈیکارت کے خلاف جاتا ہے یعنی انحصار کو تجرباتی سائنس کے برعکس نظریاتی سطح پر سمجھنے کی کوشش۔

ایک طرف یہ کوشش تھی اور دوسری طرف مابعد جدیدیت یا پس ساختیاتی فکر تصورات کی تشکیلی ساخت نے سچ دریافت پر زور دیا جس میں سائنس و ٹیکنالوجی کو ترقی کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا اور مغربی معاشرہ جو اس ترقی پر نازاں ہے، دراصل ایک مغالطہ کا شکار ہے۔

دریدا کی ردِ تشکیل (Deconstruction) میں صرف معنی سے انکار نہیں ہے بلکہ اس کے یہاں معنی کے انتصابا یا کلیہ کا رد ہے۔ اس کا خیال ہے کہ معنی کی غیر موجودگی میں بھی معنی کی دریافت کا پہلو نکلتا ہے۔

خود کو ترقی یافتہ سمجھنے والی اقوام کی ریاکاری ایک مفروضہ ہے۔ اس کے نمایاں نظریات میں کچھ چھوٹی یا نظرانداز کی جانے والی تہذیبوں اور قوموں اور ان کے ادب اور قصہ بیانیوں کو از سر نو دریافت اور اہمیت اجاگر کرنا شامل ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ نظرانداز کی جانے والی تہذیبوں اور کلچر کا مطالعہ بنیادی سطح Core Issue یعنی سماجی عدم مساوات پر کیونکر حاوی ہو گیا۔

یہ سارے نظریات یوں لگتا ہے کہ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنانے پر لگے ہوئے ہیں۔ یعنی ایک طرف مغرب کی سائنسی اور صنعتی ترقی کو مفروضہ (myth) قرار دے کر تیسری دنیا کے ممالک کے دانشوروں کو ایک ایسے romance سے نجات دلانے کے لئے تصورات کی تفہیم کے راستے میں متن کے کردار سے متعلق ساختیات، پس ساختیات، ردِ ساختیات کے جھمیلوں میں الجھانے کی شعوری کوششیں ہوئیں اور ترقی پذیر ممالک عالمی تجارت میں جس کی بنیاد سائنسی ترقی ہی پر ہے، دس فی صد حصہ بھی نہ حاصل کر پائے ہیں، پیشرفت کے لئے منڈیوں کی صورت میں رسائی پانے پر اضطراب کے بجائے خوابِ خرگوش میں مبتلا رہیں۔ یہ ایک طرح سے corporate capital اور MNCs کی طرف سے دنیا بھر پر چھا جانے کی کوششوں میں تیسری دنیا کے ممالک کو ایک ایسی فکری درآمد کی کوششوں سے عبارت ہے جو MNCs اور World Bank کی سیاسی اور معاشی حکمت عملیوں کے لئے تیسری دنیا میں intellectual support مہیا کریں۔

براہِ راست

تیسری دنیا بالعموم مسلم دنیا بالخصوص میں کم علمی اور کم فہمی کے لئے اکثر مطعون ٹھہرائی جاتی ہے۔ ہمارے علوم و فنون اور تخلیقی و تنقیدی ادب کو دنیا کی زبانوں سے گذار کر نکل رہے وقت دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں منتقل کیا جاتا تو اس طرح کا تاثر قائم کرنے والوں کو اگر ہم ان کی رائے سے باز نہ رکھ پاتے تو کم از کم ان کے فکری بیانوں پر دستک دینے کے اہل ضرور ہوتے۔ آج کی نشست میں شرق و مغرب کے تہذیب اور بالغ نظر دانشوروں کو متاثر و مسحور کرنے والے شاعر و محقق، ادیب، نقاد اور دانشور ڈاکٹر محمد علی صدیقی جلوہ افروز ہیں۔ جن کی موجودگی اور ہمہ جہتی کے زیرِ اثر ہم کس قدر ثروت مند، کس قدر قابلِ افتخار اور کس قدر ایمان مند ہیں اس کا اندازہ زیرِ نظر تحریر کے مطالعے اور اس کی روشنی میں غور و فکر سے ہی لگایا جا سکتا ہے!!!

گلزار جاوید

☆ ادب کے ابتدائی ایام اور تخلیق کی بابت کچھ بتائیے؟

☆☆ اسکول کے دنوں میں ادب کی طرف جھکاؤ پیدا ہوا۔ اردو افسانہ نے مجھے سب سے پہلے متوجہ کیا۔ کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے زیادہ پسند آئے۔ خاص طور پر کرشن چندر کے افسانے جن کر اُن کے اسلوبِ نگارش میں بڑی جاذبیت نظر آتی تھی۔

☆ ایریل کے قلمی نام سے کالم لکھنے کی وجوہات کیا تھیں؟

☆☆ جب روزنامہ ''ڈان'' کے اُس وقت کے ایڈیٹر جناب الطاف حسین اور ''انجام'' کے جناب جمیل انصاری مرحوم نے اپنے اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر منصور ہاشمی مرحوم سے ادبی کالم شروع کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے مشہور نقاد ممتاز حسین مرحوم سے رابطہ قائم کیا اور اُن سے ادبی کالم لکھنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے میرا نام تجویز کیا۔ ایڈیٹر ''ڈان'' نے چاہا کہ یہ کالم کسی قلمی نام سے لکھا جائے۔ روزنامہ ''انڈین ایکسپریس'' بمبئی میں ملک راج آنند ایک عرصے تک ایریل Ariel کے نام سے کالم نویسی کرتے رہے تھے۔ تجویز آئی کہ کیوں نہ اسی قلمی نام کو اختیار کیا جائے۔ Ariel شیکسپیئر کے ایک ڈرامے کا ایک شرارتی کردار ہے۔ Ariel آندرے ماروا کی مشہور انگریزی شاعر شیلے کی سوانح حیات کا بھی عنوان ہے۔ مجھے یہ نام اچھا لگا اور اس طرح 1965-66 سے یہ کالم شروع ہوا۔ اس کالم نے خاصا اچھا اثر ڈالا۔ مجھے نیا درما آزادی کے ساتھ اپنے خیالات پیش کرنے کی آزادی اچھی لگی۔

☆ شاعری سے عشق اور بیگانگی کی بابت کچھ کہیئے؟

☆☆ شاعری سے میرا عشق کم زور نہیں ہے۔ البتہ 1980 کے بعد شاعری نے اپنی وہ چمک دمک کھو دی ہے جو 1970 تک موجود تھی۔ 1980 سے کم طاقتور تخلیقی آوازیں باقی رہ گئی ہیں۔ ان دنوں اچھے اشعار خال خال نظر آتے ہیں۔ بہت سے شعراء نثری نظم کی طرف شاید اسی لیے آئے کہ ان میں شعری جمال اور ذوق کی موجودگی نہ تھی۔ زبان و بیان پر بھی مضبوط گرفت نہ تھی۔ شاعری ادب کی سب سے اعلیٰ قسم ہے اگر اسے اعلیٰ فنکار نصیب ہی نہ ہوں تو پھر بیاضِ زبان پر بھی لاگو پڑتی ہے۔ زبان پر آئے گی تو پھر سخن فہمی ہی پر الزام آئے گا۔

☆ سنا ہے انگریزی زبان میں آپ اب بھی شعر کہتے ہیں؟

☆☆ میں نے ایک عرصے تک ملک کے اعلیٰ جرائد مثلاً ماہنامہ 'Vision' Outlook اور Viewpoint میں انگریزی شاعری کی۔ اب بھی نظمیں لکھتا ہوں لیکن چھپواتا نہیں ہوں۔

☆ کچھ ہجرت کی صعوبتوں کی بابت روشنی ڈالئے؟

☆☆ میں اکتوبر 1949 میں اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان آیا۔ والد صاحب جولائی 1947 ہی میں کراچی آ گئے تھے۔ میرے آبائی شہر امروہہ میں فسادات کی وبا نہ پہنچی تھی۔ امروہہ سے قریب ترین جگہ گڑھ مکتیسر Garh Muktesar میں (دریائے گنگا کے کنارے ہے اور میرے آبائی شہر سے 13-12 میل کے فاصلہ پر ہے) بہت بھیانک فساد ہوا تھا۔ میں بذریعہ ریلوے ٹرین کراچی آیا۔ مجھے ہجرت کی صعوبتوں سے پالا نہیں پڑا۔

☆ آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کا انتخاب پاکستان کیوں تھا؟

☆☆ میرے والد کٹر مسلم لیگی تھے اور تقسیمِ برصغیر سے قبل ہی کراچی آ گئے تھے۔ میرے دادا اور والد نے لاہوری میں زندگی گزاری۔ ایک طرح سے میرے خاندان کا بڑا حصہ بڑی حد تک ''لاہوری'' جبکہ والدہ کی طرف سے ''امروہوی'' ہے۔

☆ آپ کے مزاج میں سائنسی طرزِ فکر نمایاں ہونے کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ میرے مزاج میں سائنسی رویہ کیوں دخیل ہے؟ آپ نے صحیح حساب لگایا ہے۔ میں فکری طور پر ''نامعلوم'' کے دائرہ کو کم سے کم دیکھنا چاہتا ہوں۔

☆ مصوری میں بھی آپ جداگانہ نقطہ رکھتے ہیں جو عبارت پر دلیل ہے اس کی بھی ٹھوس وجوہات یقیناً ہوں گی؟

☆☆ میں نے مصوری پر بہت لکھا ہے کم سے کم 100 مصوروں پر۔ حنیف رامے مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ مصوری کی تنقید سے مایوس نہیں ہیں چونکہ ابھی محمد علی صدیقی جیسے نقاد موجود ہیں۔ حنیف رامے مرحوم نے قدرے فیاضی سے کام لیا ہے لیکن میں مصوری، موسیقی اور ادب کے باہمی رشتوں کو اپنے زمانے کے فکری میلانات کے تناظر میں دیکھنے کا قائل ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ بعض مصور اس تناظر میں مصوری نہیں کرتے بلکہ مغربی تناظر کو اپنا قومی

تاثر قایم کر بیٹھے ہیں۔

☆ امریکی اور دیگر مغربی جامعات میں آپ کی مانگ اور آپ کے تجربات کی بابت ہمارا اشتیاق لائق توجہ ہونا چاہئے؟

☆☆ مغرب میں ادب زندگی گزارنے کے لئے لازمی عمل نہیں بلکہ خود زندگی ہے۔ وہاں کامیاب ادیب ہونا معاشی طور پر فارغ البال ہونے کے مترادف ہے اس لئے وہاں نعرہ بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ مغرب کے ادبی افراد بہت جدید ہیں۔ ہمارے یہاں بقول ساحر ملکی مسائل کی بہتات ہے لیکن افراد زیادہ بہتر نہیں ہیں۔

☆ AICL (پیرس) میں جنوبی ایشیا کے واحد رُکن کے طور پر آپ کے انتخاب کی وجوہات اور آپ کے تجربات کی نوعیت کیا ہے؟

☆☆ AICL (قاریوں کی بین الاقوامی انجمن) کی رکنیت کے بارے میں یوں ہے کہ یہ انجمن اپنی ممبر شپ بہت دیکھ بھال کر تفویض کرتی ہے انگریزی میں میرے ایک ہزار سے زائد کالم/مضامین اس انتخاب کا سبب بنے یہ کالم AICL تک پہنچے۔ اُردو ادب کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ یہ دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے (بولے جانے کے حوالے سے) اور اس زبان کا بیشتر ادب تصوف اور ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ خود بخود نظریات Phenomenology اور وجودیت Existentialism اور مابعد جدیدیت Post-Modernism کی طرف جھکاؤ پیدا ہوگا۔ یعنی ہم ان کے خیال میں ابھی تک بچپن یا جوانی کے مرحلے میں ہیں اور ابھی غیر ترقی یافتہ اقوام کے حوالے سے۔

☆ آپ اپنے دوستوں کی نیک خواہشات اور اپنی بے بضاعتی کے درمیان آویزش کا شکار کیوں ہو رہے ہیں؟

☆☆ آپ دوست خیال کرتے ہیں کہ میں ابھی تک اپنے اصلی مقام پر نہیں ہوں اگر میں نے انہیں مایوس کیا ہے تو یہ بے بضاعتی ہی کا نتیجہ ہوا۔

☆ آپ کے بارے احباب کے طرز احساس اور سوچ پن پر بہت زور دے رہے ہیں؟

☆☆ یہ تو احباب کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ وضاحت کریں کہ وہ مجھ میں کیا دیکھتے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنے سماج کو ایک ترقی یافتہ سماج دیکھنا چاہتا ہوں لیکن کیا ہماری نوزائیدہ قیادت اپنے قرطاس مرگ پر دستخط کر سکتی ہے۔ ملکی ترقی کا خواب بذات خود ایک رومانوی رجحان ہے۔ مجھے وہ ادب پسند ہے جو سماج کی جذباتی اور فکری بالیدگی میں بھرپور کردار ادا کر سکے۔ ہمارے ادب کا بڑا حصہ بقول علامہ اقبال یاسیت کا شکار رہا ہے۔ اس میں مغرب کی طرح زندگی کے بارے میں رجائیت کا رجحان ترقی پانا چاہئے۔

☆ اختر حسین رائے پوری جیسا جید نقاد اور عالمی پائے کے شاعر فیض احمد فیض کس بنیاد اور فلسفے کی روشنی میں ناقدین کی صف میں آپ کو منفرد صاف اور شفاف مقام پر فائز کرتے ہیں؟

☆☆ میرے بارے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور فیض احمد فیض صاحب کی اچھی آراء نے مجھے کام کرنے کا مزید حوصلہ بخشا۔ مجھے فخر ہے کہ اپنے وقت کے بیشتر اہم اردو اکابر نے میری ہمت افزائی کی ہے اسے آپ میری خوش قسمتی شمار کریں مجھے یقیناً میری بساط سے زیادہ ملا ہے۔ مجھے پاکستان میں لکھی جانے والی بیشتر تنقید اضطراری نوعیت کے Inputs کی زائیدہ نظر آتی ہے۔ ہم مغربی تنقید کے نئے رجحانات کو اندھی تقلید کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ ان رجحانات کی تنقید سے کتراتے ہیں۔ میں نے جس مغربی رجحان پر لکھا ہے اس کا تنقیدی تجزیہ critique ہی لکھا ہے خواہ وہ ساختیات ہو (جس پر میں نے پہلا باقاعدہ مضمون 1975 میں لکھا تھا) یا مابعد جدیدیت ہو۔ میرے نظامِ فکر میں یہ سارے رجحانات اپنی اساس اور اپنی ترکیب میں ہماری حقیقتوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہمارے دیہات میں ابھی تک پیر ر انجھا سوہنی مہینوال، سسی پنوں اور بہت سی مثنویاں چوپالوں میں گائی جاتی ہیں جہاں ستر فی صد آبادی رہتی ہے۔ ہمارے ان پڑھ لوگ بھی ان کی موسیقی اور پیغام سے مستفیض ہوتے ہیں۔ مغربی ادب کی تحریکوں سے لگاؤ رکھنے والے خود ذہنی اقلیت ہیں لیکن وہ خود کو "ادبی اشرافیہ" سمجھ بیٹھے ہیں اور عوام سے اپنی دوری پر اس درجہ نازاں ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ خود پیدا کردہ اجنبیت Alienation انہیں کیونکر ادبی طور پر زندہ رکھے گی۔

☆ آپ ادب کے موجودہ منظرنامے سے نالاں کیوں ہیں؟

☆☆ آپ کے 58 سالہ ادب کا جائزہ لیا جائے تو 1980 تک کا ادب خاصہ جاندار ہے۔ میں نے شاعری کے بارے میں آپ کے سوال کے جواب میں اس سبب کی وضاحت کر دی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ 1970 کے بعد فکشن میں قابل قدر کام ہے اور وہ یوں کہ اب فکشن نگاروں کے لئے جم کر بیٹھنے اور لکھ سکنے کا زمانہ آچکا ہے۔ تراجم بھی اسی سبب بہت ہوئے لیکن میں 1980 کے بعد کے ادب کو اس "چاشنی" سے محروم دیکھتا ہوں جو بڑے ادب کا لازمہ ہوتی ہے۔

☆ آپ کے بارے یہ تاثر بجا طور پر قائم ہے کہ آپ کسی ادب پارے کا تجزیہ کرتے ہوئے دوسرا ادب پارہ تخلیق کر لیتے ہیں؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ میں ایک ادب پارہ کا تجزیہ کرتے ہوئے دوسرا ادب پارہ تخلیق نہیں کرتا۔ یہ بات درست ہے کہ ادب پاروں کے تجزیے آپ کو ایک اور دنیا میں ضرور لے جاتے ہیں۔ اسی لئے تنقید کو مغرب میں تخلیق ہی سمجھا جاتا ہے چونکہ اچھی تنقید تخلیق کاروں کے لاشعور کا کھوج لگاتی ہے اور صرف "شعوری معنوں" پر اکتفا نہیں کرتی۔ شعوری معنی بالکل غلط معنی بھی ہو سکتے ہیں چونکہ یہ "اصل صورت حال" پر پردہ ڈالتے ہیں۔

☆ ممتاز مفتی مرحوم کہا کرتے تھے میں پنجابی میں بولتا ہوں، انگریزی میں سوچتا اور اردو میں لکھتا ہوں۔ اگر آپ کی بابت بھی یہ کہا جائے کہ آپ کی سوچ کا ماخذ انگریزی زبان و ادب ہے تو آپ کیا فرمانا پسند کریں گے؟

☆☆ آپ نے بجا فرمایا۔ اب بیشتر ادیب انگریزی ہی میں سوچتے ہیں اور اپنی اپنی زبانوں میں لکھتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ میرے سے لڑکا انسان مر گیا تو یہ املا فرانسیسی مزاج کا جملہ ہے۔ ایسے ہزاروں جملے شعوری یا لاشعوری طور پر در آمد کئے گئے ہیں اور اب ہماری سوچ میں رچ بس گئے ہیں۔

☆ اس طرح کے طرزِ عمل سے انسان کی شخصیت دو حصوں میں نہیں بٹ جاتی؟

☆☆ اس طرح کے رویے سے شخصیت دو حصوں میں تقسیم نہ ہوگی اگر انگریزی میں سوچنے کا عمل، اپنی سوچ کا عمل بن سکے۔ آپ ایک تصویر دیکھتے ہیں اور تصویر کی بے زبانی میں اپنی زبان رکھ دیتے ہیں تو پھر یہ اپنی ہی سوچ بن جائے گی۔

☆ آپ خالصتاً مشرقی مزاج کے آدمی ہوتے ہوئے مغربی ادب سے کس طور متاثر ہوئے اور اردو ادب کو اس سے کیا فوائد ہوئے؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ مغربی فکری رجحانات پر تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں وہ قدرتی ردِ عمل ہی کہلائیں گے۔

☆ آپ کے ہاں فن کو نظریے سے الگ شے تصور نہیں کیا جاتا جبکہ دنیا نظریاتی دور سے نکل کر مفاداتی دور میں داخل ہو چکی ہے؟

☆☆ دیکھئے اب ہم دوبارہ نقطۂ نظر Viewpoint اور نظریات Ideology کی عمل داری کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ نظریہ بھی طبقاتی یا گروہی یا انفرادی نقطۂ نظر کی وکالت کرتا ہے۔ آپ اسے "مفاداتی" کہہ لیں۔ آخر "طبقاتی مفادات" معتبر جانے ہیں۔

☆ آپ کے ہاں مغربی مصنفین کے حوالہ جات سے مرعوبیت کا احساس ابھرنے لگتا ہے؟

☆☆ میرے یہاں مغربی نقادوں کی بھرمار نہیں بلکہ تخلیقی شہ پاروں میں مغربی مناہج کے غیر رسیدی استعمال پر گرفت ہوتی ہے۔ اگر انور سجاد "خوشیوں کا باغ" لکھیں گے تو پھر اس تمثیل کی تخلیقات کے تقابلی محاکمہ کی ضرورت پیش آئے گی۔ ہمارے یہاں لسانیات کی بحث میں جس نے بھی حصہ لیا اُس کے مضمون میں مغربی اسمائے معرفہ کی بھرمار ہی نظر آئی۔ میں نے "در جواب آں غزل" تنقیدی محاکمہ کیا ہے۔ دعوٰی کے ساتھ دلیل کا لازمہ ضرورت بن گئی۔

☆ آپ کے استدلال میں اکثر کھردرے پن کی شکایت بھی کی جاتی ہے؟

☆☆ اگر آپ شاعری فرما رہے ہیں تو شکر گزار ہوں گا۔ وضاحتیں کھردری نہیں ہوتیں، نتائج البتہ ہو سکتے ہیں تو پھر کیا مضائقہ ہے۔ ایمانداری کا کھردرا پن بھی ضروری وصف ہے۔

☆ کیا یہ تاثر درست ہے کہ آپ کے ہاں روشن دماغی کی جگہ یاسیت گھر کر رہی ہے؟

☆☆ یہ تاثر غلط ہے۔ آپ نے کن تحریروں سے یہ اخذ کیا۔

☆ نئی زبان و ادب کے لایعنی مباحث اور تیسری دنیا کے ادب میں دریوزہ گری کی بابت آپ کے احساسات اور عمل کس نوعیت کا ہے؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ میں نے اس سوال کا جواب سوال نمبر 18 اور 20 کے جوابات میں بھی دیا ہے۔ ہمارے یہاں بہت سے مغربی رجحانات پر بحث و مباحثہ "سوت نہ کپاس لٹھم لٹھا" کے مصداق ہے۔ اس طرح کی بحثوں میں طبع زاد مضامین کے بجائے دوسروں کی تحریروں کے خلاصے پیش کر دیے جاتے ہیں۔

☆ آپ پر ترقی پسندی کا لیبل چسپاں کرنا جس قدر آسان ہے اسی قدر ترقی پسندی کے ناقد کے طور پر بھی آپ کو علامتاً شناخت کرنا آسان ہے؟

☆☆ ترقی پسند تنقید کا ایک اہم فریضہ اس مکتبِ فکر کے نقادوں کے بعض رویوں پر تنقید بھی ہے۔ مجھے ہم جوئی پسند نہیں اور نہ ہی محاسن و معائب کے بارے میں جانبدارانہ انداز۔ اگر ترقی پسند نقادوں کی تحریریں قابلِ گرفت ہیں تو ان پر بھی گرفت ہونی چاہئے۔ "ارتقا" کراچی" کے چالیسویں شمارے (فروری ۲۰۰۷) میں میرا مضمون "ذرا غور کیجئے" میرے موقف کی مفصل ترجمانی ہے۔

☆ کیا یہ الزام برحقیقت ہے کہ آپ نے تعزیری خوف سے ترقی پسندوں کے سیاسی کردار اور ادب پر اس کے اثرات سے دانستہ احتراز کیا ہے؟

☆☆ میں نے ادبی محاسن کی قیمت پر کسی ادب پارہ کی تحسین نہیں کی۔ میرے پہلے مجموعہ مضامین "توازن" میں جسے خاصی مقبولیت کا شرف حاصل ہوا ہے، اطہر نفیس اور ضیاء جالندھری کی شاعری پر مضامین شامل ہیں۔ میں نے ن۔ م۔ راشد، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی اور منیر نیازی پر بھی لکھا ہے اور ساتھ میں فراق، مجاز اور نئی شاعری کے شعراء پر بھی۔ ان سب شعرا کی ایک انفرادیت ہے اور بہت واضح انفرادیت ہے۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ میں نے اپنے تنقیدی مضامین میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند شعرا اور افسانہ نگاروں پر یکساں توجہ دی ہے۔

☆ آپ پر ہیگل کی سوچ کافی حد تک غالب ہے۔ آج کے دور میں "انسان کی نجات خدا اور بادشاہ کی اطاعت میں مضمر ہے"، یہاں بادشاہ کے تصور کی استراحت ضروری ہے؟

☆☆ میں ہیگل کی فکر سے اتنا ہی متاثر ہوں جتنا مادی جدلیت کی تفہیم کے لئے ضروری ہے۔ میرے لئے مارکس نے ہیگل کی فکر کو سر کے بل کھڑا کر دیا

ہے اس لئے ہیگل، مطالعہ تاریخ میں بہت اہم مقام پر فائز ہے۔

☆ افلاطون کو ڈکٹیٹرانہ حکومتوں کا حامی اور سنسر شپ کا بانی کہہ کر آپ reward پیش کر رہے ہیں یا سان پر چڑھا رہے ہیں؟

☆☆ میں افلاطون کے مقابلہ میں ارسطو کی فکر کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ افلاطون اور فلاطینس (Plotinus) مطلق العنان مذہبی اور غیر مذہبی حکومتوں کے پشتیبان ثابت ہوئے ہیں۔

☆ کیا موجودہ وقت اس امر کا متقاضی نہیں کہ ہم اپنی فکر، شعور، تخلیق اور تنقید کی تنگ و تاریک راہیں ہموار کرنے کے لئے نوجوان قلم کاروں کی ایک کھیپ سامنے لائیں جو درپیش چیلنج کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو؟

☆☆ میں آپ سے متفق ہوں لیکن فرسودہ نظریات پر معروضی بحث ہونی چاہئے۔ ممکن ہے کہ جو آپ کے لئے فرسودہ ہو وہ میرے لئے فرسودہ نہ ہو۔

☆ موجودہ عالمی منظرنامے میں آپ ہمارے قومی ادب کو درپیش کس قسم کے خطرات کی بو سونگھ رہے ہیں؟

☆☆ ہمارے زبانوں اور ادیبوں کو marginalize ہونے کا خطرہ درپیش ہے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے بہت منظم کاوش اور زبانوں اور ادیبوں کی ترقی کے لئے بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہے اپنے ادب اور کلچر کے تحفظ کے سلسلہ میں ہماری کوشش بہت کمزور اور مجہول نظر آتا ہے۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ اب آپ نجی اور پیشہ ورانہ مجبوریوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے علم و فن کی صحیح سمت نمائی کا فریضہ انجام دیں؟

☆☆ میرے خیال میں یہ سوال ہر ادیب سے کیا جا سکتا ہے۔ میں حتی المقدور آپ کی بتائی ہوئی راہ پر عمل کر رہا ہوں۔

☆ آپ کے خیال میں عالمی استعماریت کے اس دور میں قلمی جہاد سے کچھ ثمرات حاصل کئے جا سکتے ہیں؟

☆☆ یقیناً

☆ انگریزی ادب اور دیگر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبانوں کے ادب سے اردو ادب کا موازنہ کریں تو کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟

☆☆ ہر زبان اور ادب جہد البقا (survival of the fittest) کے قانون کے تابع ہے ہمیں اپنی ثقافتی میراث کا دفاع کرنے کی صلاحیت حاصل کرنی چاہئے ورنہ ہماری زبان پر انگریزی کے اثرات کی بجائے انگریزی کے مکمل غلبہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اردو ادب کا اک نیا ستارا
سہ ماہی
سمبل
راولپنڈی
علی محمد فرشی نے سمبل ترتیب دیا ہے
تدوین کیا ہے اور نہ تزئین کیا ہے
فقط
اپنی نظم کی مانند تخلیق کیا ہے
صفحات چار صد، مواد از حد اور لطف بے حساب
قیمت: 150 روپے
رابطہ: راتی مارکیٹ، پنج بھائز، راولپنڈی

نامور افسانہ نگار عذرا اصغر
کی حسنِ ادارت کا مرقع
تجدیدِ نو
نئے عزم، نئے حوصلے اور نئے بانکپن
کے ساتھ
ایک بار پھر طلوع ہوا ہے
صفحات: 190 قیمت: 50 روپے
رابطہ: 695 ایف، جوہر ٹاؤن لاہور

اردو ادب کا محمد علی پاشا

ضمیر جعفری

مجھے جدید اردو غزل میں جدید ترین لہجے اور لطیف ماڈل کے نوجوان شاعر عزیزم ڈاکٹر طارق مرزا نے جناب محمد علی صدیقی پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے اسے اپنے لئے اعزاز جانا اور اس موقع کو دونوں ہاتھوں سے اچک لیا۔ ممکن ہے کہ تحت الشعور میں کہیں یہ بات چھپی ہو کر سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بنا کر رکھنی چاہیے لیکن سوا گت اور مسرت خوشی کی کسی رو کا پہلا قدرتی ریلا میرا ایسا احساس تھا کہ چلو اس بہانے ایک بار عزیز دوست اور شخص لذیذ کے کتنے کارکا موقع مل جائے گا جس کا میں دل سے متمنی تھا

چاندنی میری چاند سے چہروں کی چھب
روشنی یاروں کی خوش پیشانیوں کا نام ہے

محمد علی صدیقی کو ہم نے سنا پہلے اور پڑھا بعد میں۔ دیکھا بہت ہی بعد میں۔ ان سے مستفید بعد میں ہوئے اور مرعوب پہلے ہوئے۔ مرعوبیت کی یہ کیفیت دوسری عالمی جنگ میں افریقہ کے صحرائی محاذ پر جرمن سپہ سالار فیلڈ مارشل رومیل کی افسانوی ہیبت سے ملتی جلتی تھی کہ اس کا نام سنتے ہی انگریزوں کے ہاتھوں سے بندوق گر جاتی تھی۔ رومیل کی عسکریت کے پیچھے "جرمن پینزر ڈویژن" کے ٹینک تھے اور محمد علی صدیقی کی عبقریت کے پیچھے کراچی کے ایک ایسے صنعت کار کی ارادت تھی جو ذاتی طور پر محمد علی صدیقی کو جانتے بھی نہ تھے۔

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے جب میں اپنے فوجی یونٹ کے ساتھ ملیر چھاؤنی میں متعین تھا کہ میرے مخدوم اور اردو مزاح نگاری کے "پنج تن" جناب مشتاق احمد یوسفی مجھے اس ادب دوست صنعت کار کی مجلس میں لے گئے۔ نام ان کا فضل حسن تھا۔ کراچی کی فرقان سوسائٹی میں ان کا گھر تھا اور ٹیکسٹائل ملوں کے ایک سلسلے کے وہ مالک تھے۔

وہ ان لوگوں میں سے تھے جو دولت مند ہوتے ہیں مگر "سیٹھ" نہیں ہوتے۔ ادب و فن سے ان کے گہرے قلبی لگاؤ، عظیم چاؤ، چاؤ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے طبقے میں پیدا کیونکر ہو گئے۔ بعض لوگ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور بعض وقت کے بعد۔ فضل حسن غلط مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ ہاتھ سے لکھے کا ایک تھان کھولتے تو دل میں پورا دیوان عالب کھل جاتا۔ پچاس ہزار گز ململ جتنا آنکھ کا نشہ حزہ بنے کے بعد جب تک چند ورقیں گز ادب نہ بن لیتے، اپنی مشینوں کو منہ نہ دکھاتے۔ آپ اپنی وسیع حویلی میں عملاً اپنی کتابوں کے مہمان کی حیثیت سے رہتے تھے۔ نازو نعم چھیوٹ تھا مگر اردو بولتے تو اردو کو چھیوٹ کی چھوٹ تو کیا ہلکی سی خراش نہ لگنے دیتے اور جب پنجابی میں بولتے تو زبان کو اردو کی ہوا تک نہ لگنے دیتے۔ ادیب بننے کی کارگاہ انہوں نے اپنی ایجاد کر رکھی تھی۔ گاہے گاہے گھر پر نشست میں چالیس پچاس منتخب احباب کو مشاعرے پر مدعو کرتے۔ پہلے ان کو پر تکلف کھانا کھلاتے پھر اپنے کسی چہیتے ادیب کا کوئی مرصع مضمون سناتے۔ قدرتی لگاؤ مزاح کی طرف تھا۔ زیادہ بہاؤ بھی اسی رخ پر رہتا۔ ایک برس میں ہم نے یوسفی صاحب کی "چراغ تلے" ــــ ان کی چہیتی تھی ان کی زبانی سن لی۔ آمد کی کوئی سرحد ہوتی ہے یا نہیں، جناب فضل حسن کے ادبی ذوق کی یقیناً کوئی سرحد نہ تھی۔ ان کا ایک ہاتھ یوسفی صاحب کی ہلکی پھلکی تحریروں کے ہاتھ میں ہوتا تو دوسرا ہاتھ محمد علی صدیقی کے بھاری بھر کم مقالات کے سر پر۔ میں نے کسی شخص کو ان کی طرح مزاح اور تنقید کو یکساں چاؤ اور سہولت کے ساتھ سمجھتے اور روح میں جذب کرتے نہیں دیکھا۔ محمد علی صدیقی ان دنوں نئے نئے ابھر رہے تھے۔ ان کی پیش رفت جنرل رومیل ہی کی پیش قدمی کی طرح ڈرامائی تھی۔ اس نوجوان نقاد نے اردو تنقید کی روح ہی کو نہیں، اس کے جسم کو متحرک کر دیا تھا۔ ان کی تحریریں فضل صاحب کے دل کے بہت قریب تھیں۔ چار یوسفیوں کے بعد ایک محمد علی صدیقی آجاتا۔ فضل صاحب ان کے مقالوں کو تقریباً سجا سجا پڑھتے۔ ساتھ ساتھ گتھی نکات کے دارو بست کھولتے اور جہاں جہاں ضروری ہوتا واہ واہ کے ڈونگرے برساتے جاتے۔ روحانی انجذاب اور شرح صدر وغیرہ کا یہ عالم ہوتا کہ آپ جیسے امام تیمیہؒ کے حضور دو زانو بیٹھے ہوں۔ کہتے ہیں کہ آدمی آمد کے آگے پیچھے دل نہیں لگتا۔ فضل صاحب چلتے پھرتے نظر آتے۔ فوج میں سرخ فیتے والے ریک کی دہشت کو ہمارے دل سے کرنل محمد خان نے اکھاڑا تھا۔ اردو تنقید نگاری کی دہشت کو ہمارے دل سے جناب فضل حسن نے نکالا۔ ورنہ کیا جانے ہم کب تک نہاں خانہ قلت اور کارخانہ حیات وغیرہ کے درمیان سر پکڑے بیٹھے رہتے۔ یوں قرین قیاس امکانات اور خلاف قیاس، ممکنات کا فرق ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ بہرحال ہم فضل صاحب ہی کے ہاں سے محمد علی صدیقی کی انگلی پکڑنے کے بعد ان کا پونچھا پکڑنے کی امنگ اور حوصلہ پیدا ہوا۔

میں نے سارا محمد علی صدیقی نہیں پڑھا۔ نہ یہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ جتنا پڑھا ہے وہ سارا سمجھ سکا ہوں کہ تاقل بیان حیات و

تصورات وغیرہ کے بیان میں کچھ تسامحات لامحالہ در آتے ہیں۔۔۔۔اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔۔۔۔ایک ذاتی الجھن اور یہ تھی کہ لکھنے والا خواص کے لئے لکھتا ہے یا عوام کے لئے۔ ہم ٹھہرے "درمیانی کلاس" کے قارئین۔ افلاطون ہمیں پاس نہ بیٹھنے دے اور ارسطو کے پاس جانے کو جی نہ چاہے۔ نتیجہ یہ کہ مرنے سے پہلے ہی دونوں ہاتھ خالی۔

محمد علی صدیقی کے بعض نظریات سے میں متفق نہیں۔ مثلاً وہ مکمل آزادی اور مکمل مساوات کے زبردست حامی ہیں۔ حالانکہ آج تک مکمل آزادی سے بھی مکمل مساوات متشکل نہیں ہو سکی اور نہ کبھی جبری مساوات سے مثالی آزادی میسر آئی......وہ انسانی مسرت کو کلیتہً مادی حقائق کی معرفت تلاش کرتے ہیں جبکہ ادھوری خواہشات ہی نہیں پوری خواہشات بھی انسانی زندگی کا المیہ بن جاتی ہیں۔ مگر جو شخص کل کی ہر صداقت کو آج کے سورج کی روشنی میں پرکھنے اور ہر موجود چیز سے متعارف ہونے پر کمر باندھے وہ خواہ فوج کی وردی ہی کیوں نہ پہن لے اس کے قدم دوسروں کے قدموں سے کبھی مل نہیں سکتے مگر یہ نظری اختلافات ادب میں محمد علی صدیقی کی اثر آفرینی کی طاقت و اہمیت کو ادب میں محمد علی صدیقی کی نذر نہیں کر سکتے۔ اس کی تنقیدوں اور تجزیوں کا ایک امتیازی عنصر یہ ہے کہ اس کی تحریر پڑھنے کے بعد آدمی کو نیا راستہ دکھائی دینے لگتا ہے..... کولرج کا قول ہے کہ فلسفے کی پختگی کے بغیر کوئی شاعر عظیم نہیں بن سکتا۔ یہ بات تنقید کے بارے میں بھی درست معلوم ہوتی ہے چنانچہ محمد علی صدیقی کی تنقید کی تہہ داری اور شکوہ میں ان کی فلسفیانہ غواصی اور ستارہ شناسی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ آدھا مجنوں کو رکیکوری سمجھاتے سمجھاتے قاری کو پورا جان اسٹورٹ مل پڑھا جاتا ہے......وہ صرف بحث ہی نہیں کرتا دوٹوک فیصلے بھی کرتا ہے اگرچہ میں ذاتی طور پر ایسی بے فیصلہ بحث کو ان فیصلوں سے بہتر سمجھتا ہوں جو کسی بحث کے بغیر صادر کر دیئے جائیں.....مجھے اس کی نگارش کی یہ ادا بہت پسند ہے اس کا ہر جملہ سید علاء رگٹن پر جاتا ہے اس کی تنقیدات عورتوں کی طرح نہیں جو دن بھر دوکانوں میں گھومتی رہیں مگر کوئی چیز نہیں خریدتیں۔ اس کی تیز لسانی توجیہات تشکیلات کے باعث آ کھری ہوتی ہے۔ یہ ان نقادوں میں سے نہیں جن کے اچھے خیالات بھی برے لفظوں کے آگے مارے جائیں۔ وہ ہمارے ان دو چار اہل قلم میں سے ہیں جو تنقید بھی تخلیق کی زبان میں لکھ سکتے ہیں۔ اور میرا سلام ان لوگوں کو کہ انہوں نے اردو میں تنقید کا لکھنا تو مشکل کر دیا مگر اس کا سمجھنا آسان بنا دیا۔

پہلی مرتبہ محمد علی صدیقی کو دیکھنے پر ہم اتنے ہی مایوس ہوئے جتنے اپنے اکثر مشاہیر اہل قلم کو ان کی کتابوں سے باہر دیکھنے کے بعد آدمی مایوس ہوتا ہے۔ مگر اس شخص کے اندر کے شہر کے منظر کو بہت پر فضا اور خوش سواد پایا۔ خوش قسمتی سے مجھے بلاد فرنگ میں ان کے ساتھ ایک طویل اور طرح طرح کی پرہجوم واردات کی ہمسفری کا ایک یادگار اتفاق بھی میسر آیا ہے۔ برطانیہ میں اردو ادیبوں کے میزبان اعظم حضرت سید میر حضرت شاہ اس سفر میں خان فلاں تھے۔ سیاحت کا اصل لطف کھو جانے میں ہوتا ہے۔ سو ہماری گردشوں کا انداز کچھ ایسا ہی تھا کہ شخصیتوں کا خول تباہ کر کے ٹوٹ جائے۔ محمد علی صدیقی "خول" سے نکلے تو خالی کے بجائے اور زیادہ بھرے بھرے نظر آئے۔

ایک ایسا شخص جو ہر لحظہ علم سمیٹنے اور علم جاننے کی دھن میں مستغرق ہے مگر علم کو ان پر نہ چڑھنے دے۔ عالم ہو کر یہ بندہ...... منصوبہ بندی کو پاس پھٹکنے نہ دیتا۔ خوش طبع، کشادہ مشرب، چہرے پر بشاشت کی ملاحت طبیعت میں اتنی ہی بغاوت..... شخصیت کی چھاپ ذہانت، محنت اور محبت سے تشکیل پائی ہوئی۔ بعض اوقات تو لگتا ہے کہ ذہانت کے سوا اس کے پاس اپنی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ انتہا کی بالغ نظری کے باوجود اس کا بھولپن اتنا سادہ سلونا تھا کہ معصومیت اور معصیت کی سرحدیں گڈمڈ ہو جائیں...... نہ پیدائشی لیڈر نہ پیدائشی پیروکار.... جو کچھ بنا خود بنا۔ تاو پاکستان کی کانچی گٹی کا سنگ گل مگر اپنی شرائط پر۔ میز پر جنگ جیتنے والا مدبر۔ معصومیت کی رو میں بعض اوقات بڑی اونچی اونچی اور بہت گہری گہری باتیں اس طرح کہہ جاتا جیسے کوئی نوعمر کھلنڈرا لڑکا اپنے والدین کو حقائق زندگی سے آگاہ کر رہا ہو۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کے سبب محمد علی صدیقی کے لئے تجربہ وہ نہیں جو پیش آ گیا بلکہ وہ ہے جو پیش تو نہیں آیا مگر اس نے دیکھ لیا۔ تحریر ہو تقریر ہو یا یاران سرپل سے خاص گپ کا اہتمام اس کی توجہ اپنے موقف پر بہرطور مرکوز رہے گی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کوئی نظریہ جدوجہد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس ضمن میں وہ بعض اوقات رائے اور اصول کے فرق کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

ان کی ایک قابل رشک خوبی جو سفر کے دوران ہم پر قدم بقدم منکشف ہوتی رہی سوچنے میں کتاب راحت کی صلاحیت تھی اور یہ صلاحیت بھی کہ وہ جتنا شعور اپنی صلاحیتوں کا رکھتے ہیں اتنی تشویش اپنی ضرورتوں کی نہیں رکھتے اور ہاں یہ بھی کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے کماحقہ کام لیتے ہیں۔ جہاں انگریزوں نے ساتھ چھوڑا.....اردو میں اتر گئے۔ ذہن کا ٹریفک دونوں پٹریوں پر رواں دواں۔ یورپ بالخصوص برطانیہ کو اگر جوتی کی نوک پر رکھنا ہو تو محمد علی صدیقی کے ساتھ سفر کرے۔ لندن میں گھومتے پھرتے تنتو محمد خان ان کے سر آنکھوں پر بیٹھا رہتا۔ کسی انگریز شاعر نے کہا:

سارے برطانیہ کو ایک سو بیس انگریز منٹ سے کے مقابلے میں کم قیمت کہا ہے۔ محمد علی صدیقی پورے یورپ کو بالر میں ڈھلی ہوئی اپنی وحدت کی "تالہ پانی" سمراجی وار گردن پر ایک ایک دن میں سو سو دفعہ وار دیتے۔ ایک مرتبہ چاٹ کے چسکے میں ایک استاد کی شہرت سن کر بریڈفورڈ سے دہی بڑے کھانے کے لئے شیفیلڈ تک کا سفر کیا۔ چڑیا گھر میں اپنے آبائی ٹکڑوں نابلیوں ایک طوطا نظر آیا تو پہروں اس کے طوق گردن کو حاسد بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

محمد علی صدیقی ہمارے عہد کے چند صاحب اسلوب نقادوں اور تہذیب وقتوں کی کائناتی اقدار کے پارکھوں میں سے ہیں۔ اس دور میں اردو تنقید کے ذہیر اور ڈھانچے کو جس شدت سے محمد علی صدیقی نے جھنجھوڑا ہے اتنی تقریباً کوئی دوسرا نقاد اس صنف میں برپا نہیں کر سکا۔ مضامین ان کے قلم کا ایک اور کارنامہ ہے جس سے نقد و نظر کی روایات کی کشادگی کی تازگی اور توانائی حاصل ہوگی اذہان کی کچھ برفنی جاگرتی کے گرم چشموں میں ڈھلے گی اور گنگ زبانوں کی گویائی نصیب ہوگی۔ جن لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ کوئی ادیب کسی معاشرے میں جمہوری قدروں کے فروغ کے لئے کیا کردار ادا کر سکتا ہے ان کو اس کتاب کا بطور خاص مطالعہ کرنا چاہئے۔

محمد علی صدیقی کو ہم ملاقات کے پہلے ہی دن سے "محمد علی پاشا" کہتے آرہے ہیں۔ میں بھی ملائم میں پیدا ہوا ہوں۔ وہاں بچوں کے ناموں کے تسمیے میں والدین کے خواب تو ہوتے ہیں مگر منطق نہیں ہوتی۔ مثلاً پہاڑ خان، دریا خان وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے پڑوس کے ایک گاؤں میں "امیر کابل" اور "شاہ ایران" نام کے دو بزرگوں نے اتنی لمبی لمبی عمریں پائیں کہ تین امیر کابل اور دو شاہ ایران ان کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ محمد علی صدیقی کو ہمارے محمد علی پاشا کہنے کی ایک لاشعوری وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ وہ یہ کہ جن دنوں ہم آنکھیں کھول رہے تھے غازی انور پاشا، مصطفےٰ کمال پاشا، منگری پاشا، سوچی پاشا، زاغلول پاشا اور محمد علی پاشا۔

عالم اسلام کے ان نامور "پاشاؤں" کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں مگر یہ تاریخ ساز لوگ اپنی آنکھیں بند کرتے کرتے دنیا بھر کے مسلمانوں کی آنکھیں کھول گئے تھے۔ یہ سب "پاشے" اپنے عہد میں آزادی، حرکت اور تغیر کی علامت اور ولی تھے تو ہماری طرف سے یہ نام محمد علی صدیقی کے لئے ہماری ارادت ومحبت کا پھول تھا مگر کیا یہی عناصر آزادی حرکت اور تغیر ..... محمد علی صدیقی کی روح نقاد کا بنیادی حوالہ نہیں ہیں اور اگر ایسا ہے تو محمد علی صدیقی کو اردو ادب کا محمد علی پاشا کہہ کر...... کیا میں نے "کچھ غلط کہا"؟

- رموزِ شاعری -
کا تیسرا ایڈیشن اضافہ کے ساتھ شائع ہوگیا
ہے
☆☆☆
جناب عزیز جبران آغاز سے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں اور بعض مقامات پر مشکل اور ادق نکتوں کو سہل اور آسان لفظوں میں سمجھاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس مفید کتاب سے طلبا کے علاوہ شعرا کے حلقوں میں بھی یکساں مقبولیت حاصل ہوگی......
محسن بھوپالی
☆☆☆
دستیابی کا پتہ: 102۔ مائرسنٹرل اردو بازار کراچی

کچھ تلخی حالات کا غم آج بہم ہے
اس پر تیری بیداد گری طرفہ ستم ہے
خواب سرا
پروفیسر صدیق شاہد کا تازہ شعری مجموعہ شائع ہوگیا ہے جس کی بابت خواجہ محمد ذکریا فرماتے ہیں!
"وہ نہ صرف کلاسیکی شعری روایت سے کماحقہ آگاہ ہیں بلکہ جدید شاعری کے قابل ذکر سرمائے سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ انہیں اپنے تجربات ومحسوسات کو شعری پیکر عطا کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔"
صفحات 184، قیمت 150 روپے
دستیابی کا پتہ: فرسٹ فلور الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور۔
فضلی بک، اردو بازار کراچی۔

علم وفکر کی تازہ ہوائیں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

آگہی کی بدولت جدید اردو تنقید کے میدان میں محمد علی صدیقی کے قلم کو معتبر و منفرد بناتے ہیں دوسری طرف مخلصانہ و بے باکانہ اظہار رائے کے وسیلے سے اردو تنقید کے افق پر ایک بولڈ اور خوش رنگ لکیر کھینچ دیتے ہیں ایسی لکیر جو حال کو نظر گیر اور مستقبل کو امکان افروز بناتی ہے۔

محمد علی صدیقی کی تنقیدی تحریروں کا ایک واضح نشان یہ ہے کہ ان میں ناقد کے ذہن کے سارے دریچے کھلے نظر آتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے ناقدین ادب کے بعض تجربوں سے قبل از وقت اور بغیر استدلال بدگمان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض کو جدیدیت سے چڑ ہے۔ بعض کو وجودیت سے بعض اسلامی ادب کا نام سن کر منہ بناتے ہیں بعض جنسی مسائل کے ذکر کو مکروہ جانتے ہیں۔ بعض کو تجریدی اور علامتی اظہار سے الجھن ہے۔ بعض استعاراتی اور تمثیلی تحریر سے بدکتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ترقی پسند کا نام سن کر لاحول پڑھتے ہیں۔ محمد علی صدیقی ان میں سے کسی ایک بات سے بھی الرجک نہیں ہے۔ ہر بات کو سنتے ہیں، غور کرتے ہیں اور اپنی رائے رکھتے ہیں۔ ان کی اس کشادہ نظری نے ان کے تنقیدی افق میں کئی رنگ بھر دیئے ہیں۔ اور انہیں فی الواقع ایک غیر جانبدار مبصر بنا دیا ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب "نشانات" کے مطالعے کے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر سمت سے علم و فکر خوشبو میں بسی ہوئی تازہ ہوائیں چلی آرہی ہیں اور قاری کے دل و دماغ کو معطر بنا رہی ہیں لیکن علم و فکر کی اس ہمہ جہت عطر بیزی میں وہ اپنے گرد و پیش کی زندگی سے لمحہ بھر کے لئے بھی غافل نہیں ہوتے۔ اپنے وطن عزیز کے ہر علاقے کی بو باس کے ساتھ اپنی زمین کا وہ سوندھا پن بھی ان کی تحریروں میں ملتا ہے جو پہلی بارش کے بعد پھوٹ پڑتا ہے چنانچہ اس خاص زاویے سے دیکھیے تو ان کے یہاں قومی انفرادیت اور ملی تشخص کا وہ پرسوز تجسس و تخیل بھی موجزن ملتا نظر آتا ہے جو کسی قسم کے نظریاتی کمٹمنٹ کو اپنی سرحدوں کے تحفظ و تقدس سے بے نیاز گزر جانے یا زندگی کی تحرک و تسلسل کی راہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ بات یہ ہے کہ محمد علی صدیقی ادب اور زندگی دونوں کو ایک دوسرے کا حلیف جانتے ہیں اور مائل بہ ارتقا سیاسی قوتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی ان کے دائرہ فکر و نظر کا وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے ان کے تنقیدی رویوں کے سارے خطوط نظر آ کر مل جاتے ہیں۔ اس میں نہ تو وہ کسی قسم کے شک و گمان کا شکار ہیں اور نہ اس کے اظہار میں کبھی کوئی اپولوجیٹک انداز اختیار کرتے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ادب و زندگی کے باب میں وہ اپنے اس ایقان و ایمان کو اپنی تحریروں میں جگہ دے کر انہیں روشن و جاندار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ الفاظ انہی کے ہیں "اگر کسی ملک کی زبان و ادب کے بارے میں یہ حکم لگا بھی دیا جائے کہ وہ زندگی سے گریزپا ہے اور سخافت و ژولیدگی کی دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کی آہ و بکا بن کر رہ گیا ہے تو اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ خود زندگی اور اس کی خواہش نمو کا قانون ارتقا سے بالاتر ہو گئی ہے۔

اس جگہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ زندگی اور ادب کے اس رشتہ ازلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے حتی کہ اب وہ لوگ بھی ادب کو زندگی کا زائیدہ و نقیب جانتے ہیں جن کی آوازیں ادب برائے ادب کا نعرہ لگاتے لگاتے بیٹھ چکی ہیں۔ اس رائے کے ماننے میں مجھے تامل نہیں لیکن یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے ادیبوں نے ادب و زندگی کے نازک و لطیف رشتے کو سمجھا نہیں ہے فیشن کے طور پر زیادہ استعمال کیا ہے۔ انقلاب، آزادی، حریت، قلم، سماجی عمل، تہذیبی ارتقا اور ذہنی تصعید یا سبلی میشن (Sublimation) کے الفاظ ہمارے ادیبوں اور ناقدوں کی تحریروں میں بکثرت نظر آتے ہیں لیکن عموماً ان الفاظ کی حرمت اور اہمیت کا واضح شعور بہت کم ملتا ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں ان الفاظ کے مفاہیم واضح بھی رہے ہیں تو اس نے ان کا مصرف عموماً معاشرتی علوم یا فلسفے کے تناظر میں کیا ہے۔ ادب میں ان کی معنویت و افادیت سے زیادہ سروکار نہیں رہا اور اگر رہا ہے تو جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا مخلصانہ نہیں کسی خاص حلقے، منصب یا مکتبہ فکر سے غرض مندانہ وابستگی کے لئے رہا ہے۔ البتہ محمد علی صدیقی کا قلم اس سلسلے میں کہیں بھی ایہام و ابہام یا ریاکاری و مصلحت کا شکار نہیں ہوا۔ ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ شاہد ہے کہ انہوں نے ادب اور زندگی کے دائمی ربط کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے ادعا و نمائش کے طور پر نہیں قلم و ذہن کا فریضہ جان کر لکھا ہے۔ برملا و واشگاف لکھا ہے۔ دلائل و استناد کے ساتھ لکھا ہے اور ادب و ادبیت کے جوہر کو پرکھ کر لکھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ "ادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے زندگی کی جدلیاتی تعبیر میں دلچسپی لینا کسی فیشن کے نتیجے میں نہیں بلکہ اپنی آگہی کا قرض چکانے کے مترادف ہے چنانچہ از بس ضروری ہے کہ اپنے دور کے ادب کو پرکھنے کے لئے محض حسن بیان اور عروضی معیارات پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ ہمہ جہت کلیت کا تجزیہ کر کے ہیئت، گہرائی اور اصل جوہر تک رسائی حاصل کی جائے۔"

اپنے اس ادبی اور تنقیدی عقیدے کو راہنما کر محمد علی صدیقی نے اپنے پرائے اور عصری و غیر عصری ہر قسم کے ادب اور ادیبوں کے بارے میں لکھا ہے حتی کہ ایسے لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جن کے خیالات سے ان کے خیالات یکسر متصادم و متضاد ہیں اور کسی ایک جگہ بھی انہوں نے تنگ نظری و تنگ خوئی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ لکھا ہے کشادہ دلی و وسیع النظری کے ساتھ لکھا

ہے۔ ان کے حلقۂ تحریر و دائرۂ مطالعہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، ترقی پسند، اسلام پسند، وجودیت پرست، جدیدیے، انقلابی، غیر انقلابی اور فرقہ یا عقیدہ ملامتیہ تک کے لوگ شامل ہیں۔ صدیقی نے سب کو پڑھا ہے، استفادہ کا اعتراف کیا ہے اور ان سب پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن اظہارِ خیال میں نہ تو کسی خوف و جبریت کا شکار ہوئے ہیں نہ استدلال و دیانت اور شرافت و متانت کا ساتھ چھوڑا ہے۔ نتیجہ ان کی تنقیدی تحریریں آج کے ادب و ادیب کی تفہیم کا نہایت معتبر و مستند وسیلہ بن گئی ہیں۔ مثلاً عرض کروں گا کہ محمد حسن عسکری کی ادبی قدر و منزلت اور اہمیت کو حقیقی معنی میں سمجھنا ہو تو سلیم احمد کی تحریریں نہیں، محمد علی صدیقی کے مضامین زیادہ کارآمد ہوں گے بالکل اس طرح جیسے جوش صاحب کی شاعرانہ عظمت و منصب کو سمجھنے کے لئے مجتبیٰ حسین کے مضامین کا مطالعہ نہیں۔ فی الواقع سلیم احمد کے مقالات کا مطالعہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

محمد علی صدیقی کی طبیعت کا عجز و انکسار بھی قاری پر غیر معمولی خوش گوار اثر ڈالتا ہے۔ صدیقی نے کیا کیا اور کتنا کچھ پڑھا ہے اس کا اندازہ تو "نشانات" کے مطالعے سے بآسانی کیا جا سکتا ہے لیکن علم کی نمائش و ادعا کی زنکاری ان کے یہاں کہیں نہیں ہے۔ تاریخ کے باشعور قاری کی حیثیت سے انہیں معلوم ہے کہ ذہنِ انسانی کے سارے عظیم کارنامے خواہ ان کا تعلق مذہب و ملت سے ہو یا تہذیب و تمدن سے، عجز و دانش اور اعترافِ عجز و دانش کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔ علمی و ادبی اور سائنسی و فنی اعلیٰ اکتسابات بھی اس شرطِ خاص سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اجتہاد و انقلاب کے سلسلے میں ادعا و تعلّی سے کام لینے عموماً نا آزمودہ و نامراد نکلے ہیں اور ان کی گاہے گاہے کا عجز اعصاب علمی کے سامنے بے جان و مضحکہ خیز ثابت ہوا ہے۔ اس خاص حوالے سے دیکھا ہوں تو میرے دل میں محمد علی صدیقی کی شخصیت کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں بڑائی کے ایسے نشانات نظر آنے لگتے ہیں جو حال سے زیادہ ان کے روشن مستقبل پر دال ہیں اور قاری کے اس شعر کی بے ساختہ یاد دلاتا ہے:

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

محمد علی صدیقی کی شخصیت و تنقید میں اس طرح کا ربط ملتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں نہیں جو جانتے کچھ نہیں لیکن اظہار ایسا کرتے ہیں جیسے سب کچھ جانتے ہیں۔ ایسوں کے بارے میں کسی نے بہت صحیح حکم لگایا ہے کہ:

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

اس کے برعکس محمد علی صدیقی ان لوگوں میں ہیں جو بہت کچھ جاننے کے بعد اچھی طرح جانتے ہیں کہ ظاہر میں جس علم و حقیقت کا نام دیا جاتا ہے حقیقت میں "وہ" لاعلمی و عدم حقیقت کے احساس کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ انہیں ذوق کی رباعی کا یہ مصرع از بر ہے کہ:

جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

چنانچہ علم و دانش کے باب میں وہ اسی خاص مزاج و احساس کے ادیب ہیں۔ وہ بعض دوسرے ادیبوں کی طرح اپنی تحریروں یا کتاب کے دیباچوں میں یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ انہوں نے کوئی بڑا تیر مارا ہے یا کسی نادر و نایاب اور قابل فخر نکتے کا انکشاف کیا ہے بلکہ ان کے یہاں تو وضع سے وضع اور اہم سے اہم نکات کے انکشاف پر بھی اسی طرح عجز و انکسار ملتا ہے جو کبھی ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو علم و فضل کے بلند ترین منصب پر فائز ہو کر بھی خود کو حقیر و فقیر اور بندۂ عاصی و پر معاصی لکھا کرتے تھے۔ محمد علی صدیقی کا علم و فضل اور ان کا عجز و انکسار ایسے ہی بزرگوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "نشانات" کے بارے میں کیسے معصوم انداز میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ کتاب بڑی عاجزی و انکساری کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔ میں اپنے بارے میں کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں ہوں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ بہت عظیم الشان اور حیرت انگیز ہے۔ اس اعترافِ عجز کے باوجود خامہ فرسائی کی صرف ایک ہی وجہ ممکن ہو سکتی ہے کہ لکھنے والا اپنی تحریروں کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسافر جملہ شرائط پوری کرنے کے باوجود بھی اپنی منزل نہ پا سکے اور آئندہ نسلیں اس کے باب میں اس وجہ معروضی ہوا پسند کریں کہ اسے اپنی تحریروں کے حاشیوں میں جگہ دینے پر بھی راضی نہ ہوں۔ ویسے بھی نشانات کے مضامین میں جاری و ساری سچ کو لمحہ موجود کی صرف ایک تاویل قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ سچ کی ہزاروں تاویلیں اپنے جلو میں بڑی گہما گہمی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ ان مضامین کا سچ ہی واحد سچ ہے۔"

محمد علی صدیقی کی طبیعت کے اس انکسار اور علم و دانش کے سلسلے میں اعترافِ عجز کو یہ اثر ہوا ہے کہ زندگی اور ادب کے دقیق سے دقیق اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل تک ان کے ذہن کی رسائی بہت آسانی سے ہو گئی ہے۔ کسی موضوع اور کسی مسئلے کے بارے میں بھی ان کے یہاں کسی طرح کا الجھاؤ نظر نہیں آتا۔ "نشانات" میں انہوں نے "ادبی مسائل" "لسانی مباحث" "خراج عقیدت" اور "اطلاقی مطالعے" کے تحت خاصے ادق موضوعات کو ہاتھ لگایا ہے۔ ان کے رموز و نکات کو سمجھایا ہے لیکن ان کا قلم نہ تو کہیں بہکا ہے اور نہ کہیں ابہام و ژولیدگی کا شکار ہوا ہے۔ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ کسی خاص ادیب یا ادب کے بارے یا ادبی موضوع کے سلسلے میں وہ جن خیالات کا اظہار کر رہے ہیں ان کے بارے میں ان کا ذہن کسی بے یقینی یا الجھاؤ میں گرفتار نہیں ہے۔ چنانچہ عصری ادب کے بہت سے ایسے رویے اور مسائل جو نئے ہونے کے سبب بعض

ناقدوں کے یہاں طویل خامہ فرسائی کے باوجود مبہم ہی رہ گئے ہیں وہ رویے اور مسائل محمد علی صدیقی کے یہاں چند سطروں میں قطعیت کے ساتھ واضح ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف دو تین مختصر مثالیں دیکھئے ادب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب محمد علی صدیقی کے لفظوں میں یہ ہے کہ

"ادب زندگی کی سچائیوں کو بھی اس قدر تیکھے انداز میں دیکھنے کی کوشش کا نام ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے غیر ہموار ذہن بھی ہموار سے نظر آتے ہیں۔"

ادب کا فنکشن کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ

جس طرح ہر فلسفہ زندگی اپنے ساتھ ایک مخصوص نظام سیاست لاتا ہے اسی طرح ہر ادبی شہ پارہ اپنی تفہیم کے لئے ایک مخصوص تفکر اور جمالیات لاتا ہے۔

جدیدیت کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ "جدیدیت ہم عصر شعور کے اثبات اور انسانی زندگی میں تبدیلی و تغیر کی ضرورت اور احساس ناگزیر ہے جو آگے کی سمت لے جاتا ہے پیچھے کی جانب نہیں۔"

گذشتہ دس سال کے ادبی رجحانات کی تاریخ کا سب سے اہم اور قابل ذکر واقعہ محمد علی صدیقی کے نزدیک مروجہ زبان کے خلاف جارحانہ حملے کی ناکامی ہے غزل یا پابند نظم اور نظم معری کی واپسی اور جارحانہ پالیسی اس امر کا ثبوت ہے کہ شعر کی زبان سے معنویت کا اخراج ممکن نہیں ہے۔

اس طرح کے اور نہ جانے کتنے موضوعات و مسائل ہیں جن کے بارے میں صدیقی نے مختصر ترین لفظوں میں اپنی رائے کا واضح اظہار کر دیا ہے ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہنے والے کے ذہن میں موضوع زیر بحث کا ایک ایک نکتہ واضح ہو اور وہ اس کے علم و یقین کا قابل تقسیم جزو بن چکا ہو لیکن ان باتوں سے قطع نظر محمد علی صدیقی کے یہاں ایک اور ایسی چیز میں نے محسوس کی ہے جو انگریزی ادب اور جدید مغربی علوم سے واقفیت رکھنے والے اردو ادیبوں کے یہاں مجھے بہت کم نظر آئی ہے اور وہ ہے مغرب کی مرعوبیت سے نجات۔ محمد علی صدیقی انگریزی کے ایم اے ہیں اردو سے زیادہ انگریزی زبان میں لکھتے ہیں اور شاید مشرق کی بہ نسبت مغرب کا مطالعہ بھی انہوں نے زیادہ ہی کیا ہے لیکن مغرب کے جدید علوم کے مرکری بلب کے سامنے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں بلکہ گھر کے چراغوں کی روشنی اور اس کی اہمیت کا احساس کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ ایسے میں امید بندھتی ہے کہ اردو تنقید بہت دنوں تک مغرب کے سامنے کشکول گدائی لئے نہ پھرتی رہے گی بلکہ تخلیقی ادب کی طرح وہ بھی اپنے تشخص و انفرادیت کے لئے ایک ایسی راہ ہموار کرے گی جو واقعی اس کی اپنی ہو گی اور اس کے بعد مصحفی کی غزل کو سمجھنے کے لئے کسی چاسر کی ضرورت نہ پڑے گی۔

چوتھی دیوار

انل ٹھکر کا ایسا ڈرامہ ہے جو دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

"کوئی پچھڑی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ حکومت نے اسے تحفظات' آسانیاں' سہولتیں اور رعایت فراہم کیں اس نے ان مراعات سے استفادہ کیا اور معاشرے میں ایک اونچا مقام اور ممتاز عہدہ حاصل کر لیا اب وہ ایک معزز مقام رکھتا ہے۔ عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے' یعنی متمول ہو چکا ہے' حتیٰ کہ وہ معاشرہ کو کچھ دے بھی سکتا ہے اب وہ پچھڑا ہوا کہاں رہا کہ اس کے بچوں اور آنے والی نسلوں کو بھی تحفظات سے استفادہ کا موقع دیا جائے۔ اس طرح تو ہماری قوم اور طبقے میں کبھی کوئی دانش مند' دیانت دار' Genius پیدا ہی نہیں ہو گا۔ ہم پچھڑے کے پچھڑے رہیں گے۔ اونچے کہے جانے والے اونچے ہی رہیں گے۔ دونوں کی دوریاں بنی رہیں گی۔"

چوتھی دیوار

میں انل ٹھکر نے ماضی' حال' مستقبل سے جڑے بہت ہی نازک اور حساس موضوع کو زیر بحث لا کر نہ صرف اپنے لوگوں کو جگانے کی کوشش کی ہے بلکہ اس پیچیدہ مسئلہ کا ایسا دانشورانہ حل بھی تجویز کیا ہے جسے اپنا کر بہت بڑے جوار بھاٹا کا رخ آسانی سے موڑا جا سکتا ہے۔ مسئلہ جس قدر گمبھیر اور الجھا ہوا ہے انداز بیاں اسی قدر سادہ' دلنشیں اور دل موہ لینے والا ہے۔ کتابی سائز کے صرف اڑتالیس صفحات کے اس مختصر ناول کو ہر پڑھے لکھے شخص کے لئے پڑھنا اور جناب انل ٹھکر کی فکر انگیز سوچ کو آگے بڑھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

چوتھی دیوار

کی قیمت صرف تیس روپے اور دستیابی کا پتہ: 85' بک ویئرز دو پولیس سٹیشن' جے سی نگر بنگلور جبکہ مصنف کا پتہ مندرجہ ذیل ہے: 83 آدرش نگر ہبلی' 580032 کرناٹک بھارت۔

ادبی معیارات کی چھان پھٹک

جوگندر پال

اتنی بڑی بھیڑ میں ایک ایک کی ہاں میں ہاں ملا کر بات کرنے والا شخص کسی ملک کا وزیراعظم تو بن سکتا ہے لیکن اُس کے وزیراعظم بننے کے بعد سبھوں کی بہتری کے لئے کوئی دوٹوک اہم فیصلہ کرنے کی نوبت آجائے تو بھی وہ حالات کی بغیر فیصلہ چارہ گری کئے جاتا ہے اور یوں وہ نہیں بن پاتا تو یہ ایک دانشور جیسے شخصی فیصلوں کے تمام تر خطرے کے باوجود اکثر اوقات آزادانہ اور فیصلہ کن اقدام کے بغیر کوئی چارہ نہیں.... جمہوری طرزِ عمل میں رائے عامہ کی برتری بجا طور پر حق ہے کہ غلط کاروں کے پورے ہجوم میں بھی اتنی گنجائش موجود ہو کہ شخص واحد بھی اپنے فیصلوں کا مجاز ہو۔ محمد علی صدیقی کے کردار کا یہ پہلو اس سے یہاں نہایت پسندیدہ ہے کہ کوئی ایسی صورتِ حال درپیش ہونے پر اُسے اپنے اختلافی فیصلوں پر قطعاً تامل نہیں ہوا، یہاں تک کہ بہ ضرورت وہ بڑی آسانی اور سادگی سے اپنے آپ سے بھی اختلاف محسوس کر کے اپنے بعض فیصلوں میں ترمیم کر لینے کے درپے ہو جاتا ہے۔

اب اردو ادب کو ہی لیجیے: محمد علی صدیقی ہمارے عہد کے معروف ترقی پسندوں میں سے ہے، اُس وقت سے، جب ترقی پسند اپنی قدروں کے نعرے بلند کر کر کے ہی گویا اپنے فنی معیارات سے عہدہ برآ ہو لیتے تھے۔ یہی وہ رویہ تھا جس کی روز افزوں تکرار کے باعث ترقی پسندوں کے زوال کا اسباب ہونے لگا تھا اور جس کے خلاف ترقی پسند صفوں میں سے ہی آواز اٹھنے کی اشد اور فوری ضرورت تھی، مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھتا؟ ایسے حالات میں جن معدودے چند ترقی پسند دانشوروں نے ادبی تخلیقات کے فکری اسباب کو فنی اور تخلیقی باب میں پڑھنے اور پرکھنے پر زور دیا، اُن میں محمد علی صدیقی پیش پیش رہا۔ اُس نے نہ صرف چند ایسے پرانے ترقی پسند ہم خیالوں سے ترجیحی سلوک روا رکھا جو فکر اور فن سے برتاؤ کی یکجائی پر اصرار کرتے تھے بلکہ فن "غیر ترقی پسندوں" کی اولین ادبی حیثیت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیا جن کی فکری ترتیب میں فنی ضمیر کی کارگری کے شواہد مہیا ہوتے تھے۔ اُس وقت کے ترقی پسندوں کے بڑوں نے اول اُس کے تنقیدی رویوں کو یقیناً مشکوک قرار دیا ہوگا، تاہم نتیجتاً ان بڑوں کے رویے ہی مشکوک قرار دیے جانے لگے تو وہ پس قدم ہوتے چلے گئے۔ ایسی ہی صورتِ حال کو بیان کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ دانشوری کے طبع زاد تقاضے اپنے عہد کی پیداوار بھی ہوتے ہیں اور ایک نئے عہد کے محرک بھی۔ محمد علی صدیقی نے اپنی بھینچی ہوئی مٹھیاں کھول کر اور چلنے کیلئے راستے کے پتھروں کو چن چن کر ایک نئے ترقی پسند عہد کی بنا ڈالنے میں سعادت کی۔

ترقی پسند عمل میں یہ تبدیلیاں ظہور میں نہ آتیں تو کیا ہوتا؟..... کیوں نہ آتیں؟ جس طرح کوئی ایک شخص چھوٹے سے بڑا ہوتا چلا جاتا ہے اسی مانند انسانی تحریکیں بھی چھوٹی سے بڑی ہو ہو کر پھیلتی چلی جاتی ہیں اور فن کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ان کے مفاہیم میں ترمیم واقع ہوتی چلی جاتی ہے اور یوں تغیر پذیر زندگی سے اُن کا تال میل برابر بنا رہتا ہے اور ایسا نہ ہو پانے کی صورت میں وہ اپنی عمر پوری کر کے گزر جاتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک بھی بدلتے ادوار میں اپنی تحریک کو بجا طور پر کھو کھو کر موجودہ زندگی کی نئی شرائط پر پورا اترنے کی اہل ہو پائی ہے۔ انسانی فکر بھی اسی جادوئی عمل سے بوڑھی ہو کر اتنی جوان نکل آتی ہے کہ نئے لوگوں کو اس سے بیاہ رچا لینے میں قطعاً عار نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ وہ اس کا نام بدل دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنی دانست میں آپ ادبی طور پر جدید ہوں یا مابعد جدید، آپ ترقی پسندی کی ترقی یافتہ شخصیت کو ہی بیاہ کے لا رہے ہیں جسے ساتھ ڈولی میں گھر لئے جا رہے ہوتے ہیں، میکے میں وہ جیسی بھی تھی، سسرال میں اُسے یہ کہہ کر بلائیے۔

آپ کو ایک مزے کا قصہ سناؤں؟..... ہم اردو والوں کے لئے شاید یہ عجیب بھی ہو: ایک لڑکی نے ایک لڑکے سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو وہ اُس سے پوچھنے لگا۔

"اس لئے کہ تم نثر میں بات نہیں کرتے"

معقول سوچ یہی ہے کہ محبت کرنے والے ہمیشہ شاعری میں بات کرتے ہیں، لیکن محبت کے بعد اگر شادی بھی ضروری ہو تو آج کے زمانے میں شہر میں ایک چھوٹے سے فلیٹ کا کوئی دس ہزار کرایہ چکائے بغیر کیونکر بن پائے گی اور اگر بن نہ پائے گی تو ظاہر ہے اختر شیرانی کے شعر گا گا کر باتیں کرنے کی بجائے محبت کرنے والوں کو خالص نثر میں سوچ سوچ کر اب یا کب بھی شادی کرنے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ آج کے دور میں سائنسی حقائق سے غفلت برت کر جینے والوں کی جان سولی میں پھنسی رہتی ہے کہ اب نہیں تو اب گئی۔ محمد علی صدیقی کو اپنی تحریروں میں سائنسی حقائق کا پاس تو ہے ہی، وہ ان حقائق کے پیش نظر سائنسی رویوں کا بھی پاسدار ہے۔ اس

لحاظ سے اردو کے فکری محاذ پر وہ ایک ایسے دقیانوسی سماج میں کام کر رہا ہے جس کی اکثریت کو اپنے پیش رووں کی حسیت اور فکر سے اوپر اٹھنا گوارا نہیں اور جو اپنے زمانہ حال کو صیغۂ ماضی میں ہی جینے کی عادی ہے۔ اپنے عام قارئین تک پہنچ پانے سے پہلے اُسے شعری مبالغہ کے روائتی علم برداروں کی جس جلوی ٹوک جھونک کا سامنا رہتا ہوگا اُس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں اُس نے اقبالؔ، سرسید اور غالبؔ کے علاوہ بعض پسندیدہ معاصرین کو بھی چن چن کر ان کے سائنسی رویوں کی شعری پیش روی کی بڑی جرأت اور استقلال سے نشاندہی کی ہے اور نئے ذہنوں کی تربیت کے لئے ان کی ناگزیریت پر بھی زور دیا ہے۔

کبھی نہ کبھی شاید وہ زمانہ عین سر پر آ کھڑا ہوا ہے جب محمد علی صدیقی جیسے ذہین اور باشعور دنیاداروں کو اپنی نجی اور پیشہ ورانہ مجبوریں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے باطنی مشن کی تکمیل میں ہمہ وقت اور ہمہ تن جُٹ جانا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں محمد علی صدیقی نے بھی اپنی زندگی کا ایک ایسا ہی تخلیقی مشن ٹھہرا رکھا ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ سب کچھ تج کر ہمت سے کام لے اور بس کود جائے۔ اتنا بڑا کام پارٹ ٹائم مصروفیت سے انجام نہیں دیا جا سکتا۔

ہمعصر تنقید میں اب بھی ہائے وائے جاری ہے کہ ادب اب ویسا کیوں نہیں رہا جیسے آج سے پچیس پچاس برس پہلے تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آل ٹائم کلاسیکیوں کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہر حال اور بجا طور پر ہماری مطالعاتی ضرورتوں میں شامل ہیں، تاہم ہر زبان کے معاصر تنقیدی ادب کا بنیادی تقاضہ یہی ہونا چاہیے کہ نئی زندگی میں گھر کرنے کے لئے ادب کی متوقع تبدیلیاں ہمیشہ ہماری نگاہ میں رہیں، اگر نہ ہم مستقبل کے کلاسیک کیونکر وجود میں لا پائیں گے۔ محمد علی صدیقی جیسے نئی زندگی کرنے اور لکھنے والے نقادوں کی بھرپور ادبی شرکتوں کے بغیر ہم اپنے ادبی پرکھ کے معیار میں منطقی تسلسل سے محروم رہ جائیں گے۔

ہماری فکر اور تنقیدی جستجو کی بیشتر راہیں ابھی ویران پڑی ہیں۔ صدیقی کو بدستور ان ویران راہوں کی آبادکاری کے اسباب جھیلتے اور انہیں جھیل جھیل کر نئے تخلیق کاروں کی ٹیڑھی میڑھی راہیں ہموار کرتے چلے جانا ہے۔ ہمارے ہیرو کا یہی مقدر ہے۔ اللہ اس کی بے چین روح کی تسکین کا سامان مزید اور ہمہ وقت بے چینیوں سے کرتا رہے۔ تنقید کی سطحیں اسی طور تخلیقی ہو پاتی ہیں۔

غزل

کھلیں گے تاب کے رخ و زُلفِ بُتاں سے آپ
کچھ ربطِ فن بڑھایئے رنگ جہاں سے آپ

کہیئے حضور آپ کا اب کیا خیال ہے
مایوس ہو کے آئے ہیں شہرِ بُتاں سے آپ

اِس خوف سے مَیں کہہ نہ سکا سرگزشتِ غم
غمگیں ہو نہ جائیں مری داستاں سے آپ

دیوار اختلاف کی ہوتی گئی بُلند
کچھ ہم کم اعتماد تھے کچھ بدگماں سے آپ

کچھ بے سبب نہیں ہے بہکنا بھی شیخ جی
آئے ہیں اُٹھ کے حلقۂ پیرِ مغاں سے آپ

گُم ہو کے رہ گئی ہے نوائے دلِ زُہیر
آواز دے رہے ہیں یہ آخر کہاں سے آپ

پروفیسر زُہیر کُنجاہی

اردو تنقید میں نئی بوطیقا..... انور سدید

اردو تنقید میں محمد علی صدیقی کا نام اور شخصیت اتنی متعارف ہو چکی ہے کہ اب ان کے رسمی تعارف کے لئے انگریزی اخبار "ڈان" کے ادبی کالم کا حوالہ جسے وہ "ایریل" کے نام سے لکھتے ہیں غیر ضروری معلوم ہوتا ہے تاہم اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ "ایریل" نے روزنامہ صحافت میں ادبی تنقید و تبصرہ کی جو طرح ڈالی تھی اس کی نوکیلی کاٹ اور معلوماتی انداز نے بعض اوقات پڑھنے والوں کو متاثر کیا اور طویل عرصے تک ادبا کا بہت سا وقت اس قلمی نام کے پردے میں چھپی ہوئی شخصیت کا سراغ لگانے میں صرف ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ محمد علی صدیقی جب کسی جدیدیت کی توضیحات کے لئے قلم کا زاویہ ذرا آغا کی طرف موڑتے تو میرے ایک دوست "ڈان" کا "لٹریری راؤنڈ اپ" نشان زدہ کر کے بھیجا کرتے اور بار بار دریافت کرتے کہ یہ "ایریل" کون صاحب ہیں؟ کچھ عرصے کے بعد جب کراچی کے احباب نے بتایا کہ یہ تو اپنے محمد علی صدیقی ہیں تو وہ اس وقت اردو ادب کے لئے اتنے ہی اجنبی تھے جتنے "ایریل"!

"ڈان" کے ادبی کالم کا ایک مخصوص مزاج تھا جسے صرف "ایریل" ہی اختیار کر سکتے تھے۔ اس کا ایک خاص حصہ وہ ہوتا تھا جسے صرف محمد علی صدیقی کی شخصیت میں ہی تلاش کیا جا سکتا تھا۔ وہ اردو کے مختلف خیال شعرا اور متنوع افکار ادبا کو پڑھتے اور پھر ان کی تعبیر یورپ کے ان مفکرین کے حوالے سے کرتے جن کا کہا ہوا مستند تھا اور جن سے تھوڑا تھوڑا لوگ پاکستان میں بھی واقف تھے۔ چنانچہ اکثر اوقات یہ کالم نہ صرف برصغیر کے ادبی مزاج کا پتہ دیتا بلکہ یورپ کی نئی اور پرانی، مقبول اور غیر مقبول، ترقی پسند اور زوال آمادہ تحریکوں پر بھی وافر مقدار میں روشنی ڈالتا۔ وہ سارتر کے کسی اقتباس سے کالم کی ابتدا کرتے اور ہیگل، شوپن ہار، نیٹشے، کانٹ، جے آر اور نوام چومسکی سے ہوتے ہوئے رشید امجد پر ختم کر ڈالتے۔ ان کا کالم بار بار محمد حسن عسکری کی یاد دلاتا جنہوں نے اردو کو فرانسیسی ادیبوں سے متعارف کرانے میں عمر عزیز کا طویل عرصہ صرف کیا تھا۔ مجھے ایک مدیر کی مخصوص زبان میں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ محمد علی صدیقی اگر یہ انگریزی کالم نہ لکھتے تو اردو زبان کتنی غریب اور کتنی نادار نظر آتی، ادب بینانیوں کی طویل صف میں کتنی بری اور ادھوری لگے، پُر اعتماد، پُر وقار اور پُر افتخار نظر آتی ہے۔ تاہم چونکہ مجھے کلیشوں کی زبان میں بات کرنے کی مشق نہیں اس لئے میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ "ایریل" کے ہر کالم میں مطالعے کی وسعت اور تجزیاتی فکر کی نادر کیفیت نظر آتی۔ ان کا بیانیہ سیاق اور سباق کی خاردار جھاڑیوں میں الجھے بغیر جدید اور قدیم ادب کے درمیان مربیانہ ملاقات کا منظر پیش کرتا۔ چونکہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اس لئے محمد علی صدیقی نے مشرق و مغرب کے افکار میں نقطۂ اتصال تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے مشرق پر امام غزالی کے اور مغرب پر ابن رشد کے اثرات کا تجزیہ بھی نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے ان دونوں قطبوں کے افکار و تصورات پر اپنی رائے اس سلیقے سے دی کہ قاری نہ صرف جدید مکاتب فکر سے روشناس ہوا بلکہ اسے اپنے نقطۂ نظر کی جانچ پڑتال اور اس کی صحت کے اثبات کا موقع بھی ملا۔ نتیجتاً اس کالم کی تحسین بھی ہوئی اور اسے ادبی صحافت میں انتقاد، تحسین اور نظریہ جاتی ادبی روایت سے الگ بھی قرار دیا گیا۔

یہ طویل تمہید میں نے اس حقیقت کو باور کرانے کے لئے باندھی ہے کہ مجھے اردو مقالہ نگاری کی طرف محمد علی صدیقی کی مراجعت انگریزی کالم نگاری کی ہی توسیع نظر آتی ہے۔ محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ

"میں اپنے دوستوں کی نیک خواہشات اور اپنی بے بضاعتی کے درمیان آویزش کا گرفتار ہوں"

اس سے مناسب نتیجہ تو یہی نکالنا چاہئے کہ ان کے مخلص دوستوں نے انہیں اردو کی راہ دکھائی ہوگی اور محمد علی صدیقی نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد جس میں ان کے انکسار کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، دوستوں کی خواہشات کے احترام میں اردو کی راہ اختیار کر لی ہوگی۔ مجھے ان کی اس خود انکشافی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ جس شخص کے حلقۂ احباب میں نجم آفندی، صہبا لکھنوی، جون ایلیا، سحر انصاری اور آغا سہیل جیسے ادباء ہوں وہ اردو سے کتنی دیر اور کس طرح بیگانہ رہ سکتا ہے۔ پھر انہوں نے شاعر نہ ہونے کے اعتراف میں ہمیں یہ بھی یاد دلایا ہے کہ وہ اپنے شہر کے مشاعروں میں شعر بھی پڑھتے رہے ہیں اور اگرچہ یہ قصہ بہت جلدی ختم ہو گیا تھا لیکن کیا آگہی ہونے پر یہ "تب کا ڑ" چھپٹ گئی تھی؟ اور کیا اس کی نمو کے مکرر رجحان میں انگریزی شاعری کی صورت میں نہیں ہوئی تھی؟ اس اجمال سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اردو کی طرف محمد علی صدیقی کی مراجعت داخلی اور خودرو تھی اور یہ کسی آویزش کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ جب "ایریل" نے پہلے انگریزی دان طبقے میں جلایا تو ان کے بیان کی وسعت نے اردو میں اظہار کا تقاضا کیا۔ نتیجہ وہ مضامین ہیں جن کا سلسلہ "جامعہ" سے شروع ہوا اور پھر سیپ، افکار، اوراق، اردو، غالب، کتاب، ندا، فنون اور طلوع افکار جیسے موقر و معتبر رسائل میں پھیلتا چلا گیا۔ ان کی کتاب "توازن" انہی مضامین کا ایک متنوع اور منتخب مجموعہ ہے اور یہ ایک ایسے نقاد کو متعارف کراتا ہے جو اردو تنقید میں ایک نئی بوطیقا مرتب کرنے کا آرزومند ہے اور اس مقصد کے لئے اپنے مشرقی مزاج کو مسلسل مغرب پر کمندیں ڈالنے پر آمادہ کر رہا ہے۔

"توازن" تنقید کی ان معدودے چند خوش قسمت کتابوں میں سے ہے جن میں دو سمتوں کی پوری صلاحیت ہوتی ہے اور جن کا تذکرہ اس لئے بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر قاری اپنی علمیت اور آگہی معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔ مجھے "توازن" پہلی نظر میں اس لئے اچھی لگی کہ اس کے مصنف نے اشاعت سے پہلے کسی بڑے ادیب سے کتاب کا دیباچہ نہیں لکھوایا۔ انہوں نے "حرفے چند" کے تحت بلند بانگ دعاوی سے پڑھنے والوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی سعی بھی نہیں کی۔ ان کے ہاں سکہ بند ترقی پسندوں کی طرح تعلّی اور خود ترحمی کا عنصر بھی نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس انہوں نے انکسار سے کتاب کی ابتدا کی۔ مستعار بیساکھیوں کے سہارے آگے بڑھنے کے بجائے خود اپنے قلم پر اعتماد کیا اور قاری کو کتاب کے باطن میں

چھا گئے اور شاید محمد علی صدیقی سے اختلافات ابھارنے کا موقع دیا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خسرو متین ادیب نے محمد علی صدیقی اور ان کی تنقید سے صرفِ نظر کیا ہے یا انہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ کتاب کے سرورق پر جو قیمتی آرا شائع ہوئی ہیں۔ ان کے آخری جملے "فل سٹاپ" پر ختم نہیں ہوتے لفظوں کے تسلسل سے میں یہ اندازہ لگا سکا ہوں کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، منیر نیازی، ممتاز حسین اور احمد ندیم قاسمی جیسے شہریارانِ ادب نے ان کی کتاب کی اشاعت پر معقول قد و قامت کے مضامین لکھے ہوں گے مگر محمد علی صدیقی کی خوبی ہے کہ انہوں نے ان مضامین سے صرف چند ٹکڑے منتخب کیے اور انہیں کتاب میں شامل کرنے کے بجائے سرورق پر سجا دیا تا کہ اگر آپ گرد و پیش نا آشنا رہ کر اور آرا کیا اور یہ طاق رکر اکسی محمد علی صدیقی سے ملاقات کرنے کے آرزومند ہوں تو آپ کے لیے یہ موقع بھی مہیا ہو۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ آرا اتنی غیر اہم بھی نہیں کہ ان کا تذکرہ کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن ہو اور کیا مضائقہ ہے اگر ایک نظر ان پر بھی ڈال لی جائے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جنہوں نے اردو تنقید پر خود بینی اور کم نگہی کا الزام لگایا ہے محمد علی صدیقی کے روشن مستقبل سے بڑے امید ہیں اور نہ صرف ان کے ذوقِ نظر کی داد دیتے ہیں بلکہ لکھتے ہیں کہ

"وہ علم کے آئینے میں ادب کی شکل دیکھتے ہیں اور "ہنگامۂ روز و ملت" کے تعصبات سے پاک ہیں۔"

منیر نیازی نے لکھا ہے کہ

"محمد علی صدیقی ہمارے ان چند نقادوں میں سے ہیں جو ایک نئے طرزِ احساس، ایک نئے وژن کے ظہور کے ضمن میں خوبصورت کردار ادا کر رہے ہیں۔"

جناب ممتاز حسین کی رائے یہ ہے کہ

"محمد علی صدیقی نے اپنی تحریروں سے بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے"

مختصر یہ کہ یہ آرا اتنی دلآویز ہیں کہ انہیں پڑھنے کے بعد آپ کتاب کے مطالعے سے نہ صرف بے نیاز ہو سکتے ہیں بلکہ شعور و تفہیم کے اسلوب میں ایک نیا مضمون بھی لکھ سکتے ہیں جو کلی کی تشریحی ضروریات کو پورا کرے اور غزل کے اچھے شعر کی طرح ہر قاری قرأت میں بے ساختہ داد حاصل کرے اور "آداب عرض" میں جواب دے۔ اگر "توازن" کی طرف واقعی رجوع کیا جائے تو بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ محمد علی صدیقی کی تنقید میں یہ کیفیت پیدا نہیں کرتی بلکہ ان کے بعض طویل جملے کو سمجھنے میں قاری کا ذہن و خیال تھک جاتا ہے اور وہ مفہوم و مطلب پا لینے کے بعد پورا جملہ دوبارہ پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت واقعی عجیب و غریب ہے لیکن اس کی کچھ وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً ایک اہم بات یہ ہے کہ محمد علی صدیقی نے بالعموم مابعد الطبیعات، جمالیات، ترقی پسندی، جدیدیت، ثقافت اور نظریۂ اضافیت وغیرہ مشکل موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ان موضوعات کی وضاحت کے لیے انہیں شوپن ہاؤر، ہائیڈیگر، ہیگل، ہربرٹ، لوکاچ وغیرہ متنازعہ فیہ مفکرین پر بحث کی ہے۔ یہ بعض اور موضوعات ایسے ہیں جنہیں اہلِ فلسفہ نے تقریباً اداس کیا ہے لیکن اہلِ ادب نے محمد علی صدیقی کے علاوہ کسی نے نہیں چھیڑا اور اگر چھیڑا ہے تو وہ ان کی مبادیات کی منطقانہ توضیح سے آگے نہیں بڑھے۔ محمد علی صدیقی موضوع کی مبادیات کو اکثر قاری کا مسئلہ قرار دیتے ہیں اور خود گہرے مباحث میں غوطہ زن ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاں بحث مسائل سے الجھتی اور مفکرین کے افکار کا تجزیہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے چنانچہ ان کی نظر میں شوپنہار، ہیگل، جیمز ڈبلیو، وکٹر، ہیڈیگر، وولف گانگ، ولیم وٹ، کارنیپ، رسل، آگسٹن، انسٹ کیرر، کارنیپ، رسکن، باخ، جی ای مور، لسنگ، جے آر وغیرہ شخصیات نہیں بلکہ نظریات ہیں اور ان کا تذکرہ نہایت فراوانی سے آیا ہے۔ ان میں سے اول الذکر چند نام کثرتِ استعمال سے اردو ادب کے لیے اجنبی نہیں رہے لیکن موخر الذکر دو درجن بھر سے زیادہ ناموں سے ہمارے یہاں کے کتنے لوگ واقف ہیں اور جب نام سے ہی آگہی نہیں تو کتنے لوگ ان کے کام سے اور ان کے افکار سے واقف ہوں گے؟ محمد حسن عسکری نے جن فرانسیسی ادیبوں کو اردو سے متعارف کروایا، ان سب کے کام ابھی تک اردو کے حلق سے پوری طرح نہیں اترے۔ ان نئے ناموں کی نئی کھیپ سے شناسا ہونے کی مہلت کب پیدا ہو گی؟ خصوصاً اس صورت میں جبکہ آہستہ آہستہ متعارف کرانے کے بجائے محمد علی صدیقی نے ان میں سے بیشتر کو اجنبی ناموں کی طویل فہرست میں یک سانس اقتباس کر ڈالا ہے نتیجہ یہ ہے کہ قاری محمد علی صدیقی سے مرعوب تو ہو جاتا ہے لیکن ان کی طرف فوری طور پر رجوع کا ہاتھ نہیں بڑھاتا۔

گمان غالب یہ بھی ہے کہ محمد علی صدیقی غیر شعوری طور پر انگریزی میں سوچتے ہیں اور پھر اردو میں اس کو منتقل کر ڈالتے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے ہاں انگریزی کے ایسے الفاظ کی کثرت بھی ملتی تھی جن کے خوبصورت اور موزوں مترادفات اردو میں بآسانی دستیاب ہیں۔ میں نے ایک دفعہ "اوراق" میں ان کی توجہ انگریزی کے الفاظ کے مناسب اردو متبادلات کی طرف مبذول کرائی تھی۔ چنانچہ اب انہوں نے انگریزی الفاظ کے استعمال پر زور کو تو خاصا ترک کر دیا ہے لیکن منتقلی کی کیفیت اب بھی موجود ہے اور یہ ان کے اسلوب کی روانی میں زبردست رکاوٹ پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات تو اس میں بلند آوردی کی کیفیت بھی نظر آتی ہے جس سے خطِ نظر رہتا ہوا سا نظر آتا ہے۔

ان کے ایک مخلص نقاد نے لکھا ہے کہ محمد علی صدیقی کا خطِ نظر عموماً نہیں لگتا۔ بلاشبہ انہوں نے جس سنجیدگی سے بحث اٹھائی ہے اس میں کلام کرنے کی گنجائش نہیں لیکن یہاں ڈاکٹر خورشید الاسلام کی طرح خوش آہنگ ترقی کو گھبراہٹ کی طرح ترنم، آل احمد سرور کی طرح مربوط اور وقار عظیم کی طرح بے ساختہ سرشاری کی کیفیت بھی پیدا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس محمد علی صدیقی میں ایک عجیب سا کھردرا پن ہے جو ریگ مار کی طرح اپنا کام کرتا ہے اور ذہنوں کا زنگ کھرچن سے اتارتا جاتا ہے۔ وہ تخلیقی جست کی بجائے تخلیقی فضا کو ابھارتے ہیں اور قاری کو اپنے حاصل سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نیا تجزیہ تخلیق کرنے کے بجائے موجود اور کوشش کرنے کی لگن زیادہ ہے چنانچہ "توازن" سنجیدہ اور متین مطالعے کی خاص مشکل کتاب ہے اور اس کو پڑھنے

سمجھنے اور ہضم کرنے کے لئے محمد علی صدیقی کے موضوعات کی طرف توجہ دینے میں بھی بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔

محمد علی صدیقی کی یہ خوبی یقیناً تعریف کی مستحق ہے کہ انہوں نے معلم نقادوں کی طرح صرف طلبہ کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام نہیں دیا بلکہ ادب کے آفاق کو نئے تناظر میں پیش کرنے اور نظریات کا ایک نیا نظام مرتب کرنے کی سعی کی ہے اور اس سعی میں انہوں نے مغربی ادب کو نسبتاً زیادہ استعمال کیا ہے چنانچہ ان کے ہاں موضوعات کا جو تنوع پیدا ہوا ہے وہ انہیں دوسرے بیشتر نقادوں سے الگ کر دیتا ہے اور ان کی تنقید میں کئی نئی جہتوں کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ اجمال اس حقیقت سے واضح ہے کہ محمد علی صدیقی نے ایسے مستقل نظریوں پر زیادہ توجہ صرف کی جو تحریکوں کو جنم دیتے ہیں۔ انہوں نے فرد کو اہمیت دینے کے بجائے اجتماع کو افتخار دیا اور عملی تنقید میں بھی امیر خسرو، غالب، اقبال اور مجید امجد وغیرہ ایسی شخصیتوں کے فکر و نظر پر قلم اٹھایا جن کے افکار و نظریات میں اپنے عہد کے علاوہ مستقبل کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے چنانچہ ان کی تنقید کو فکری اور نظریاتی تنقید کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ محمد علی صدیقی فن کو نظریے سے الگ کوئی اہمیت نہیں دیتے ان کے ہاں ادب کا سماجی عمل فوقیت رکھتا ہے۔ انہوں نے سیاسی میدان میں بورژوا ادب کے بیشتر اجارہ پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور لکھا ہے کہ

"یاسیت پسندوں سے کسی چیز یا منظر سے خوش ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

چنانچہ ان کے ہاں نقطہ نظر میں تیقن کی کیفیت بھی ہے اور وہ اپنے سدا ای بھی جو انہیں ایک مخصوص عینک بار بار استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ سکہ بند ترقی پسندوں نے انہیں حلقہ بگوش رکھنے کے لئے اپنے خاص نقادوں میں ایک نشست ان کو بھی دے دی۔ یہ اس عطائے خسروانہ کا ہی نتیجہ ہے کہ جب محمد علی صدیقی نے کراچی پر سلسلہ مضامین جاری کیا تو اس پر ترقی پسندوں نے فاصلہ ایک بھی چڑھا لیا شاید وہ اپنی ملکی "میانوں" سے نکلنے پر آمادہ نہیں تھے مجھے تو یہ معلوم نہیں کہ محمد علی صدیقی نے ترقی پسندوں کا عطا کردہ تمام افکار قبول کیا ہے یا نہیں، تاہم چونکہ وہ اب کراچی کی سوانح کو کتابی صورت میں بھی پیش کر رہے ہیں اس لئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ترقی پسندوں کی جکڑ بندی سے کچھ زیادہ خائف نہیں ہوئے۔ یوں بھی جو شخص میکسم گورکی، مارکس، نطشے اور شوپن ہاور وغیرہ کو بیک وقت اپنے تنقیدی قلم کی گرفت میں لا رہا ہے اگر ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، عسکری اور کلیم کاشمیری کی صف میں نمایاں طور پر بھی بٹھا دیا جائے تو قاری اسے کتنے فاصلے سے دور کر سکتا ہے؟

"توازن" کے فکر انگیز مضامین فی الواقعہ پڑھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ محمد علی صدیقی نے ترقی پسندی کے آگے غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کے بجائے اسے اپنی شرائط پر قبول کیا ہے۔ انہوں نے زندگی سے تیغ بکف ہو کر اور دست و گریبان ہونے کو ہی اصل زندگی تصور کیا ہے۔ مغرب کے خوشحال اور خوش حس معاشرے کے خلاف نفسیاتی بغاوت کو بھی مثبت رجحان قرار دیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ

"شاعری کسی طبقہ بندی کا نام نہیں۔"

اور وہ طبقہ بند ادیبوں کو بتاتے ہیں کہ

"بورژوا دور کے روشن خیال اور انسان دوست ادیبوں کا ادب بھی قابل تعظیم ہے اور ترقی پسندوں کو کلاسیکی ادیبوں سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے۔"

شوپن ہاور پر اعتراض ہے کہ

"وہ ملا کے بعد فلسفہ کے ذریعے "مسرت" کا نیا پیغام دینا چاہتے تھے جس سے جدید سیاسی معیشت کی مزاحمت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس نے دنیاوی تقاضوں اور will کو قریباً ایک ہی مفہوم دے دیا۔"

اور اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ

"شوپن ہاور بھی بالآخر امید اور یقین تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

اور فیصلہ کن رائے بھی یہ قائم دیتے ہیں کہ

"شوپنہار کی ساری کوششیں اس دنیا کے تعلقات کو فن اور مراقبے کے ذریعے دور کرنے پر مرتکز ہو جاتی ہیں۔ آپ اسے فرار کا نام دیں یا کسی ذات کا تحفظ، یہ بھی ایک طرح کا "روحانی سفر" ہے۔"

محمد علی صدیقی کا رجحان واضح طور پر ترقی پسندی کی طرف جھکا ہوا ہے۔ انہوں نے نئے ادب پر زبردست اور مسلسل حملے کئے ہیں اور ان کو یاسیت کی جھولی میں دے کر در حقیقت ترقی پسندوں کا پلڑا جھکانے کی کوشش کی ہے تاہم حرکت و عمل کی طرف اس پیش قدمی کے باوجود وہ جدیدیت کی پیش قدمی سے بھی انکار نہیں کرتے چنانچہ محمد علی صدیقی کو بجا طور پر تشویش ہے کہ ہمارے ادب میں ایلیٹ اور پاؤنڈ کے ضمن میں کچھ غیر محتاط رویہ کارفرما ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ محمد علی صدیقی اپنے ان تمام "متعصبات اور پسندوں" کے باوجود جن کی ایک طویل فہرست مدیر "فنون" نے "فنون" میں تیار کی ہے ایسے ترقی پسند نہیں جو علم و روشنی کے صرف ایک مصدر سے فیض یاب ہوں اور دوسرے تمام دروازے بند کر لیں۔ "توازن" پڑھ کر یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ محمد علی صدیقی کھلی آنکھوں اور کھلے ذہنوں سے پڑھنے والے نقاد ہیں اور اپنی رائے کی صحت پر اصرار کرنے کے باوجود اپنی الگ رائے ضرور مرتب کرتے ہیں۔ محمد علی صدیقی کی یہ انفرادیت انہیں بہت سے دوسرے نقادوں پر امتیاز بخشتی ہے اور دماغ کے گوشے وا کر کے اسے جتنا بہتر پڑھنے اور سمجھنے پر مائل کرتی ہے اس کی ایک صورت یوں بھی سامنے آئی ہے کہ محمد علی صدیقی نے بیشتر ترقی پسندوں کی طرح ترقی پسندی کو ایک جامد آدرش بنانے کی سعی نہیں کی بلکہ اسے ادراک کیا ہے۔

"ترقی پسندی فکر انسان و سماج اور انسان و کائنات کے درمیان پاک سچ سے عبارت ہے۔ انسان کے لئے لکھے جانے والا ادب ان کی خوشیوں اور مایوسیوں کے باب میں اس لئے غیر جانبدار نہیں ہو سکتا کہ فنکار ایک فرد ہوتے ہوئے بھی اجتماعی بہبود کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنے قارئین کو ظلم اور بدصورتی کے خلاف

لوٹنے کے لئے گہرے اور فکر انگیز تجربات اور مشاہدات کو پہنچا سکتا ہے"

ہر چند اقتباس میں انہوں نے ادب کا افادی مقصد اجاگر کر کے اور اسے انسان کے ساتھ وابستہ کر کے نہ صرف ترقی پسندی کے ایک سیاسی پہلو کو اجاگر کیا ہے بلکہ ادیب کی سماجی ذمہ داری اور معاشرے کے ساتھ جانبدارانہ وابستگی کو بھی ابھارا ہے اس سب کے باوجود ان کا یہ اعلان توجہ طلب ہے کہ

"ترقی پسند ادب اشتراکی ادب کا نام نہیں"

فنی زاویے سے محمد علی صدیقی کا موقف یہ ہے کہ

"ہر دور کا اچھا ادب اپنے زمانے کے سماجی اور سیاسی محرکات کو جس حد تک بہترین اسلوب میں اور فنی مہارت کے ساتھ رقم کرتا ہے اسی قدر اس کو دوام ملتا ہوا نظر آتا ہے"

اور یہ وہی نظریۂ ادب ہے جس کی بازگشت اردو میں مولانا صلاح الدین احمد، عمر لئیق، ریاض احمد، ڈاکٹر وزیر آغا اور ممتاز شیریں کے تنقیدی مضامین میں ملتی ہے اور ترقی پسند فرمانی اور جدید ادب میں حدِ امتیاز پیدا کرتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ محمد علی صدیقی ادب کو ایسا سیاسی پمفلٹ تخلیق کرنے کے حق میں نہیں جس میں نظریہ چیختا چنگھاڑتا ہوا قاری پر حاوی ہو جاتا ہے چنانچہ اس ادب کا جسے دوام مل چکا ہے تذکرہ آتا ہے تو محمد علی صدیقی اس کا اثبات مارکس کے حوالے سے کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ

"مارکس نے شیکسپیئر، سوفٹ، روسو، ڈیڈیرو، دانتے، بالزاک اور فلابیر کے ادب کے لئے جن کلمات کا اظہار کیا ہے اس کا مطالعہ آج کے ترقی پسندوں کے لئے بہت ضروری ہے"

مجھے یقین ہے کہ ہمارے ترقی پسند دوست اگر محمد علی صدیقی کا یہ مشورہ قبول کر لیں تو ان کی فکری کائنات میں ایک حقیقی انقلاب رونما ہونے میں ذرا بھی تاخیر نہ ہوگی۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ابتدائی ترقی پسندوں نے مادیت، الحاد اور مذہب کی شدید مذمت کی ہے۔ خود محمد علی صدیقی نے مابعد الطبیعات پر جہالت دشمنی کا الزام عائد کیا ہے اور ہیگل کے نظریات سے متاثر نظر آتا ہے تاہم وہ ہیگل کے ثناخواں بھی ہیں کہ

"ہیگل کے لئے انسان کی نجات خدا اور بادشاہ کی اطاعت میں مضمر تھی۔"

المیہ یہ ہوا کہ ہمارے ترقی پسندوں نے خدا کی اطاعت کو بالائے طاق رکھ دیا اور بادشاہِ وقت کی اطاعت کو اپنا وطیرہ بنا لیا۔ نتیجہ دو شق ہوئی شخصیت ہے جس کے داخل اور خارج اور قول اور عمل میں وسیع خلیج حائل ہے۔ محمد علی صدیقی نے اس طریق کو اختیار کرنے کے بجائے جستجوئے صداقت کی کوشش کی اور شوپن ہار کو اس لئے رد کیا کہ "اسے اسلام محض اس لئے پسند تھا کہ اس مذہب میں سماجی سسٹم پر زور ہے اور ناامیدی حرام ہے" انہوں نے تصوف کی انسان دوستی کو تسلیم کیا ہے اور اسے "بھیا جان" کہہ کر پرے بھگانے کے بجائے مغربی نوجوان کے اس رویے پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ

"وہ حافظ کو دورِ غور اقتدار ہی سمجھتا ..... کہ ان کا ذہن الحاد دائیں سے بائیں تھا"

اس طویل بحث سے ایک نتیجہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ محمد علی صدیقی نے ادب، سماج اور مذہب تینوں کو ادبیت دی اور ان کے ساتھ روحانی تقاضوں کو بھی درخورِ اعتنا سمجھا اور تجزیہ و توصیف کو قبول کرنے کے بجائے ان سوال کو تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیا جس سے تذکرہ توصیف ماخوذ یا عبارت ہے اس کاوش میں انہوں نے فن کی جمالیات کو نظر انداز نہیں کیا اور اس عنایت کو بھی ابھارا ہے جو قدم قدم پر نیا روپ دھارتی ہے اور حسن کا حق اور مفہوم یکسر بدل ڈالتی ہے۔

یہ چند زاویے اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ محمد علی صدیقی نے ترقی پسندی کو آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اور دماغ کے فکری گوشے بند کر کے قبول نہیں کیا بلکہ اس پر ایسی قیود عائد کر دی ہیں کہ انہیں اگر سکہ بند ترقی پسند سمجھ جائیں تو انہیں فوراً تحریک بدر کر دیں۔ محمد علی صدیقی خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے اس زمانے میں لکھنا شروع کیا جب ترقی پسند تحریک مرجھا چکی تھی اور ان کا نشتر بھی محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں اور ڈاکٹر محمد شاہین جیسا ہوا اور آج جو ترقی پسندوں کی انجمن میں تذکرہ محض فسانہ بنا پر اپنے جائز مقام سے بھی محروم ہو چکے ہیں لیکن اب تو دنیا کے نقشے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور ادیبوں اور شاعروں پر سیاسی انداز میں پابندیاں عائد کرنے والے ترقی پسند بھی اب تو مفاہمت پسند ہو چکے ہیں اس لئے محمد علی صدیقی کسی خطرے سے دوچار نہیں تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخری خوف میں مبتلا ہیں چنانچہ انہوں نے ترقی پسندوں کے تذکرہ سیاسی کردار اور ادب پر اس کے اثرات کا تجزیہ نہیں کیا۔ شاید فی الوقت یہاں کا موضوع نہیں تھا تاہم چونکہ وہ ایک آزاد فکر نقاد ہیں اور ترقی پسندی کو خامیوں کے ساتھ قبول نہیں کرتے اس لئے ان سے توقع کی جانی چاہیے کہ وہ اس طرف بھی شرح و ضرورت مزید توجہ کریں گے اور اپنے قاری کے دل میں ابھرنے والے اس تجسس کو بھی دور کریں گے کہ انہوں نے ترقی پسندوں کو اپنی خاموشی کا تحفہ نہیں دیا۔

میں نے سطورِ بالا میں عرض کیا ہے کہ محمد علی صدیقی کی تنقید میں جدیدیت کے لئے تو قدرے نرم گوشہ موجود ہے لیکن انہوں نے جس انداز میں جدیدیت کا یہ محاکمہ پیش کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسندی کی طرح جدیدیت کو بھی ایک مخصوص عینک سے دیکھتے ہیں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سیاسی نوذ شوپن ہار اور ہیگل کے مطالعے میں جو ذہنی سفر طے کیا ہے اس نے ان کے ہاں افکار اور فکر کی گنگا جمنی کیفیت پیدا کر دی اور یوں انہوں نے تاسف اور اطمینان دونوں کا ذائقہ چکھا۔ واضح رہے کہ ان کے ہاں سوال ابھارنے اور پھر جواب مہیا کرنے کا میلان رہا ہے اور پھر اس کے لئے استدلال پیش کرنے کا انداز نمایاں ہے مگر ان کا جواب یا استدلال بحث ان کی گتھی نہیں کرتا اور وہ ایک موضوع کو مختلف زاویوں

سے بار بار ٹکراتے ہیں اس لئے میرے خیال میں انھیں یاس کا سامنا شاید زیادہ کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ یاسیت ان کے ہاں ایک غالب موضوع بن کر ابھرا اور یہ ان کی سائنٹفک تنقید پر دھوئیں کے ایک غبار کی طرح محیط ہے۔ یہ بیان اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب ۱۹۸۹ء میں انہوں نے ...... "ہمارا ادب اور قومی دماغ" لکھا تو ان کا فکری افق نسبتاً زیادہ وسیع تھا اور ان کے ہاں سائنس کے عیاں افق کو عبور کر کے مابعد الطبیعات اور تصوف کی دنیا میں داخل ہو جانے اور مغرب سے استفادہ کی آرزو بھی موجود تھی۔ چنانچہ محمد علی صدیقی لکھتے ہیں کہ

"قومی کائنات پیدا کرنے کے لئے اس فکر کی ضرورت ہے جو عیاں افق پر ہی جا کر نہ رک جائے بلکہ خیالات کی بلندی کے سہارے ہمارے افق کے اس پار جائے جہاں سائنسی مشاہدہ دم توڑ دیتا ہے اور مابعد الطبیعات اور تصوف کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک قومی دماغ کی موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے جو اپنے ماضی کو سرمایہ جانے مغرب میں جہاں برائیاں ہیں وہاں بہت سی اچھائیاں بھی ہیں اور ہم لاکھ قوم پرست بن جائیں مغرب سے استفادہ کئے بغیر نہیں بڑھ سکتے۔"

۱۹۹۸ء میں جب انہوں نے "جمالیاتی منافقت" لکھا تو وہ فنی تخلیق کے جمالیاتی عوامل تلاش کرنے میں سرگرداں تھے۔ انہوں نے سامنے آیا کہ اس فکری فیصلے سے کہ

"اخلاقی فیصلے نیکی اور بدی کو لازم و ملزوم ماننے سے پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے یہ فیصلے بڑی حتمی نوعیت کے ہوتے ہیں چونکہ ان میں ایک خاص قسم کی مقصدیت غالب ہوتی ہے جبکہ خالص جمالیاتی فیصلہ یا حکم بنیادی حسن پر ہوتا ہے اس لئے یہ کسی بھی دور میں ... کے تابع نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہی فیصلے مناسب ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں حسن کو ایک قدر مانا جائے اور اسے ہم کسی ایسے مجموعہ کے تصور کی حیثیت میں نہ دیکھیں جو ہماری حسوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

برملا اختلاف کیا اور لکھا ہے کہ

"مگر فن کا اپنا کوئی آدرش اب تک ہمارے سامنے آ سکا ہے تو وہ اخلاقی ہے۔"

انہوں نے یونانیوں کے برعکس افلاطون کے نظریۂ جمال کو اس کے اپنے سماجی پس منظر کا آئینہ دار قرار دیا اور لکھا کہ

"افلاطون نے آج کی ڈکٹیٹرانہ حکومتوں کے لئے بنیادیں فراہم کی ہیں؛ سنسرشپ کی بنیاد ڈالی اور ادب کو مخرب اخلاق اور غیر مخرب اخلاق حصوں میں تقسیم کر کے حسن کو سیاسی طور پر اچھا اور برا کہنے کا جواز پیش کیا۔"

لیکن دوسری طرف جب محمد علی صدیقی یہ اعلان کرتے ہیں کہ

"ثقافتی تحریک نے جب پانچویں نسل کو یلغار اور فنون میں حقیقت پسندی اور تخیل پسندی کو اس قدر بڑھایا کہ اس سے عمرانی اخلاقی اساس اور پابندی کی بنیاد ہل گئی تو فن اخلاق سے زیادہ جبلت کا لمس کی پہنائیوں کا کھوج لگانے کا نام ہو گیا۔ اس طرح افلاطون ہار گیا اور سوفسطائیت جیت گئی۔"

تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ تنقید فن کے اخلاقی معیار سے بھی مطمئن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس بے اطمینانی نے ان کے ہاں یاسیت پیدا کی ہے چنانچہ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں یاسیت کی مابعد الطبیعات دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۷ء میں نطشے کے ساتھ الجھاؤ اور "یاسیت پسندی اور نطشے" اور "نئی اردو شاعری کی فلسفیانہ اساس" جیسے معرکہ آرا مضامین لکھے۔ ان کی کتاب "توازن" ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ اسی سال کا مضمون "ہائیڈیگر اور جدید اردو ادب" بظاہر ہائیڈیگر کی وفات پر لکھا گیا ایک موثر تعزیت نامہ ہے لیکن اس میں بھی یاسیت کا موضوع محمد علی صدیقی کی پُرمغز بحث میں پیکر اور ہیولا بدل بدل کر آتا ہے اور یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ وہ اس باب میں ابھی تک کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچے۔ یوں بھی بقول محمد علی صدیقی

"کون سے سنجیدہ مسئلے کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماجرا اس پر بحث ختم ہو چکی ہے۔"

یاسی انحصار میں یاسیت کا تعلق اگرچہ روز و قول کے داخلی عمل کے ساتھ ہی ہے لیکن اس کے بیشتر عوامل تو انسانی زندگی کے خارج میں پھیلے ہوئے ہیں۔ محمد علی صدیقی کا یہ خیال درست ہے کہ

"آج کی سب سے بڑی نیکی خبر رسانی میں تیزی لانا ہے"

تاہم اگر یہ تیز رفتار نیکی ہو اور خبر کا متبادل بن چکا ہو تو کیا یاسیت کا پیدا ہونا ناگزیر نہیں ہو جاتا۔ کیا نیکی اور بدی صرف ذکر تیز اس یاسیت کا مداوا کر سکتی ہے اور کتنے لوگ ہیں جو اس صورت حال میں بھی خیر کا پرچم ہی سر بلند رکھتے ہیں اور سقراط کے عمرانی عمل کے مطابق زہر کا جام تھام لیتے ہیں۔ محمد علی صدیقی نے اس حقیقت کا ادراک تو جرأت مندی سے کیا ہے کہ

"اب اخبارات کے ذریعے کسی موقف کی صحت کا تعین کرنا احتمال کی قوتوں کے لئے ممکن نہیں رہا بلکہ اخبارات بڑی منظم طاقتوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اب بہشت و دوزخ چوراہوں پر تقسیم ہو رہی ہے اور اب لوگوں کو اندھے اور زیادہ ریوڑیاں دے رہے ہیں۔"

اور وہ اس حقیقت سے بھی آگاہی رکھتے ہیں کہ

"زندگی سے ذرا سا بھی علاقہ رکھنے والے لوگ کیونکر سپاٹ آرائی میں چپ سادھے کھڑے رہ سکتے ہیں۔"

لیکن اس عملی صورت کو جس پر منتشر کرنا لازم تھا یاسیت کی اساس دیکھی گئی ہے یکسر نظر انداز کر دیا ہے چنانچہ انہوں نے ان ادبا کی شاعری نہیں کی جو اس سپاٹ آرائی پر نہ صرف چپ ہیں بلکہ یاسیت، تماشبینی اور عدم اطمینان پھیلانے میں فریق غالب کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا شاید غیر مناسب نہ ہوگا کہ محمد علی صدیقی نے ترقی پسندی کو استحکام دینے کی جو عملی کوشش کی ہے وہ صرف نظریاتی ہے۔ محمد علی صدیقی کی اتنی اہم کے ساتھ ترقی پسندی کو قبول نہ کرنا شاید وقار کے قدم کو روکنے کے مترادف ہو لیکن آج کتنے ترقی پسند اس بیچارے کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں؟

محمد علی صدیقی کا عہد

قمر جمیل

عسکری صاحب اور ممتاز حسین کے بعد ہمارے درمیان صرف ایک نقاد زندہ رہ گیا ہے اور وہ محمد علی صدیقی ہے محقق اور مورخ دو حضرات ہیں ایک مشفق خواجہ اور ایک جمیل جالبی ہاں سرگودھا میں ایک انشائیہ نگار بھی ہیں وزیر آغا باقی اللہ اللہ خیر صلا..... معاف کیجئے ایک genuine writer مشتاق احمد یوسفی بھی ہیں ان کا ذکر میں بھول گیا تھا۔

مشتاق احمد یوسفی جتنے شوخ اور چلبلے ہیں اتنے ہی سنجیدہ محمد علی صدیقی ہیں۔ میں آج صرف محمد علی صدیقی پر گفتگو کروں گا بقیہ حضرات کے بارے میں خاموشی رہے گی۔ میں ڈرتا صرف دو آدمیوں سے ہوں مشفق خواجہ سے ان کی ظرافت کی وجہ سے اور محمد علی صدیقی سے ان کے علم کی وجہ سے ورنہ تمام نقادوں سے بھی ڈرتا ہوں لیکن ان کے تحمل کی وجہ سے ان کی طرف اشارے آپ کو محمد علی صدیقی کے مضامین میں مل جائیں گے۔

میں محمد علی صدیقی صاحب سے ڈرنے کے علاوہ محبت بھی کرتا ہوں۔ ان سے کسی زمانے میں ہماری جنگ بھی رہی ہے جب وہ نثری نظم کے حمایتی ادیبوں پر تنقید کر رہے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہم پر کچھ جنون بھی سوار تھا ہم گندے مشاعروں اور بال بڑھائے ہوئے پاگل شاعروں سے اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ اگر سمندر زیادہ قریب ہوتا تو سمندر میں چھلانگ لگا دیتے۔ یہ تو خیریت ہوا کہ نثری نظم میں چھلانگ لگا دی تھی۔

ہم یہ سمجھتے تھے کہ غزل اکتا دینے والی Monotony کے سوا کچھ نہیں ہے غزل ختم ہو چکی ہے اب صرف نثری نظم لکھی جائے گی ہمارے ملک میں شور مچانے والوں نے کیا کیا کہہ رہے ہیں ان کو چھوڑیے۔ جن لوگوں نے ہمارے ساتھ وقت جاری کئے ان میں محمد علی صدیقی سب سے آگے تھے۔ ہم نے کتابیں اٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلا کہ ارسطو کی بوطیقا ہی میں نہیں مقدمہ شعر و شاعری میں بھی لکھا ہے نجم الغنی کی بحر الفصاحت میں بھی لکھا ہے کہ شاعری بحر کے علاوہ بھی ہو سکتی ہے بودلیر اور دوسرے مغربی شاعروں کی نظمیں ہاتھ لگیں جنہیں فرانس کے Decadent زوال پسند شاعر کہا جاتا ہے۔ محمد علی صدیقی صاحب ترقی پسند تھے اور اس قسم کی انحطاط پسند شاعری سے الرجک بھی تھے چنانچہ انہوں نے نثری نظم کے پرتشدد حامیوں سے جنگ کا اعلان کر دیا۔

ہم محمد علی صدیقی سے محبت کرتے تھے ان کا غصہ دیکھ کر چپکا ہے ٹوہر ممتاز حسین صاحب بھی ناراض تھے انہیں کون سمجھاتا۔ محمد علی صدیقی صاحب کا ایک اور Target تھا وہ جدیدیت تھی۔ لسانی تشکیلات کا نظریہ اور افتخار جالب کی شاعری۔ محمد علی صدیقی نے بتایا کہ جناب یہ لسانی تشکیلات وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے یہ وٹ گنسٹائن کی Linguistic Forms کا ترجمہ ہے یہ نظریہ وٹ گنسٹائن کی پہلی کتاب Tractatus سے ماخوذ ہے اور اپنی دوسری کتاب Investigations میں اس نے پہلی کتاب کی تردید کر دی ہے تو گویا خود لسانی تشکیلات کے اوریجنل مصنف ہی نے اپنی تصنیف کی تردید کر دی۔

ان دو کاموں کے علاوہ محمد علی صدیقی نے کچھ اور کام بھی اہم کئے مثلاً ترقی پسندوں کے ہراول دستے کے نظریات میں تحول بتایا.....

ذرا ٹھہریئے میں ایک چیز تو چھوڑے ہی چلا جا رہا تھا وہ ہے کروچے کی سرگذشت کا ترجمہ اور کروچے پر مضمون۔ یہ بھی ایک اہم کام ہے اس لئے کہ محمد شریف اور دوسروں کو مجبوری نے کروچے پر جو کچھ لکھا ہے محمد علی صدیقی نے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اس زمانے میں جب محمد علی صدیقی نے کروچے کا ترجمہ کیا اور اس پر مضمون لکھا سلیم احمد نے کہا کہ Leftist ہونے کے باوجود محمد علی صدیقی کروچے جیسے Rightist پر کیوں لکھ رہے ہیں وہ تو مارکس کا مخالف بھی تھا۔

لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ کروچے ہی پر نہیں انہوں نے نطشے، ہائیڈیگر، وٹ گنسٹائن اور چومسکی پر بھی مضامین لکھے۔ برٹنڈ پر بحث لکھا اور گولڈ دیل پر توجہ نہیں کی اس کی وجہ یہی تھی کہ محمد علی صدیقی کا خیال تھا کہ ہمارے عہد کو جو مفکر متاثر کر رہے ہیں ان سے ترقی پسند حضرات واقف نہیں ہیں۔

خود محمد علی صدیقی کے الفاظ میں

ترقی پسندوں نے وٹ گنسٹائن کو وجودی فلاسفر کی طرح محض ایک بورژوا مفکر قرار دے کر ذہنی کاہلی کا مظاہرہ کیا ہے اور پھر چنداں حیرت نہیں کہ وہ ہم عصری زبان اور حقیقت کے ادراک میں کافی پیچھے رہ گئے (لسانیات تنقید اور وٹ گنسٹائن)۔

چنانچہ اس عہد کے بڑے بڑے مفکروں پر دل کھول کر مضامین لکھے ان میں نطشے بھی آ گیا لیکن جن لوگوں پر محمد علی صدیقی صاحب نے خاص توجہ کی ان میں سارتر، ہائیڈیگر، چومسکی اور وٹ گنسٹائن شامل ہیں۔ وٹ گنسٹائن اور چومسکی کو متعارف کرانے کا سہرا انہی کے سر ہے وزیر آغا صاحب شاید واقف ہوں ورنہ اس زمانے میں یعنی ۱۹۷۵ء میں جب محمد علی صدیقی نے ساختیات پر ایک دو نہیں چار مضامین لکھے ہیں پاکستان میں بڑے بڑے علماء و نقاد حضرات نے ساختیات کا نام بھی نہیں سنا تھا ہاں حسن عسکری صاحب مستثنیات میں سے ہیں جو اس زمانے میں بھی فرانسیسی زبان میں اسٹرکچرلزم پر فرانسیسی مصنفوں سے خط و کتابت کر رہے تھے اسی زمانے میں محمد علی صدیقی نے اردو زبان میں نوام چومسکی پر پہلا مضمون لکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی صدیقی صاحب میں کس قدر بصیرت ہے۔ اب لسانیات اور ساختیات کے سلسلے میں چومسکی کا نام سمجھ کر رہ گیا ہے ورنہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ جن مفکرین نے سوسیر کی بنیادوں پر لسانیاتی نظریے کو قائم کیا

ہے انہیں رومن جیکب سن، بن ونسٹے (Benveniste) اور نوام چومسکی (Noam Chomsky) شامل ہیں اور یہ کہ آخری اور اس عہد کا سب سے بڑا نام چومسکی کا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تجریدی قطعیت اور سادگی کے اعتبار سے چومسکی کا کام مثالی نوعیت کا ہے۔ دوسری بات یہ کہ چومسکی نے جو اہلیت (competence) اور کارکردگی (performance) کا نظریہ پیش کیا تھا اُسے Jonathan Culler نے سوسیر کے نظریے لینگ اور پیرول سے بہتر بتایا ہے۔

ویسے چومسکی کی تخلیقی گرامر کا ساختیات نے کوئی اثر قبول نہیں کیا یعنی آج اسٹرکچرل ساختیات میں چومسکی کا نقطہ نظر ایک زندہ اور فعال نقطہ نظر نہیں ہے۔

چومسکی اور ثقافتی مادہ اور ہائیڈیگر کی فکر پر نطشے کے خیالات پر بحث کرنے کے لئے یہ مناسب موقع نہیں ہے۔ بہرحال یہ لوگ فنا کی فکر کا عنصر بن چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبداللطیف بھٹائی سے بھی محمد علی صدیقی نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ آپ کو ان کے مضامین میں سیاست، سماج اور آرٹ کے سلسلے میں یکساں دلچسپی کا اظہار ملے گا۔

جدید ترقی پسند نقادوں میں محمد علی صدیقی سب سے زیادہ eloquent ہیں۔ ان کی آواز ہمارے معاشرے کی ترقی پسند آواز ہے۔ ان کا اسلوب کچھ بوجھل ضرور ہے۔ مسائل کی گہرائیوں میں زیادہ اترنے کی بجائے ان کی معلومات و فکر کا دامن بہت وسیع ہے۔ شاعری سے ان کی دلچسپی پابلو نرودا سے فیض تک پھیلی ہوئی ہے۔

محمد علی صدیقی ہمارے ہم عصر ہیں اور جدید ترقی پسند فکر کے ایڈووکیٹ۔ انہیں ہمارے فکری اور ادبی حلقوں میں جو اعتبار حاصل ہے وہ آج کسی اور نقاد کو حاصل نہیں ہے سوائے گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا کے۔ ڈاکٹر وحید اختر، حسن والے پوری بحثوں کو ... ممتاز حسین جیسے نقادوں کے سلسلے کی کڑی ہیں اور مغربی ادب اور فلسفہ اور اردو کے درمیان رابطہ قائم کرنے والوں میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔

ظاہر ہے کہ مجھے ان کی ساری تحریروں سے اتفاق نہیں ہے۔ کہیں یہ اختلاف Meaning اور Content کی بنیاد پر ہے اور کہیں اسلوب کی بنیاد پر۔ میں ان کا مداح ضرور ہوں لیکن ان کی عظمتوں کا مداح ہوں غلطیوں کا مداح نہیں ہوں۔ پہلے غلطیاں سن لیجئے پھر ان کی عظمتوں کا ذکر کروں گا۔ غلطی یہ کہ خواہ مخواہ تعریف میں مبالغہ کر دیتے ہیں۔ مجھے تو بعض اوقات حیرت ہوتی ہے جب وہ پریم چند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اردو اور ہندی فکشن کے کوہ ہمالیہ ہیں یا کرشن چندر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ہرگز کے اتنے بڑے پیڑ تھے کہ ان کے سائے میں پاؤں پسارنے کی خواہش فطری تھی۔ اقبال کے سلسلے میں کہتے ہیں: اقبال کی فکر اگر غیر پختہ اور لولی ملتی تو بڑی مقصدی شاعری کی روحانیت انہیں سپاٹ کر جاتی۔ خیال تو بہتر درست ہے لیکن پاؤں پسارنے کی طرح سپاٹ کا لفظ بھی کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اب اقبال کے بارے میں دو تین جملے اور سن لیجئے: اقبال کی فکر کی جو ور بہانے بھی کی پورن ماشی کے چاند دیکھے تھے لیکن انسان کو مقام محمود پر فائز کرنے والا اقبال ۱۸۹۹ء میں اپنی نظم "نالۂ یتیم" سے لے کر "ارمغان حجاز" کی نظموں تک ہر بات انسان دوستی کے حوالے سے کہتا ہوا ملتا ہے۔

مجھے اس اقتباس میں مقام محمود کا لفظ عجیب لگتا ہے۔ اقبال پر اسی مضمون میں انہوں نے لکھا ہے اور نتائج تو یہ ہے کہ اقبال حسرت موہانی کی طرح ایک اشتراکی مسلم تھے۔

حالانکہ ایک دو پیراگراف پہلے اسی مضمون میں انہوں نے یہ لکھا تھا کہ اقبال کی ترقی پسندی مارکسی لینی فکر کے تابع نہیں بلکہ ایک ترقی پسند سماج کے لئے سرگرداں ایک عظیم انسان دوست کی ترقی پسند فکر ہے۔

مجھے محمد علی صدیقی کی عظمت کا احساس اُس وقت بہت ہوا ہے جب مجھے وہ ایک انسان دوست ادیب نظر آتے ہیں۔ صرف انسان دوست نہیں وہ ایک Committed ادیب بھی نظر آتے ہیں۔

پچھلے تیس برسوں سے میں انہیں دیکھ رہا ہوں انہوں نے کبھی گروہ بندی نہیں کی، ادب کو اپنے فکری سیاسی سماجی اور جمالیاتی اظہار کا ذریعہ سمجھا ہے۔ کسی پروفیسری کے حلقے نہیں کھڑے کئے، بڑے اخباروں اور رسائل میں لکھتے رہے لیکن کبھی کسی پر فقرہ بازی نہیں کی۔ اختلاف ضرور کیا ہے مجھ جیسے ادیبوں سے جو نثری نظم کی حمایت میں آگے بڑھ کے چلے جا رہے تھے۔ افتخار جالب جیسے جدید شاعروں سے، نئے اور قدیم ترقی پسندوں سے بھی اختلاف کیا۔ لایعنیت اور Absardity کی مخالفت کی۔ فنانیت، روشن خیالی اور دردمندی ان کا مسلک رہا ہے۔ وہ نارتھ کے وہ پیشہ قائل رہے ہیں ان کے کئی آئیڈیل انہیں پابلو نرودا سے قریب لے گئے وہ کہتے ہیں کہ پابلو نرودا کی آخری پناہ گاہ انسان دوستی اور تضادات سے عاری انسانی سماج ہے۔

محمد علی صدیقی نے عسکری صاحب پر جو مضمون لکھا ہے اس کا عنوان ہے محمد حسن عسکری کا دائرہ سفر اس کا آخری جملہ ہے:

وہ ایک عجیب و غریب ہم عصر تھے

میں محمد علی صدیقی پر اس مضمون کو اس جملہ پر ختم کرنا چاہتا ہوں:

وہ ایک عظیم ہم عصر ہے

عظیم کیوں؟ عظیم اس لئے کہ وہ ہمارے تین بڑے آدمیوں میں سے ایک ہے یعنی گوپی چند نارنگ، وزیر آغا اور محمد علی صدیقی جیسے میں پھر ایک نام بھول گیا یعنی مشتاق احمد یوسفی کا نام.....یوسفی صاحب ہر طرح سب سے بڑے نثر نگار ہیں اور محمد علی صدیقی سنجیدگی کے۔ ابن انشاء نے کہا تھا ہم دور یوسفی میں جی رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ نہیں یہ محمد علی صدیقی کا عہد ہے مگر ہم جیسے لوگ ہر جلسے میں ملیں گے۔

نئی تنقید کا شہسوار

ریاض صدیقی

تنقید علومِ جدیدہ کا سب سے اہم شعبہ ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے مغربی ذہن نے اس شعبہ کی مدد سے حیات و کائنات کی شکل بدلی ہیں۔ سماجی تہذیبی' اخلاقی' انتقادی اور علمی و فکری وسائل میں جس نوعیت کی داخلی اور باطنی و تغیر طرز احساس کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ تنقیدی روایت سے بھرپور استفادہ ہے۔ عہدِ حاضر میں سائنسی انکشافات کے زیرِ اثر تشکیل پانے والے فکری فلسفے نے فن تنقید اور علومِ جدیدہ کے مابین مغائرت کی ساری سرحدوں کو معدوم کر دیا ہے۔ مغرب نے بڑی تنقید کے نمونے پیش کیے کیوں کہ وہاں کے تخلیقی ذہن' سائنس کے فکری حقائق اور اسرار و رموز سے بہت زیادہ واقف ہیں۔ ہمارے یہاں سائنسی فکر سے استفادے کے دعوے تو بہت کیے گئے لیکن اس کی باریک اور پیچیدہ فکری صورتوں کی تفہیم پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید کے ماضی میں مادیت اور حقیقت پسندی کے مجموعی آثار وطلا، نیوٹن' ہوبز اور ڈارون کے زیرِ اثر رواج پانے والے نظریاتی فلسفے تک محدود ہیں۔ ترقی پسندی بھی اپنی تمام تر خوبیوں اور کمالات کے باوجود آئن سٹائن' ہائی زن برگ اور پلانک کے نظریۂ فکر سے رشتہ قائم نہ کر سکی۔ جس سے بیسویں صدی کی انقلاب آفریں سائنسی فکر نے کلاسیکی طبیعات کے مادی' میکانکی اور ریاضیاتی نظم کی عمارت میں دراڑیں پیدا کر دی ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے بعد اردو تنقید کی وہ روایت جو بعض کمزوریوں کے باوجود بیرون جز صدی کی اور بتدریج ایک تحریک کی شکل میں تخلیقی دنیا کو روشنی فراہم کرتی تھی۔ جمود و خود اسیری کا شکار ہو گئی۔ خلا کی ایک کیفیت پیدا ہو گئی۔ نثر نگاری کا جادو گہنا گیا اور شاعری کی لے میں حزنی آ گئی۔ تبصروں' تذکروں اور تشریحی نثر کو تنقید کے نام پر فروغ ہوا اور جدیدیوں نے زوال پذیر نظریات کی تشہیر شروع کر دی۔ کسی نے آدھے اور پورے آدمی کا فقرہ چھوڑ کر چونکانے والی کیفیت کی راہ لی۔ کوئی دوہری شخصیت کی باتیں کرنے لگا کسی نے دو اور دو پانچ جیسے مضحکہ خیز نادوسرے کا نام لے کر قاری پر رعب جمانے کی کوشش کی۔ کچھ نے اقدار اور روایات کی کڑیوں کو درہم برہم کرنے کا مشورہ دیا اور ایک محترم نقاد نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ اردو زبان کی ساخت اور قواعد بڑے ادب کی تخلیق میں مانع ہیں وغیرہ وغیرہ۔

تنقید کے اس قحط دور میں یہ بے کیفی ادب کی نشوونما کے حق میں مضر ثابت ہوئی۔ تنقید کی روایت میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ ممتاز حسین' احمد ندیم قاسمی' مجتبیٰ حسین اور فیض نے اس عرصے میں تنقیدی روایت کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کی کوششیں ضرور کیں لیکن روایت کا تسلسل بحال نہ ہو سکا اس عرصے میں انسانی ذہن نے زمین سے آسمان تک وہ چھلانگ لگائی کہ شروع میں دنیا بھر کے لوگ انگشت بدنداں نظر آئے لیکن بقول حالی ۔ آخر میں رفتہ رفتہ سب ہو گیا گوارا۔ محمد علی صدیقی اس دور میں ابھرنے والے پہلے نقاد بلکہ جدید ترقی پسند نقاد ہیں۔ جدید ترقی پسند اس لئے کہ انہوں نے فکری اور تجزیاتی روایت سے وابستگی کے ساتھ نئے حقائق و آفاق اور مباحث و مکالمات (Dialogues) کو تنقید میں راہ دی ہے۔ حیات و کائنات کے ادراک اور سماجی مقصدیت کے نظریے کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے کلاسیکی مادیت' معروضیت اور خارجیت کے میکانکی ترقی پسندانہ میلان کو نئی سائنسی فکر سے ہم رشتہ کیا ہے چنانچہ تخلیقی اظہار میں اعتدال کے ساتھ موضوعیت خیال' وجدان اور سائنسی حقیقت پسندی کا اعتراف ان کی تنقید میں جھلکتا ہے۔ وجدان اور سائنسی حقیقت پسندی ہیگل اور اس کے پیروکاروں کی حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے چنانچہ انہوں نے مسائل و نظریات کے مباحث میں کلاسیکی حقیقت پسندی اور ماورائے عقل وجدان کا اثبات نہیں کیا ہے۔

محمد علی صدیقی کے فکری ترجیحات پر گفتگو سے قبل تنقید کے ماضی اور اس کی عمومی حیثیت کا حوالہ ضروری ہے۔ اردو تنقید کی گرمئ بازار کی کمی نہیں ہے اس کو مشرق کی موہوم کم کرنا یا محض پیروی مغرب قرار دینا احساس کمتری کے اظہار یا چونکانے والے فقروں کے ذریعے خود نمائی کی ایک کوشش ہے۔ غالب' سرسید اور حالی کے بعد احتشام حسین' اختر حسین رائے پوری' مجنوں' فراق' نیاز' عبادت بریلوی' وقار عظیم' ڈاکٹر سید عبداللہ اور آل احمد سرور نے تنقید کو سادہ سوانح نگاری' تشریحی اسلوب اور قواعد و عروض کی موشگافیوں سے نجات دلا کر علومِ جدیدہ کا ہم سفر بنا دیا تھا۔ محمد علی صدیقی اسی روایت کے آسمان کا ستارہ ہیں جنہوں نے نئے دور کے تجربوں اور عصری مسائل کے باہمی ارتباط سے تنقید کو تخلیقی حرارت' ندرت بیان اور بین الاقوامی علمی روایت کی آگہی سے مالا مال کیا ہے۔ تنقید شاعری نہیں بلکہ شاعری سے بھی زیادہ مشکل صنف ہے۔ جہاں نقاد کو بیک وقت تخلیقی جوش و جذبے اور فکری و نظری اسرار و رموز کے پل صراط سے گزرنا ہوتا ہے۔ فراق اور مجتبیٰ حسین صاحبان سے معذرت کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ علم دریا تو تنقید ہے جہاں ماضی کے پورے تاریخی تہذیبی اور فکری شعور' حال کے علوم و افکار و مباحث میں فلسفہ و فکر کے قدیم و جدید آفاق کی تعبیر یا ساری شکل دکھائی دیتی ہیں۔ تنقید کو تخلیق پر برتری نہ دیجئے لیکن یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ تنقید بھی تخلیق ہے۔ عظیم ادبی شاہکار کی تخلیق میں تنقید برمحل دستے کا رول ادا کرتی ہے۔ دنیا کے شہرہ آفاق فنکاروں کا ذہن تنقیدی شعور کی آماجگاہ تھا۔ انسان کی تنقیدی سرشت ہی اس کی تخلیق اور معنویت کا محرک بنی اور اسی کی مدد سے اس نے تاریک غاروں اور حجری دور سے آگے بڑھ کر کھلی اور آزاد فضا تلاش کی۔ تخلیقی پیمانہ تنقید کے بغیر محض بیہودہ کا شباب ہے۔ نقاد جب معروضی اور موضوعی منطقوں کا سفر شروع کرتا ہے تو

دین ہو داری کی آزمائش اس کا مقدر تھی ہے یا شاعری ہو تو موزونی طبع اور مشاہدہ تجربہ کی مدد سے بھی کی جا سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ جاگیردارانہ تہذیب کے دور شباب میں دکن، دلی، لکھنؤ اور لاہور کے گلی کوچوں والے بھی شعر موزوں کر لیتے تھے لیکن غالب کی فکری و تنقیدی بصیرت جب شعر میں ڈھلی تو شعر موزوں کرنے والے کچھ نہ سمجھ پائے اور غالب کو کہنا ہی پڑا۔

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

شاعری کو تنقید و تعبیر حیات جان کر مصائب و محاسن اور مقاصد و امکانات کا بھی تعین ہمیں محمد علی صدیقی کے یہاں نظر آتا ہے ترقی پسندی کی ایک جہت اقبال میں اظہار رائے کرتے ہوئے وہ عجمی تصوف کی رہبانیت اور دنیا بیزاری کے خلاف اقبال کی آرا کو سراہتے ہیں اور اس کی پوری شخصیت کے محور کا تعین کرتے ہوئے دو ٹوک رائے دیتے ہیں۔ حرکت و تبدیلی کا عاشق اقبال مذہبی روح کو خیر باد کہے بغیر ایک ایسا ترقی پسند ہے جس کے سامنے بہت سے بزعم خود ترقی پسند حضرات رجعت پسند دکھائی دیتے ہیں۔ محمد علی برصغیر کی گذشتہ دہائیوں میں ابھرنے والے پہلے نقاد ہیں جن کے بارے میں انجم اعظمی کے اس خیال کو قبول کیا جائے گا کہ ان کی تنقید اس بھرپور جامعیت سے آشنا کرتی ہے جو صدیوں کے جدلیاتی اور تاریخی عمل سے پیدا ہوتی ہے اور انسانیت کے مستقبل سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ یہ جامعیت توازن کے مضامین میں فکری، علمی، ادبی اور فلسفیانہ بحثوں کا منطقی نتیجہ بن کر سامنے آتی ہے۔

مغرب کی علمی و فکری اور ادبی تاریخ کے قدیم و جدید ادوار پر گہری گرفت اور نظری مباحث کے ادراک کے باوجود اردو کی علمی و ادبی روایت کی اہمیت اور احترام کے باب میں بھی ان کا رویہ غیرت اور مشرقی شعور سے ہم آہنگ ہے۔ محمد علی کو ان صاحبان نقد و نظر میں شمار نہ کیجیے جو کوے کی طرح ہنس کی چال چلتے ہیں اور اردو زبان و ادب کی کم مائیگی و تہی دامنی کا گلہ کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کا رویہ بہت واضح اور متوازن ہے۔ برصغیر کی تہذیب کا مطالعہ اس کے اپنے سیاسی و سماجی تناظر کے اندر رہ کر ہونا چاہیے تا کہ اس کی فکر کا اطلاق کرتے ہوئے ہمیں علم ہو کہ کون سے اجزائے فکری ہیں جو ہر صورت ہمارے اپنے ہیں۔

محمد علی صدیقی کی تحریروں کا بنیادی محور ان تحریکات و عوامل کی جستجو ہے جن کے زیر اثر لایعنی ادب کو جدیدیت کے نام سے رائج کرنے کی بے نتیجہ کوششیں کی گئیں۔ ہیڈیگر، ہسرل، سارتر، کروچے، نطشے اور کیکگارڈ کے افکار اور فلسفیانہ موشگافیوں کی تہہ در تہہ سطحوں سے گذر کر انہوں نے مغرب کے نظام فکر کی کوتاہیوں اور خامیوں پر گرفت کی ہے۔ گذشتہ دہائی میں فکری سطح پر لایعنیت کے خلاف تنقیدی محاذ آرائی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ برصغیر میں لایعنیت کی روایت کے منتشر دھاروں کا رخ موڑنے میں ان کے تنقیدی مباحث کا کردار یقیناً قابل حوالہ رہے گا۔ لسانیات کی سائنس میں نظریاتی فلسفہ کے اثر و نفوذ پر بھی ان کی فکر انگیز اور نتائج آفریں بحثیں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں کیا تنقید کو فکر و فلسفے کی شاخ کا درجہ دیتے ہوئے انہوں نے عملاً فکر و فلسفہ کو تنقیدی روح میں تحلیل کر لیا ہے۔

محمد علی صدیقی کی تنقیدی بصیرت اور جانچ پرکھ کی صحیح صلاحیتیں ان مباحث میں نمایاں ہیں جو فرد پر نہیں بلکہ ادب کی قدیم و جدید تحریکات اور ان کی تعمیری و تخریبی اثرات کا سراغ لگاتے ہیں۔ پیچیدہ علمی مباحث میں منہمک ہونے کے باوجود ان کا اسلوب و طرز بیان تنقیدی معیار کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے ان کا لہجہ نئے زمانے کا لہجہ ہے۔ جمہوری روایات کے زیر اثر تربیت پانے والا لہجہ۔ اس لہجے میں جدیدیوں والا "میں" نہیں ہے۔ طرز بیان کی اس انفرادیت کے ساتھ ان کے یہاں کسی مرحلے پر جھنجھلاہٹ، جارحیت اور ابہام کا رجحان دکھائی نہیں دیتا۔ چونکانے اور گونج پیدا کرنے والی فقرہ بازی نظر نہیں آتی۔ مغرب سے آگہی نے بعض اہل الرائے کے یہاں غیر معمولی احساس برتری کا مرض پیدا کیا جس سے مغلوب ہو کر غزل کو نیم وحشی صنف اور میلارمے کو عظیم ترین تخلیق کار کہا گیا۔ محمد علی صدیقی کا دامن اس کج روی سے آلودہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے مشرق و مغرب کے فکری نظام کو تاریخی اور سماجی تناظر میں پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ زوال پسند نظریہ ادب کے علمبرداروں کی طرح اپنی روایات اور منطقیت پر مبنی آرا کو قارئین پر مسلط کرنے کے لئے جبر سے کام نہیں لیتے ہیں۔ البتہ انہوں نے تنقید کو خالص فلسفیانہ اور مکینیکل اصطلاحات سے باز رکھنے کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔

ایک اچھے نقاد کی صورت انہوں نے علم پروری کے فرض سے آنکھیں نہیں چرائی ہیں۔ "سیاست کی مابعد الطبیعیات"، "شاعری کی فلسفیانہ اساس"، "یاسیت پسندی اور نطشے"، "ترقی پسندی اور جدیدیت"، "غالب کی جمالیات"، "جمالیاتی اضافیت" اور "ترقی پسندی کی ایک جہت اقبال" سے ابھرتے اور زندہ رہنے والے مباحث ہیں۔ تنقید کا منصب اختلاف برائے اختلاف نہیں بلکہ نفی میں اثبات کے ممکنہ امکانات کی بازیافت ہے اور یہ خوبی ان کی تنقید میں جھلکتی ہے۔ ان کے یہاں خارجی محرکات کے پس منظر میں تخلیقی عمل کی پرکھ کا رجحان غالب ہے۔ نظری اور عملی تنقید کے گوشوں پر قدیم و جدید فلسفہ، تصوف کی روایت، ہندو یونان کے دیومالائی کلچر اور مشرق و مغرب میں رونما ہونے والے شعور کی دھوپ چھاؤں، عینیت، کلاسیکی اور نو کلاسیکی ادوار کا پس منظر بھی بیان ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں وزن کا پھیلاؤ اور وسعت بھی زیادہ ہے۔

محمد علی صدیقی کو جدید یا نو ترقی پسند کہنا یوں بھی ضروری ہے کہ انہوں نے ترقی پسند روایت کے افق کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ تنقید کو خالصتاً علم الاقتصادی کا ضمیمہ ہونے سے بچایا ہے۔ سیاسی شعور کی تعبیر و تشریح کے لئے آلہ کار بننے سے روکا ہے اور اس کے رشتے علم و ادب اور کلچر سے از سر نو قائم کئے ہیں۔ ترقی پسند تنقید نے فنکار کی معصومیت اور اوہام پرستی کے خلاف جہاد کے جوش میں بعض

روحانی تہذیبی اور صحت مند رشتوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا محسوں کو مجبوری کے یہاں نہیں اس رویے کے خلاف احتجاج کا رجحان دکھائی دیتا ہے محمد علی کا رویہ اس معاملے میں زیادہ خیال اور با معنی ہے انہوں نے (اقبال) عقل پسندی اور پھر وجدان (اقبال بھی وجدان کو ذہنی عقل کی انتہا تصور کرتے تھے) کے ذریعہ اپنے مذہب کی ترقی پسندانہ روح کو اس خوبی سے اجاگر کیا کر دری خلائی جلیوسی کائنات والے بزرگوں نے اقبال کے ساتھ کوپرنیکس اور آئن سٹائن کو دیکھ کر بہت ناک بھوں چڑھائیں...... شوپن ہاور تو اسلام کو بھی اس لئے ناپسند کرتا تھا کہ اس میں طبقاتی سسٹم پر زور ہے اور نا امیدی حرام ہے۔ طبقاتی سسٹم اور امید تو ترقی پسندوں کے یہاں بھی محترم ہیں۔

محمد علی صدیقی نے پیش لفظی کا آغاز اس مقام سے کیا ہے جہاں آ کر ترقی پسند تنقید نے پڑاؤ ڈال دیا تھا ترقی پسند نقادوں نے شروع میں حسن کاری، ہیئت اور جمالیاتی وصوری آہنگ کو بھی سر نخوردی بہا دی تھی۔ محمد علی نے کم از کم مارکسی عمرانی اور سائنسی تنقید کی روایت سے استفادہ کرنے کے باوجود فنی محاسن کی معنویت اور فعالیت کی اساس کا احترام کیا ہے۔ جمالیات کے مروجہ نظریات کے زیر اثر جدید جمالیاتی شعور کے امکانات کو فروغ دینے میں بھی ان کی پیش لفظی قابل ذکر ہے آج جو چیز جمالیات کی قدر دانی جاری ہے وہ کل تک ایک کم سمجھا معمول تھی اب وہ سب سے بڑا سوال ہے نہیں تخلیقی شہ پاروں کو جمالیات کے مروجہ اصولوں اور نقاشوں کی بحث میں ایک چیز پر ضرور اصرار کرنا چاہیے اور وہ فنون کو ہم عصری حقیقت سے پرکھنے کی کوشش ہے محمد علی نے ادبی نظریات کی خود ساختہ تعبیرات اور مخاطب نظریات کو ایک منصوبے کے تحت یکجا کرنے کے رجحان کا احتساب کیا ہے اور یہ احتساب ہماری تنقید کا مطالبہ بھی تھا ہمارے یہاں کے چند دانشوروں میں ہائیڈگر کی نظریات کا وہ پہلو زیادہ مقبول ہے جس میں وجود اور ذات کے حوالے سے سہرل کا تتبع کیا گیا ہے اور مقام افسوس ہے کہ یہ سب کچھ ترقی پسندیت کے نام پر ہوا ہے ہائیڈگر کی فکر کو کسی بھی طرح ترقی پسند ثابت کرنا کچھ یوں لگتا ہے جیسے مارکس اور لینن کی پرولتاری آمریت کو جاگیرداری زمانے کا سیاسی نظام قرار دیا جائے۔

ہر عہد عنوانوں اور سوالوں کی فہرست رکھتا ہے یہ سوالات بطون سماج اور ذہنی حوالوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ جدید نقاد پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کا جواب فراہم کرے محمد علی کی تنقید عصری مسائل و سوالات کے جوابات پیش کرتی ہے اور قاری آگہی، حقائق اور انکشافات و تجلیات کی امکانی صحت سے طمانیت حاصل کرتا ہے انہوں نے موضوعات و مسائل اور افکار و نظریات کی ان ساری جزئیات کو سمیٹا ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد والے لسانی اور بین الاقوامی محرکات سے تشکیل پائی تھیں۔ ان کی تنقید کا مطالعہ شاید بعض معاصر دانشوروں میں کم مائیگی اور علم و آگہی سے فاصلوں کے احساس کو ابھارنے کا سبب ہو اور یہی وہ کامیابی ہے جو ان کے تازہ تنقیدی مجموعے "توازن" کی تصنیف کا جواز بھی ثابت ہوگی۔

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

جیسا تاریخ ساز شعر کہنے والے محسن بھوپالی کے شعری مجموعے

منزل

کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

سرورق موجد

ضخامت 128 صفحات۔ قیمت 100 روپے

ایوانِ ادب IV ایف 3/5 اے ناظم آباد کراچی

☆

پروفیسر شباب صفدر کے تازہ شعری مجموعے

"تکلم"

پر ایک نظر

شباب صفدر جدید اُردو شاعری کے آفاق پر بے پناہ تخلیقی امکانات کی بشارت لے کر طلوع ہوا ہے۔ اُس کا زیر نظر دوسرا مجموعہ کلام فکر و احساس کی تازگی اور تخلیقی وفور کی دولتِ نایاب سے مالا مال ہے۔ "واقعتاً" کا لفظ مَیں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ آج کل یار لوگ شاعر بننے سے پہلے ہی اپنے شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ کر لیتے ہیں۔ اس اشاعتی رجحان کے برعکس شباب صفدر ایک فطری شاعر ہے۔ فطرت شاعرانہ اسے مجبورِ نوا رکھتی ہے۔ وہ پاکستان کے ادبی مراکز سے دُور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں بیٹھا ہماری آج کی شاعری کو حُسن و تاثیر کی نت نئی ادائیں سکھانے میں مصروف ہے۔ مَیں ابھی سے اُس کے تیسرے مجموعہ کلام کا منتظر ہوں۔

پروفیسر فتح محمد ملک

نقادِ زیست

ابوالمعانی عصری

محترم ڈاکٹر محمد علی صدیقی میرے مہربان و شفیق دوست ہیں۔ موصوف ایک منجھے ہوئے محقق نقادِ ادب ہیں تاہم میں موصوف کو نقادِ ادب کے ساتھ ساتھ نقادِ زیست بھی تسلیم کرتا ہوں۔ کہ آپ نے تقسیم برصغیر (پاک و ہند) میں ہجرت کی جو صعوبتیں برداشت کیں یقیناً یہ موصوف کی "سائیکی" کا ایک جاندار اور تخلیقی حصہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ہجرت کے سفر کی تکلیفیں اور مصیبتیں ان کے شعور و لاشعور میں کس طرح ضم اور ثبت ہوئیں۔ اس کا احوال امر ایک واضح مراجعت نامے کا متقاضی نظر آتا ہے۔

کسی محقق نقاد، دانشور، صحافی، ادیب و شاعر کے فکر و فن اور شخصیت پر رائے دینے سے پہلے اس کے ماحول و فضا کا گہرا مطالعہ کرنا ہوتا ہے کہ اس کا علم و فن سازگار ماحول و فضا میں زیادہ سے زیادہ ہی ارتقا پذیر ہوتا ہے اور یہ اس کی شخصیت پر بھی موقوف ہوتا ہے کہ جس ماحول و فضا میں اس نے آنکھیں کھولی ہیں جس میں وہ پروان چڑھا ہوتا ہے۔ وہ اس کی فطری اور قدرتی نمو پذیری میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا فطری ذوق و شوق مطالعاتی ہے یا تخلیقی و خلاقانہ۔

اگر ایک محقق و نقاد (فنکار) بذاتِ خود مشاہدے تجربے اور اپنے طرزِ احساس کی بدولت اپنی شخصی و ذاتی خصوصیات کو نمو پذیر رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا متمنی و آرزومند ہے۔ تو وہ اپنے ذوقِ مطالعہ قوتِ مشاہدہ اور تجربے ہی سے اپنے طرزِ احساس کی ذکی ہوتی حسی میں اپنے خیالات و افکار کو کندن بنانے کا سودا اپنے سر میں سما لیتا ہے۔ اِس یہ ایک طرح سے رجحاناتی اعتبار سے "شعور" ہی ثابت ہوتا ہے۔

بظاہر یہ معاملہ ذی علم اور متبحر شخصیتوں کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی وسعت پذیری کی حد تک خاصا انوکھا "دیدہ وری کا متقاضی" اثبات، غور و فکر و تدبر میں سرگرمِ عمل اور ہمہ جہت و ہمہ وقت عقلی و منطقی اور علمی ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ دوسرے رخ سے یا دوسری جہت سے معقولیت ہی سے متعلق و وابستہ ہوتا ہے اور یہی معاملہ ذہنی رسائی میں جاگزیں پاتا ہے جو علمی تحقیق و تجزیہ کو منضبط بنانے میں مدد دیتا ہے۔ فطرت کا یہی اصول انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور اسی قدرتی و فطری قانون کی بدولت علوم و فنون نے ترقی کر کے انسانیت کو گلزارِ ہست و بود میں کامیاب انسان کی طرح زندگی گزارنے کے قابل بنایا ہے۔

میں جہات پر تفصیلی و تنقیدی تبصرہ تو نہیں کروں گا کہ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے افکار و خیالات کو زیرِ بحث لایا جا سکے اور کسی علمی رائے تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھی جا سکے۔

یقیناً یہ مقصود علمی و ادبی بھی ہے اور تہذیبی و ثقافتی بھی کہ ہم جن معاشروں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ان معاشروں کے علاقائی و جغرافیائی معروضی حالات کیا ہیں؟

جہات کے اولین بارہ مضامین کے بارے میں میری رائے یہ ہے

"جہات ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب کے تینتیس مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اس مجموعے کے پہلے بارہ مضامین بہت اہم ہیں۔ جب یہ پوری دیانت داری اور طالبِ علمانہ ذوق و شوق اور لگن سے پڑھے جائیں۔ تاہم ان کی تفسیری و تشریحی صورت بعد میں بھی ایک ایسی سوچ کو منظم کرنے میں مدد دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو ہر دور میں اقدار کی تنظیم میں اہتمامِ فکر اور گیرائی پیدا کرنے میں حصہ ڈالتی ہے۔ یہی سوچ تو انسانی ادراک کو نئی آنکھیں لگاتی ہے اور تہذیب و تاریخ کو متحرک و جاندار بنانے میں مدد دیتی ہے۔"

"یقیناً اس سوچ اور تدبر و فکر کے بغیر نہ کوئی فکری سمجھاؤ سامنے آ سکتا ہے اور نہ ہی عمل کی سرگرمی اور مستعدی۔" (ماخوذ از مکتوب ابوالمعانی عصری بنام ڈاکٹر محمد علی صدیقی ۱۳ اگست ۲۰۰۴ء)

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی جس درجہ اور مقام کے محقق و نقاد ہیں۔ وہ کم از کم پاکستانی دانشوری کی حیثیت سے کسی دوسرے شخص کو نہیں مل سکا۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ موصوف نے جن اہم منصبوں پر فائز ہو کر اداراتی فرائض سر انجام دیے ہیں اور وہاں جو علمی کام سر انجام دیا ہے وہ قابلِ داد بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی۔ اگر کوئی عالم و فاضل شخصیت اپنی ذاتی لیاقت و استعداد سے کام لیتی ہے تو وہ علمی کارنامے ملکی و قومی آرکائیوز (archives) میں یادگار ثابت ہوتے ہیں۔

جن احباب نے ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقیدی و تحقیقی کتب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ میری رائے سے متفق ہوں گے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے اردو ادب کے محققین و نقاد عموماً ادبی تنقید کو تفسیری اور تشریحی انداز سے سامنے لاتے ہیں۔ اور اپنی تنقیدی رائے دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی رائے یا افکار و خیالات بڑے سلجھے ہوئے انداز میں قاری کے ذہن میں اترتے چلے جاتے ہیں اور قاری ان کے علمی کارناموں کو بالاستیعاب پڑھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی معقول وجہ یہ ہے کہ موصوف جزئیات پر پوری توجہ دیتے ہیں۔

جزئیات نگاری ایک توجہ طلب صنف ہے اور اس جہت پر دیانت داری سے کام کرنا خاصا ادق سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال ہمارے سامنے ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کی ہے۔ وہ جہاں ایک جہت کو لیتے ہیں تو اس پر ایسی کڑی رائے دیتے ہیں کہ اس پر مزید رائے زنی کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے اور عموماً ایسی مزید تنقیدی آراء "تنقیدی آراء کا اعادہ" معلوم ہوتی ہیں۔ یقیناً رائے کو مزید واضح اور صاف کرنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے اور کسی رائے یا آراء کو "مجمل آراء" کے زمرے سے باہر رکھنا بھی بڑے محققین کے فرائض میں شامل ہوتا ہے اور یہ

فریضہ تب ہی سر انجام پا سکتا ہے کہ محقق و نقاد اپنی رائے کو حتمی رائے ثابت کرنے پر بُودی ضد سے یا لااستجاب دوسری آراء کا محاکمہ کرنے کے لئے نہایت ژرف نگاہی سے فریضہ سر انجام دے بصورت دیگر ”حتمی آراء“ واضح اور منصفانہ نہیں ہو پاتیں۔ اور تنقیدی آراء کا تصور دُھندلاتا چلا جاتا ہے۔

مجھے ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی چند آراء اس مختصر مضمون میں پیش کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے تاکہ وہ تمام نکات واضح ہو سکیں جن پر ”مزید آراء“ دینے کی گنجائش موجود ہے۔

”نیاز فتح پوری سائنسی قوانین کو فطرت کی عین منشاء سمجھتے تھے۔ وہ انہیں منحرف بہ اسلام کرنے کی بجائے انہیں قوانینِ قدرت کے طور پر تسلیم کیا چاہتے تھے۔ اور یہی وہ ”قدرِ مشترک“ ہے جو سر سید احمد خان، اقبال اور نیاز فتح پوری کو ایک ہی لڑی میں پروتی ہے۔ سر سید احمد خان کی تصنیف خطباتِ الاحمدیہ، اقبال کے خطبات (Reconstruction of Religious thought in Islam) کے دیباچہ اور نیاز فتح پوری کے مضمون ”مذہب کا مستقبل“ مذہب اور سائنس کی پاسداری کے اصول پر قائم ہیں۔ ان تینوں تحریروں میں ایک ہی فکر جاری ہے۔ ان تحریروں میں سائنس کے تپاک بلاوے ”قانونِ فطرت کا لحن“ سمجھا گیا ہے۔ (ماخوذ از جہات از ڈاکٹر محمد علی صدیقی ارتقاء مطبوعات کراچی صفحہ ۵۱)

”اب ہم کرار صاحب کی دانشورانہ حیثیت پر غور کرتے ہیں۔ یورپ کا نظریہ دانشوری سترھویں صدی (عیسوی) سے انیسویں صدی (عیسوی) تک مادّی اور سائنسی رہا۔ اس صدی کی دوسری دہائی میں یعنی ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب اور پھر ۱۹۴۹ء میں چینی انقلاب کی آخری فتح انیسویں صدی (عیسوی) کے فکری (Rhythm) کے تحت ہوئی لیکن انیسویں صدی عیسوی کی آخری دو دہائیوں میں ایک خاموش فکری انقلاب (Newton) نیوٹن کے (Determinism) کے خلاف (Probability, uncertainty quantum gap) کے نظریات کے خلاف جنگ عظیم دوم کے بعد واضح ہونے لگا اور اب سائنسی انکشافات اور دریافتیں روحانی اور ماورائی قوتوں کے لئے ایندھن (Fuel) کا کام دینے لگیں یعنی سائنس پُوجا کے بجائے مُسبّب کے بغیر سبب اور سبب کے بغیر مُسبّب کا زمانہ آیا کہ الیکسی کیرل (Alexi Carel) کاؤنٹ ڈی لوئس (Count De Louis) آئن سٹائن (Ein Stein) ولیم جیمز (William James) پاسا اور میکس پلانک (Max Planck) اور جارج گروچ (Geroge Gurvitch) جیسے دانشور سائنس پُوجا کے زبردست مخالف ہو گئے۔

کرار حسین ان سب حضرات کی مذہب دوستی کے معترف ہیں لیکن وہ ان کی سائنس دشمنی کے خلاف تھے۔ علی شریعتی اپنی کتاب ”مستقبل کی تاریخ پر نظر“ میں مندرجہ بالا مفکرین کی شان میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ جبکہ کرار حسین اپنی تقاریر میں علی شریعتی کے متاثرین کو بڑے سلیقے کے ساتھ یاد دلاتے نظر آتے ہیں کہ انسانی علوم میں اضافہ معرفتِ الٰہی میں اضافے کا موجب ہوتا ہے اس لئے کرار حسین ڈاکٹر علی شریعتی سے بعض معاملات میں متفق نظر آتے ہوئے بھی ان سے مختلف ہیں۔ وہ اقبال کے ساتھ ہیں جنہیں علی شریعتی نے عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مفکر قرار دیا تھا۔ وہ انہیں غزالی سے بھی بڑا مفکر خیال کرتے ہیں۔

(ماخوذ از جہات از ڈاکٹر محمد علی صدیقی ارتقاء مطبوعات کراچی ص ۶۷-۶۸)

تحقیق و تنقید میں کوئی رائے حتمی نہیں ہوتی۔ تنقیدی رائے ہی علم و ادب کو آگے بڑھانے میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ علوم و فنون میں اضافہ اسی تنقیدی شعور و ادراک کی پختگی ہی سے ہوا کرتا ہے اور جب تک تنقید زندہ ہے علم و فنون میں ترقی اور اضافہ جاری و ساری رہے گا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی اپنے ایک مضمون بعنوان ”سبطِ حسن مشرقی یورپ اور عالمی تناظر میں“ ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

”سبطِ حسن نے ہیگل کے فلسفہ کی جدلیات اور اینگلز کی تاریخی مادیت اور مادّی جدلیات کے اصولوں اور انگلستان کی معاشیات سے زائد قدر یا قیمت کے اصولوں کو اپنی فکر کا ”بنیادی پتھر“ قرار دیا۔ سبطِ حسن کی نظر میں کارل مارکس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے فلسفہ کو سائنٹفک اصولوں پر مدون کیا اور اسے ایک خیالی معمہ کی جگہ ایک منظم اور عملی تحریک اور ضابطۂ حیات کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا اور دنیا میں ہونے والی مادّی تبدیلیوں کے اصول بیان کئے۔ لینن نے روس کی انقلابی تحریک کی رہنمائی کے دوران مارکس کے بنیادی فلسفہ پر اپنی فکر کو واضح شکل دی۔

(ماخوذ از جہات از ڈاکٹر محمد علی صدیقی ارتقاء مطبوعات کراچی صفحہ ۷۲)

سبطِ حسن کا قلم پیشۂ فن اور انسانیت کی خدمت کے لئے رواں دواں رہا۔ کسی نے اسے تسلیم کیا یا کسی نے ان سے مخالفت کی۔ وہ اپنی لگن میں مگن رہے۔ ذی علم اور متبحر ہونے کی وجہ سے وہ افکار و تفکرات کی دنیا میں زندہ رہیں گے۔ یقیناً یہ بھی بڑی بات ہے اور بڑے پن کا المیہ۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی اپنے مضمون بعنوان ”آغا سہیل: زندگی اور وقت کا محاکمہ“ میں اپنی رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

”آغا سہیل ’جدیدیت‘ کو ایک اُسلوبِ نگارش کے بجائے ایک ”نقطۂ نظر“ سمجھتے ہیں اور ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ جنہوں نے ”جدیدیت“ کی درست توضیح و تشریح کی ہے اور یوں انہوں نے جدیدیت کو محض ہیئت اور لایعنی زبان کا چیستان ہونے سے بچانا چاہا۔ اُن کے جدید افسانوں میں ”سرپھل“، ”شگافِ در“ اور ”دنیا مجھ میں“ واحد متکلم کا صیغہ بہت مختلف انداز میں استعمال ہوا ہے۔ آغا سہیل نے بعض افسانے ”واضح مقصدیت“ کے رجحان کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی اپنے عہدِ جوانی کی روایت کے تابع نظر آتے

ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان آغا سہیل پختہ عمر کے آغا سہیل پر جذباتی طور پر تا ابد حاوی ہے۔ غالباً یہی وہ "زندگی کی تڑپ اور ترنگ" ہے۔ جو آغا سہیل کے کسی افسانے میں بھی معذرت خواہ نہیں ہے۔ وہ عمر کے ہر حصے میں شباب کی سرمستیوں سے زندگی کی تڑپ کشید کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آغا سہیل کے یہاں دور دور تک مریضانہ روش (Morbidity) نظر نہیں آتی، نتیجہ یہ ہے کہ مریضانہ روش کے اشیاء قارئین اور نقاد ان کی ترقی پسندی، رومان پسندی اور جدیدیت سب ہی پر حیران ہوتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مرض پسندی فن نہیں ہے۔ بلکہ فن کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک خطرہ ہے۔ جو شاید اور شعور کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے جسے نئے بھی فنکار کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن فن بدترین خواہشات سے آگہی کے بجائے بدترین خواہشات کے عکس پر تحت غیر انسانی جذبات کی تشریح کا کام کرتا ہے۔ تا کہ قارئین کے یہاں شعوری سطح پر صحت مند انسانی جذبات و ردِعمل کے لئے گنجائش پیدا کی جا سکیں اور یہی تقاضا زندگی فروز قوتوں کے ساتھ ہمدردی اور اشتراک کی ایک صورت ہے۔

(ماخوذ از جہات از ڈاکٹر محمد علی صدیقی ادارۂ مطبوعات کراچی صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸)

بظاہر یہ ایک طویل اقتباس نقل کیا گیا ہے لیکن اس کی جامعیت پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک ایسا فنکار اور دانشور جو زندگی کو تہذیبی نقطۂ نظر سے دیکھتا چلا آ رہا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا معتدبہ حصہ جو کم و بیش چالیس سال کے عرصے پر محیط ہے اور وہ قلم کی مدد سے زندگی کی چھوٹی، گوشوں اور صورتوں کو سامنے بھی لانے کی کوشش کرتا ہے اور اسے زندگی کی ان تلخ حقیقتوں سے بھی روشناس کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جب کوئی قلم کار اپنی سائیکی میں قدرتی و فطری سلیم الطبعی بطور ایک خصوصیت اجاگر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ زندگی اور وقت کا ترجمان بن جاتا ہے۔

عموماً تمام اہلِ علم و دانش ان فطری جذبۂ ہمدردی سے شناسا ہوتے ہیں لیکن وہ انسانی زندگی کی تخریبی قوتوں کو لطیف جذبوں میں بڑھ چڑھ کر کے انسانی خون میں یا دل و دماغ میں جگہ بنانے پر آمادہ کرتے ہوئے زمانے کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کے فن میں مستعد و سرگرم رہتا ہے۔ وہ فنکار ہی رہتا ہے اور وہ ہر وقت جوان جذبوں کا فنکار رہتا ہے۔ یہ عمل فن کو لازوال بناتا ہے۔ یوں تو ڈاکٹر محمد علی صدیقی محقق، نقاد اور دانشور کے طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن وہ اصل میں ہمدردِ انسانیت کے طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جہاں وہ علم پرور اور علم دوست واقع ہوئے ہیں۔ وہاں اتنے ہی کھلے ذہن اور کشادہ ظرف کے مالک واقع ہوئے ہیں۔ وہ علوم و فنون کا ایک انسائیکلو پیڈیا واقع ہوئے ہیں۔ اُن کی علمی جہتیں کئی دوسری سطحی جہتوں کے انسانی رویوں سے عبارت نظر آتی ہیں۔ اُن کے علم و فن کی حیثیت بین الاقوامی حیثیت سے بھی تسلیم شدہ ہے کہ وہ اپنے ملک و قوم کے حقیقی محافظ اور سفیر واقع ہوئے ہیں اور خصوصاً جنوبی ایشیا کے پسماندہ اور نیم ترقی یافتہ ممالک کے علمی نمائندے ہیں۔

☆

ایش ٹرے

میں ہوں اور سگرٹ ہے میرے ہاتھ میں
میز پر رکھا ہوا ہے بے زبان، بے جان سا اک ایش ٹرے
ہم میں قدرِ مشترک
دل اور اس میں اک دھڑکتا درد تھا
میں نے سگرٹ کی طرح
چُپ چاپ سارا پی لیا
اُس کے سہارے چند لمحے جی لیا
رات کا پچھلا پہر ہے
اس سے دو چار نظمیں ہوں جو شاید
ایش ٹرے سے دوستی کے موڈ میں
کچھ بھی کہنا چاہیں اب بے کار ہے!
اُس نے پھر سگرٹ جلا کر
درد کی دُھونی رما کر
ہاتھ میں لے کر قلم نظموں کے بارے کہہ دیا
ہائے آخر امرتا پریتم کے ساتھ امروز جی!
ایش ٹرے کی راکھ مرگھٹ میں ہی جل بُجھ جائیں گی
میں نہیں ہوں گی تو یہ بھی پھر کسے یاد آئیں گی!!

(مرکزی خیال امرتا پریتم کی پنجابی نظم "بنیتر ما" سے ماخوذ)

(یونس صابر)

☆

صاحبِ علم تنقید نگار

پروفیسر قیصر نجفی

اہلِ علم اس رائے سے متفق ہیں کہ "مقدمہ شعر و شاعری" کو اردو تنقید میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو فلسفۂ تاریخ میں علامہ ابنِ خلدون کو حاصل ہے۔ چنانچہ دونوں مقدمے اپنے اپنے علمی پس منظر اور مخصوص موضوع کے تناظر میں خاصے اہم ہیں۔ ابنِ خلدون نے اپنے مقدمے میں تاریخ کے اساسی فلسفے کی تعبیر کی ہے اور تاریخ کے مطالبوں اور تقاضوں کو اجاگر کیا ہے جبکہ مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں تنقید کی اصل روح سے روشناس کرایا ہے اور تنقید کے باقاعدہ اصول مرتب کر کے اردو ادب کی ایک ایسی احتیاج پوری کی ہے جس کے بغیر اردو ادب نامکمل تھا۔ حالی ایک عرصے تک سرکاری بک ڈپو لاہور میں ترجمہ شدہ کتابوں کی اصلاحِ زبان پر مامور رہے۔ انگریزی ادب کے مطالعے نے ان کے ادبی عقائد کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اس تاثر کو سر سید احمد خان کی جدت افزا اور خرد افروز اصلاحی تحریک نے دو چند کر دیا اور انہوں نے آزاد کے ساتھ مل کر نہ صرف جدید اردو شاعری کی خشتِ اوّل رکھی بلکہ پہلی بار کسی ادبی ضابطے کے تحت اردو تنقید کی تہذیب بھی کی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ سوانح نگاری کے مرتب کردہ حالی کے اصولوں میں بعض صاحبانِ علم نے اختلاف کی گنجائش نکالی ہے مگر ان کے تنقیدی اصولوں پر سب نے صاد کیا ہے۔ حالی نے "ادب برائے زندگی" کے نظریے کو فروغ دیا اور اپنی تنقید کی اساس بھی اسی نظریے پر رکھی۔ ہر چند سر سید اور حالی ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بہت پہلے دنیا سے اٹھ گئے تھے مگر ہم ترقی پسند ادب کو (جس میں نعرہ بازی نہ ہو) انہی کی حیات افروز علمی و ادبی کاوشوں کی ایک صورت سمجھتے ہیں۔

سر سید کے زیرِ اثر حالی کی مشرق پسندی میں بھی مغرب کی روح کارفرما تھی۔ اس روح کی موجودگی کا احساس ان کی نظم گوئی اور تنقید نگاری میں نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ حالی کی موضوعاتی نظموں کی طرح ان کے تنقیدی اسلوب کی بھی متعدد قلم کاروں نے تقلید کی ہے۔ البتہ بعض نے اپنے وسیع علم خصوصاً مغربی ادب کے گہرے مطالعے اور جدید ادبی نظریات کے مباحث کی روشنی میں اسے آگے بڑھایا ہے۔ ایسے صاحبِ علم تنقید نگاروں میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی بھی شامل ہیں جن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "جہات" ہمارے پیشِ نظر ہے۔

"جہات" ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے تنقیدی مضامین کا پانچواں مجموعہ ہے جو حال ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ہم نے ایسی کتابیں خال خال دیکھی ہیں جو اسمِ بامسمّیٰ ہوتی ہیں۔ "جہات" ایسی ہی مستثنیات (Exeptions) میں سے ایک ہے۔ "جہات" عربی زبان کا لفظ ہے اور جہت کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں سمتیں، اطراف وغیرہ۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے "جہات" میں جو اسلوبِ بیان اپنایا ہے وہ نہ صرف ان کی بے پایاں علمیت کا غماز ہے بلکہ ان علوم کی نشاندہی بھی کرتا ہے جن پر انھیں عبور حاصل ہے۔ اگر ہم ڈاکٹر صاحب کے تبحرِ علمی کی کوئی Geometrical image وضع کریں تو ہمارے ذہن میں ایک ایسے دائرے کی شکل ابھرتی ہے جو بیشتر جدید و قدیم علوم پر محیط ہے اور جس کی ہر قوس کسی نہ کسی علم کی سمت نمائی کرتی ہے۔ شاید یہی وہ حقیقت ہے جس کی کوکھ سے "جہات" نے جنم لے کر خود کو اسمِ بامسمّیٰ بنایا ہے۔ اگر ہم نہایت اختصار سے بھی کام لیں تو یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "جہات" ادب، مذہب، فلسفہ، سیاست، معیشت، سماجیات، نفسیات اور سائنس کے علاوہ دیگر متعدد علوم پر بھی صدیقی صاحب کی گہری نگاہ کے ثبوت فراہم کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کم و بیش چودہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں دو انگریزی کی ہیں۔ یہ کتابیں بنیادی طور پر ادب، تنقید، پاکستانیات، شخصیت نگاری، صحافت اور ترجمے سے متعلق ہیں۔ البتہ تنقید پر ان کی پانچ کتابیں ہیں جو توازن، نشانات، مضامین، اشاریے اور جہات کے ناموں سے یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آئی ہیں۔ "توازن" ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہی نہیں ہے، ان کی اوّلین تصنیف بھی ہے جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی اور جسے "پاکستان رائٹرز گلڈ" نے انعام سے نوازا تھا۔ یہی کتاب تھی جس پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کو سب سے پہلے ایک نقاد کے طور پر Recognize کیا گیا۔ آج وہ اپنی روشن خیالی، انشا پردازی، ذہانت، اصابتِ رائے اور متوازن فکر کی بدولت ایک دانشور تسلیم ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی متنوع جہات ہیں، جن کی طرف "جہات" میں انہوں نے پوری توانائی سے رجوع کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنی روایت کو قائم رکھتے ہوئے "جہات" کے پہلے حصے میں چند نظریاتی مضامین شامل کیے ہیں۔ بعد ازاں انہوں نے بعض جدید ادیبوں اور شاعروں کے کام پر اپنی آرا کی ایک معتبر فکری و فنی زنجیر بنائی ہے جو قاری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں جکڑ لیتی ہے۔ "جہات" کے پہلے ہی صفحے سے دل و دماغ پر یہ تاثر مرتسم ہو جاتا ہے کہ مصنف نکھری فکر، نئے شعور اور نئے احساس کے ساتھ جلوہ گر ہے اور ایسی فرسودہ اور دقیانوسی تدریسی یا محض بیانیہ تنقید سے گریزاں ہے جو کسی زمانہ عمومی تنقیدی شعار ہے۔ "جہات" میں "حرفِ چند" کے عنوان سے ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعوں کا درج ذیل الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔ حیرت ہے کہ انہوں نے تحقیق و تنقیدی دانش کی آئینہ دار اپنی تین اہم کتابوں "سر سید احمد خان اور جدت پسندی"، "نشانِ اقبال" اور "غالب اور آج کا شعور" کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یاد رہے کہ صدیقی صاحب کی بحیثیت "ڈاکٹر آف لٹریچر" سرفرازی میں ان کتابوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

"توازن" (۱۹۷۶ء) میں نئی شاعری کے حوالے سے کچھ مضامین تھے۔ "نشانات" میں لسانیاتی حصے کے ذیل میں جدید لسانیاتی مباحث پر ۸۲-۱۸۱ صفحات پر مشتمل خصوصی گوشہ تھا جس میں اسٹرکچرل ازم اور چومسکی کے لسانیاتی نظریے جیسے مضامین شامل تھے اور ان تمام لسانیاتی مفکروں کے افکار پر بحث کی گئی تھی جو "نشانات" (۱۹۸۱ء) کی اشاعت کے بعد زیرِ بحث چلے آ رہے تھے..... "مضامین" (۱۹۹۱ء) میں اس وقت تک کی عالمی سیاست کے بعض پہلوؤں سے ہمارے ادب پر پڑنے والے اثرات سے متعلق

باقی حصہ اگلے شمارے میں ملاحظہ کیجیے

مضامین شامل تھے۔ "اشاریے" (۱۹۹۵ء) ماہنامہ افکار میں شائع شدہ اداریوں پر مشتمل مجموعہ تھا جو ادارے مکتبۂ افکار ہی نے شائع کیا تھا۔ زیرِ نظر مجموعہ "جہات" میں آپ جدید اردو ادب کے متعدد ادیبوں کے کام پر میری آراء پڑھیں گے۔ ان تحریروں میں (Post-modernism) مابعد جدیدیت کے تحت ردِ تشکیل (Deconstruction) اور متعلقہ مسائل پر مضامین بھی ہیں۔"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی اردو ادب کے جدید و قدیم رجحانات سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مغربی ادب کی تاریخ، ارتقاء اور عصری کردار کا عرفان بھی رکھتے ہیں۔ لیکن دیگر حقیقت پسند دانشوروں کی طرح نئی زبان و ادب کے لایعنی مباحث سے الجھنے اور ادب میں تیسری دنیا کی دریوزہ گری پر ملول نظر آتے ہیں۔ بظاہر یہ بات ایک المیے سے کم نہیں ہے کہ ہمارے ہاں آئے دن مغربی ادب کے پرانے اور مسترد شدہ نظریات درآمد ہوتے ہیں۔ جس کی مثال ان پرانے کپڑوں سے دی جا سکتی ہے جو اصل میں اہلِ مغرب کی اترن ہوتے ہیں اور رنگ، ناردپود اور وضع کے حوالے سے گھٹیا ہونے کے علاوہ کوئی چیز دامن میں نہیں رکھتے۔ بعینہٖ اسی طرح وہ افکار و نظریات جو مغرب میں قصۂ پارینہ بن کر اپنی اہمیت و افادیت کھو چکے ہیں، ان کا ہمارے ہاں اس انداز سے احیاء ہوتا ہے کہ ہم ان کے ثمرات سے تو بہرہ ور نہیں ہو پاتے البتہ ان پر لایعنی بحثیں چھیڑ کر ذہنی صلاحیتوں کا زیاں اور وقت کے ضیاع کا سامان کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اس گمبھیر صورت حال کا بجا طور پر نوٹس لیا ہے۔ "جہات" میں ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تیسری دنیا کے لنڈا بازاروں میں ترقی یافتہ دنیا کے پرانے کپڑے ہی نہیں بکتے، پرانے اور مسترد شدہ ادبی مباحث بھی درآمد کر لئے جاتے ہیں۔"

ان کا یہ جملہ Quostable ہے۔ اس میں جو بات کہی گئی ہے اس میں ایک آفاقی سچ مضمر ہے۔ تاہم ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی روشن خیالی، خرد افروزی اور معتدل و متوازن فکر انہیں ان قدامت پسندوں سے یکسر علیحدہ رکھتی ہے جو مغرب کی ہر چیز کو شجرِ ممنوعہ تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مغرب سے اخذ و اکتساب کے ہرگز مخالف نہیں ہیں۔ البتہ انہیں یہ بات ہرگز پسند نہیں ہے کہ ہم لکیر کے فقیر بن کر رہ جائیں اور خیال و فکر کی بالیدگی کے راستے بند کر دیں۔ اس حقیقت کے وہ بھی معترف ہیں کہ مغرب، جہاں خواندگی (Literacy) کی شرح صد فیصد ہے، ہم مسابقت کی دوڑ میں اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ بلکہ دو ٹوک بات تو یہ ہے کہ قارئین کے معیار تک پہنچنے کے لئے ہمیں ابھی صدیاں درکار ہیں اور صدیوں کا فاصلہ ہم خراماں خراماں نہیں بلکہ سرپٹ دوڑ کر ہی طے کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا ہے جو یقیناً برمحل ہے۔ کچھ عرصہ قبل آئی ٹی Information technology کے ایک شعبے سے وابستہ ایک صاحب جنوبی کوریا گئے۔ جب وہ اپنے میزبان سے ملنے اس کے دفتر پہنچے تو انہیں جا بجا ایسے بینرز (Banners) نظر آئے جن پر ایک ہی نعرہ "Don't walk-Run" درج تھا۔ موصوف نہ تو اس نعرے کا مفہوم سمجھ سکے اور نہ ہی اس کی اہمیت و افادیت ان کی سمجھ میں آئی۔ استفسار پر میزبان نے بتایا، ہمارا تعلق ایک ترقی پذیر ملک سے ہے جبکہ مقابلہ ترقی یافتہ ممالک سے ہے جو ہم سے صدیوں آگے نکل چکے ہیں۔ ظاہر ہے ہم ان تک پیدل چل کر نہیں پہنچ سکتے۔ انہیں پکڑنے کے لئے ہمیں دوڑنا ہوگا۔ ہمارے یہاں ہم نے قومی سطح پر یہ نعرہ بلند کیا ہے "Don't walk - Run"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی ہمہ جہت حیات کے مالک ایک قلم کار ہیں۔ وہ وطنِ عزیز میں ادب اور جمہوریت کی زبوں حالی سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس زبوں حالی پر ان کی فکرمندی نے اب تشویش ناک صورت اختیار کر لی ہے کیونکہ ادب اور جمہوریت پر ریموٹ کنٹرول سے جو حملے ہونے لگے ہیں وہ انتہائی خطرناک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی متجسس نگاہوں نے ان تمام خطرات کو کمیت و کیفیت ہر دو اعتبار سے بھانپ لیا ہے۔ انہوں نے ان خطرات کے حوالے سے اپنے مضمون "ادب اور جمہوریت" میں جن دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی حب الوطنی پر سند ہیں۔

"ہم ان دنوں ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں، جس میں ایک طرف تو ہمیں ادب کو خطرہ ہے، دوسری طرف صحیح جمہوری کلچر کے فروغ میں حائل فیوڈل نظام کا گھناؤنا کردار ہے اور تیسری طرف بین الاقوامی مالیاتی نظام کے فوق الفطری (super natural) کارپوریٹ سرمائے کی مطلق العنانیت کے مسائل درپیش ہیں.... یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو ہمارے ملک کی تمام زبانوں کے ادیبوں سے خصوصی توجہ چاہتی ہے۔"

اسی نوع کی ایک اپیل دنیا بھر کے ادیبوں سے جولائی ۲۰۰۳ء کی پیرس کانفرنس میں بھی کی گئی تھی، جس کا ایک اقتباس ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے مضمون میں درج کیا ہے، چونکہ وہ ایک ماجرائی سماجی ہیں اور ملکی و معاشرتی بیماریوں کی تشخیص و علاج دونوں میں مہارت رکھتے ہیں لہٰذا بعد از تشخیص درج ذیل اقتباس کی صورت میں انہوں نے ہمارے مرض کا شافی علاج بھی تجویز کر دیا ہے۔

"فی الحال قلم موت کے خلاف زندگی کی ہم نوائی کیجیے۔ ہمارا قلم ہمارا علم ان طاقتوں کے خلاف مدد کے لئے بنا ہے جو موت کو دعوت دیتی ہیں، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں، جو روپے پیسے کے بل پر حکومت کرتی ہیں، جو کارخانہ داروں اور زرپرستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو مظلوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی نگاہ دوررس، ذہن رسا اور مزاج ادب میں گندھا ہوا ہے۔ خاص کر ان کی تحقیقی و تنقیدی استعداد قابلِ رشک ہے۔ انہوں نے "جہات" میں متعدد ادبا و شعرا کی تخلیقی صلاحیتوں کا ان کے فکر و فن کے آئینے میں عکس دکھایا ہے مگر ایک ایسے مشاق عکاس کی طرح جو خارج و باطن کو بیک وقت فوکس (Focus) کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمارے لئے ان کے ادبی شعور کے تعمق کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ وہ حیرت انگیز طور پر اردو کی تمام تر اصنافِ ادب کی حقیقی روح کو سمجھتے ہیں۔ افسانہ ہو، ناول ہو، ڈرامہ ہو یا سفرنامہ..... غزل ہو، نظم ہو (پابند، آزاد، نثری) یا مرثیہ انہیں ہر صنفِ ادب کی تاریخ، ارتقاء، عصری کردار اور فکری و فنی رجحانات سے کماحقہ آگہی

نصیب ہے ہمارے خیال میں ان کا میلان محض تخلیقی تنقید کی طرف زیادہ ہے وہ کسی ادب پارے کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دوسرا ادب پارہ تخلیق کر لیتے ہیں۔ ان کی انکشافات شخصیت سے بہتر ہوا کرے ہیں سے واضح ہوتا ہے ان کی معلومات کا ذخیرہ بے حد وسیع ہے۔ بات وہ ادب پر کر رہے ہوتے ہیں لیکن بیک وقت فلسفہ و منطق، علم و حکمت، تاریخ و تہذیب، سائنس و مذہب، سیاست و معیشت، اخلاقیات و نفسیات جانے کتنے علوم کے ان گنت نکات سامنے آ جاتے ہیں۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ کفایت الفاظ میں یقین رکھتے ہیں۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن انھیں خوب آتا ہے اپنے مضمون "نیاز فتح پوری اور خرد افروزی" میں انھوں نے نیاز صاحب کی اسلوبیاتی جہات کا چند جملوں میں جس حسن و خوبی سے احاطہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے

"ایک طرف وہ رومانی اسلوب نگارش کے رسیا تھے جو آزاد و شرر اور عبدالحلیم شرر کے اثرات کا مظہر تھا اور دوسری طرف وہ سائنس، ٹیکنالوجی اور عقل و خرد کے وکیل تھے جو سرسید احمد خان کی تحریک کا ثمر و امتیاز تھا" اسی طرح نیاز فتح پوری کی روشن خیالی کا پس منظر بھی انھوں نے اختصار و جامعیت سے بیان کیا ہے

"نیاز فتح پوری اردو ادب کی ان شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے اردو میں روشن خیالی کی تحریک کو اپنے جریدہ "نگار" کے ذریعے تیز تر کیا۔ ہر چند ان کا آغاز اردو کی رومانی تحریک کے ادب کی حیثیت سے کیا جاتا ہے لیکن میں انھیں اس تحریک کا علم بردار تصور کرتا ہوں جو غالب اور سرسید سے ہوتی ہوئی ترقی پسند تحریک تک ایک مسلسل تحریک جو جاری ہوتی محسوس ہوتی ہے"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا شخصیت نگاری میں پایہ بھی بہت بلند ہے۔ کبھی کبھی وہ ایک جملے میں پوری شخصیت کو اس کے تمام علمی، فکری اور تہذیبی تشخص کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ پروفیسر کرار حسین کو جو لوگ جانتے ہیں، وہ ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کی داد دیئے بغیر نہیں رہیں گے۔

"یہ واضح بات ہے کہ ان کی باتوں میں قبولیت و انجذاب کی اس قدر قدرت تھی کہ ان کی صحبت تعلیم و تعلم ہی کی ایک شکل تھی۔"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے شخصیت نگاری کی ذیل میں لکھے گئے بیشتر مضامین میں منتخب شخصیات کی ذات و شخصیت سے زیادہ ان کے علمی و ادبی کردار یا سیاسی افکار و نظریات یا ادبی اہمیت کے کارناموں کی تشریح و تفسیر پر ارتکاز فکر کیا ہے لیکن انھوں نے ان میں سے کسی کے بھی نظریات کی اصابت ثابت کرنے یا ان کا ابطال کرنے کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا ہے۔ ان کا اسلوب نگارش استدلالی ہے جس سے تشکیل پاتا ہے۔ وہ معروضات کی سائنسی توجیہ، تحقیق و توجیہ جو زائیدہ حقائق ہو، سامنے لاتے ہیں اور حتی الامکان اپنی کوئی رائے مسلط کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ فکری و نظری دانش اور فلسفیانہ تفکر کی تشریح و تعبیر کے حوالے سے معروف فلسفی و دانشور سید سبط حسن پر ان کا مضمون ایک عمدہ مثال ہے

ہمارے نزدیک ڈاکٹر محمد علی صدیقی ایک صاحب طرز نثار ہیں۔ منطقی طور پر ناقابل تردید طرز و لب و لہجہ میں گفتگو کا اسٹائل انہی سے مخصوص ہے۔ اس پر مستزاد ان کی جرأت اظہار و بیان ہے جو ان کے اور دیگر قلم کاروں کے درمیان ایک حد فاصل ہے مولانا جمال الدین افغانی کے پین اسلام ازم (Pan-Islamism) کی تحریک میں کردار سے آج بھی مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد متاثر ہے۔ علامہ اقبال جیسا مفکر بھی ان کا رطب اللسان تھا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے مولانا کے سیاسی افکار و خیالات خصوصاً ان کی سیاسی ترجیحات کو محل نظر ٹھہرایا ہے اور ان کے سیاسی مقاصد کے بارے میں اپنے ذہنی تحفظات کا برملا اظہار کر دیا ہے۔ ہماری نظروں میں ڈاکٹر صاحب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ چیزوں کو ویسے نہیں دیکھتے جیسی وہ دکھنا چاہتی ہیں، ویسے دیکھتے ہیں جیسی وہ ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل ان کے جیتے جاگتے لمحوں میں رچے ہیں۔ انھیں قدرت نے تاریخ اور فلسفہ تاریخ کا بے پناہ شعور ودیعت کیا ہے جس کی یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ انھوں نے جمال الدین افغانی کی سیاست میں کم مائیگی اور سرسید احمد خان کی ذہنی پختگی کے خلاف سوچ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کیا ہے

اگر ہم "جہات" کے مشمولات پر اپنی گفتگو کو sum up کرنا چاہیں تو ہمارے خیالات درج ذیل نکات پر منتج ہوں گے

☆ جدید ادبی نظریات کے حوالے سے مغائرت و اجنبیت کا احساس ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے منفرد اسلوب بیان سے اس میں مؤانست کا رنگ بھرا ہے اور ہر نظریے کی تفہیم ممکن بنا دی ہے

☆ "جہات" میں شامل نظریاتی مضامین میں سے فکری تصورات کے پس منظر کو ابھار کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ان عوامل و محرکات کو اجمالاً زیر بحث لایا گیا ہے جن کے نتیجے میں وہ سامنے آئے ہیں۔

☆ علمی، ادبی، فکری، فنی، نظری، تحریری غرض نوع بنوع کی مروج مغربی اصطلاحات کو ان کے سیاق میں استعمال کرنے پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کو خصوصی مہارت حاصل ہے۔ ہر چند ان کے ہاں بھی حوالوں کا بکثرت استعمال ہوا ہے، مگر انھوں نے اپنی تحریروں کو حوالوں کا چیستان نہیں بننے دیا ہے

☆ ان کا تنقیدی شعور ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی تہہ میں متنوع علوم کے رنگا رنگ موتی جگمگ جگمگ کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

☆ ان کی علمی استعداد پر کسی مخصوص علم کی تحدید نہیں لگائی جا سکتی۔

☆ ان کی اکثر یا تمام تحریریں سوشلزم کی فکر و فلسفہ کے گرد گھومتی ہیں۔ مگر انھوں نے کہیں بھی نظریاتی انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے

☆ ان کی آرا و تجزیات اور طرز بیان عالمانہ ہے

☆ ان کی نگارشات کا خمیر حقیقت نگاری کی زمین سے اٹھا ہے

☆ اردو انگریزی دونوں ادب اپنے اپنے پس منظر و پیش منظر سمیت ان کی مکمل گرفت میں ہیں۔

☆ ان کے بطون ذات ایک قلم کار کے پہلو بہ پہلو ایک مصلح بھی براجمان ہے جو کسی بھی نوع کی فکری درماندگی کا متحمل نہیں ہے اور اصلاح احوال کے لیے کوشاں ہے

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا ادبی جہاد

جاوید منظر

ادب، انسانی فطرت اور نئے عالمی نظام کا اگر بغور مطالعہ کرنا ہو اور مغربی ادب کے ساتھ مشرقی فلسفۂ حیات اور تیسری دنیا کے فکری اور اقتصادی نظام کو دیکھنا ہو تو ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تخلیقات کو پڑھنا ضروری ہوگا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی دورِ حاضر کے اُن چند لکھنے والے دانشوروں میں شامل ہیں جنھوں نے نئے عالمی نظام کو انسانی ضروریات کے تناظر میں پرکھا اور اپنی تحریروں کی زینت بنایا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی غیر منقسم ہندوستان کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے آپ کی چودہ تصانیف اب تک منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں چار کا تعلق پاکستانیت سے ہے اور ان چار میں دو کتابیں انگریزی زبان میں تحریر کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی ۱۴ تصانیف میں سے مضامین کی کتابوں کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ توازن ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی جس میں نئی شاعری کے حوالے سے کچھ مضامین ہیں۔ کتاب نشانات ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ایک اور کتاب مضامین ۱۹۹۱ء کی اشاعت ہے جس میں عالمی تناظر کے حوالے سے ادب پر پڑنے والے اثرات سے متعلق مضامین ہیں۔ "اشارے" کے عنوان سے جو مضامین ہیں وہ ۱۹۹۵ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب صہبا لکھنوی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی ماہنامہ "افکار" میں شائع ہونے والے محمد علی صدیقی کے اداریوں پر مشتمل کتاب ہے۔

۲۰۰۹ء میں شائع ہونے والی کتابیں "سرسید احمد خان اور جدت پسندی"، "تلاشِ اقبال" اور "غالب اور آج کا شعور" اور "جہات" کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ جن چار ابواب پر مشتمل ہے وہ اپنی جگہ منفرد بھی ہیں اور اہم بھی۔ پہلے حصے میں ہمارے دور کے معروف نقاد حضرات پر مضامین ہیں جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مثلاً مولانا جلال الدین افغانی، نیاز فتح پوری، پروفیسر کرار حسین، سبطِ حسن، احتشام حسین اور ضمیر نیازی شامل ہیں۔ اسی پہلے باب میں کچھ مضامین ہیں جو دورِ حاضر کے فکری رویوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں یعنی مابعد جدیدیت، اور نیا عالمی نظام، مارکس اور موجودہ عالمی بحران ایک تجزیہ، ادب اور عصری تقاضے، ادب اور جمہوریت، جدیدیت اور بیت کا ویڈیو گیم، سائنسی رویہ اور جدیدیت کے کوکلاء۔

دوسرا باب فکشن پر مشتمل ہے جس میں چھ اہلِ قلم یعنی عصمت چغتائی، مستنصر حسین تارڑ، اقبال مجید، آغا سہیل، زتن سنگھ اور کمال مصطفےٰ کے قلمی اور فکری رویوں پر مشتمل تحریریں ہیں۔ جبکہ تیسرے باب میں شاعری کے حوالے سے ۱۲ شعرا پر مضامین ہیں جن میں میرا جی سے لے کر پروین شاکر تک شامل ہیں۔ اس کتاب کا چوتھا اور آخری باب مصوری کے حوالے سے ہے۔ جن میں پاکستانی مصوروں کی یگانہ روی کے مطابق بھی تحریر ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے جہات کے اس چوتھے باب میں مغربی حوالوں کا ذکر کیا ہے اور پھر پاکستانی مصوروں کے کام "فکر، شوق" کا حوالہ دیتے ہوئے یوں اظہارِ خیال کیا ہے کہ "ہمارے بیشتر آرٹسٹ، حقیقت پسندی میں طاق ہوئے بغیر مصوری کے ہر مکتبۂ فکر کے مندروں میں اپنا نام لکھوانے کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ اسے غیر ضروری اور لایعنی بھی خیال نہیں کرتے۔"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی اپنے اسی مضمون میں آگے رقم طراز ہیں کہ "مصوری کے میدان میں اگرچہ سینکڑوں حضرات اپنے فن کا لوہا منوانے کی کوشش میں مصروف ہیں لیکن صرف چند ہی صاحبِ اسلوب فنکار بن سکے ہیں۔ ہمارے بیشتر مصوروں کو رنگ، خط اور سطح کو اپنے پیش کردہ حقائق کے عین مطابق بنانے کے لئے کافی سخت محنت کرنا پڑے گی۔"

جیسا کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے کتاب "جہات" کے پہلے باب میں دورِ حاضر کی ایک بہت ہی اہم شخصیت پروفیسر کرار حسین ایک نادرِ روزگار شخصیت کے عنوان سے سات صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ یوں تو کتاب کے تمام مضامین اہم ہیں مگر اس مضمون نے تو ایک مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پروفیسر کرار حسین کی شخصیت اہلِ علم و دانش میں ایک بہت ہی اہم مقام کی حامل شخصیت رہی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے پروفیسر کرار حسین کی تمیں سالہ نیازمندی کے حوالے سے یوں فرمایا ہے کہ "جب میں نے اپنا پہلا مجموعۂ مضامین "توازن" کے نام سے اُن کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے فرمایا "دیکھو! اگر تحریر میں توازن نہ ہو تو پھر تحریریں "زندیقی" ہو جایا کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں نقادِ سیاہ اور سفید کے خانوں میں بٹ کر

منفرد نقاد

محمود احمد قاضی

صدیقی صاحب کا نام اور کام واقعی اتنا خاص اور وقیع ہے کہ ان کی خدمات کا اعتراف بھرپور طریقے پر ہونا چاہیے۔ وہ مسلسل لگن اور محنت سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دن رات کی محنت شاقہ نے ان کے دل کو تھوڑا متاثر "کمزور" کر دیا ہے لیکن دماغ اسی طرح چست تیز اور نئے ابھرتا نئی سوچ اور احساس کو دوسروں تک پہنچائے جا رہا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں جب میری افسانوں کی پہلی کتاب "ہوا" چھپی تو میں نے اپنی اس کتاب کی ایک جلد بھیجی..... انہوں نے از راہ محبت مجھ سے کسی جان پہچان کے بغیر اخبار میں اس پر تبصرہ بھی کیا اور مجھے پریس کٹنگ بھی ارسال کی تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو مجھے ایک خاصے عرصے سے جانتے تھے کہ وہ مجھے مسلسل پڑھ رہے تھے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ایسے دور میں جب ہم لکھنے والے ابھی صرف اپنی تحریریں پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں وہ سارا کچھ پڑھتے ہیں اور پھر اس کے متعلق ایک رائے بھی رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک نقاد کا تو کام ہی دوسروں کی تحریریں پڑھنا اور پھر اپنی رائے قائم کرنا ہوتا ہے لیکن جب تجربے میں یہ بات آتی ہو کہ لوگ بالکل چند ہونے مونے ناموں کے علاوہ دوسروں کی طرف ذرا کم ہی متوجہ ہوتے ہیں تو پھر کیا بات دوسری نہیں بن جاتی اور صدیقی صاحب جیسے لوگوں کی قدر دل میں اور نہیں بڑھ جاتی۔ میں نے اپنا ذکر تو یونہی بات بڑھانے کے لئے کر دیا ہے آپ جس سے بھی پوچھیں گے جس سے بھی بات کریں گے اور جو بھی کہے گا کہ اس کے تعلقات صدیقی صاحب سے اچھے ہیں وہ ساتھ ہی یہ بھی کہے گا کہ وہ اس کے بہترین دوست ہیں۔ ان کا رویہ محبت بھرا سلوک سب کے ساتھ ایک جیسا ہی ہے یعنی ہم وزن..... یہی توازن ان کی زندگی اور تحریروں میں بھی ہر جگہ موجود ہے۔ یہ بات تو آگے بھی ہوگی لیکن پہلے ایک واقعے کا ذکر ہو جائے مناسب ہے کہ فیض صاحب جب کراچی آتے تھے تو جن نوجوانوں کو وہ آتے ہی فون کرتے تھے ان میں محمد علی صدیقی بھی شامل تھے اور ہندوستان کے چند نقادوں کے علاوہ پاکستان میں صرف محمد علی صدیقی کو بحیثیت ایک نقاد پسند کرتے تھے۔ یہ اس شخص کی بات ہو رہی ہے جو شاعر تو بے مثال تھے ہی خود تنقیدی بصیرت بھی رکھتے تھے ان کی یہ رائے صدیقی صاحب کے بارے میں ایک مثبت ادبی رویے کی ترجمان ہے۔ پھر صدیقی صاحب کی تخلیقات مثلاً مضامین، کروچے کی سرگزشت (ترجمہ) اور توازن وغیرہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کی نظر کس قدر وسعت کی حامل ہے اور ان کی سوچ کتنی متوازن ہے اور عام نقادوں کی طرح ان کے کندھے پر کلہاڑا کہیں بھی نظر نہیں آتا حالانکہ وہ ترقی پسند سوچ کے حامل نقاد ہیں کہ یہی ان کی پہچان بھی ہے لیکن انہوں نے کبھی بھی دوسرے مکتبہ فکر کے حضرات پر بات کرتے ہوئے تنگ نظری تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اپنی تحریر میں موجود جوہر کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا..... وہ مثبت پہلو سوچ کے شروع ہی سے داعی رہے ہیں۔

انہوں نے اپنی روشن خیالی اور مثبت فکر کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا آج جب کہ ترقی پسند سوچ ترقی پسندی کے دھارے پر عجیب کڑا وقت آن پڑا ہے کہ سایہ بھی ساتھ چھوڑتا نظر آتا ہے۔ وہ لوگ جو کبھی اپنے آپ کو بہت بڑے ترقی پسند سمجھتے تھے اور اس کا پرچار بھی خوب کرتے تھے اب اسٹیبلشمنٹ سے Collaborate کر کے چین کی بنسری بجاتے نظر آتے ہیں۔ یہ تبدیلی کے بعد کہیں چھپکا تو سنے والی بات ہوتی حالانکہ بات گویا تو گئی ہو معاملہ تو ہے نہیں۔ یہ تو زندگی کے بارے میں اسے سمجھنے کے بارے میں ایک نقطہ نظر کی بات ہے اصل میں ایسے لوگ اس وقت بھی "کالی بھیڑیں" ہی تھے اور جب انہوں نے فضا کا رنگ بدلا دیکھا تو شکر کیا کانوں کو ہاتھ لگایا اور اپنی کینچلی بھی بدل لی لیکن محمد علی صدیقی جیسے ثابت قدم لوگ کبھی ہوتے ہیں جو قافلے کے ساتھ چلے تو اب تک چلے جاتے ہیں اب چاہے پاؤں میں چھالے پڑیں یا جسم پر تازیانے برسیں... چلنا تو ہے..... اور چلتے رہنا ہے پورے یقین اور صدق کے ساتھ اور مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے قافلے کے راہروں کا ایک حصہ ہوں۔ میں ہوں تو اس راستے کی مٹی دھول لیکن مجھے اس خاک کا ایک ذرہ ہونا بھی اچھا لگتا ہے پھر جب ساتھی محمد علی صدیقی جیسے لوگ ہوں تو کیا کہنے۔

زیادہ نہیں ایک آدھ رائے دوسروں کی بھی دوں گا..... مثلاً ممتاز حسین فرماتے ہیں "وہ زندگی اور ادب میں اجتماعیت اور اس قسم کے دوسرے ترقی رجحانات کے تحت حامل ہیں" اور واقعی ایسا ہی ہے۔ ادب کے ایک منفرد نقاد ہوتے ہوئے ان کا رویہ یہی ہے۔ اب ایک جملہ منیر نیازی کا بھی سن لیجئے..... ہمارے آج کے عہد کا یہ خوبصورت بندہ اور شاعر جو "تاسا ولکھا بندہ" بھی ہے کہتا ہے "محمد علی صدیقی ہمارے ان چند نقادوں میں سے ہیں جو ایک بے طرز احساس ایک بے محور زن کے ظہور کے ضمن میں خوبصورت کردار ادا کر رہے ہیں۔"

منیر نیازی کے جملے سے قبل ہوتی صدیقی صاحب کے بارے میں یہ ہے

ہاں ایک خوبصورت بات..... ابھی چند ماہ پیشتر اسلام آباد میں برپا ہونے والی اردو کانفرنس میں صدیقی صاحب سے ملاقات ہوئی وہ پہلے کی بجائے کچھ مزید جوان اور خوش گوار نظر آئے خدا انہیں نظر بد سے بچائے میں انہیں ایسے ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ سو محمد علی صدیقی بہت سارا ادبی کام کر چکے ہیں اور ابھی مزید کر رہے ہیں سرسید احمد خان اور جدت پسندی، "مطالعہ اقبال" اور "جہات" ان کی ایک اور تازہ کتاب آئی ہے "غالب اور آج کا شعور" تو اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ تھکے بغیر اپنی جستجو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور وہ متوازن اور روشن ادبی پہلوؤں پر اجاگر کئے جا رہے ہیں کہ جن کی وجہ سے اس زمین پر قدم رکھنا چلنا اور مزید کام کرنا ہمارے لئے ذرا آسان ہو جاتا ہے اور ہم خوش ہو جاتے ہیں..... اور کچھ زیادہ ہی کہ خوشی ہمارے پاس بیشک کم "تھوڑی سی" ہی ہوتی ہے!!!

عصمت چغتائی۔ حقیقت یا افسانہ

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

عصمت چغتائی کے انتقال کی خبر ادبی حلقوں کے لیے اتنی ہی غمگین خبر ثابت ہوئی جتنی خود ان کی زندگی۔ عصمت چغتائی ویسے تو 76 سال زندہ رہیں لیکن ان کی ادبی زندگی اس وقت تک زندہ حقیقت رہے گی جب تک اردو افسانہ زندہ ہے۔

جب شاہد احمد دہلوی کے ماہنامے "ساقی" میں عصمت کا پہلا افسانہ "فسادی" شائع ہوا تو چاروں طرف کہرام مچ گیا۔ شاید وہ زمانہ زندہ تخلیقات پر کہرام مچانے ہی کا ہوا کرتا تھا۔ پھر عصمت چغتائی کی تحریر کا نشتر قابل دو تھا، تیز تھا کہ ٹھیک نشانے پر لگا اور متوقع نتیجہ برآمد ہوا۔ اس کے بعد عصمت کی دو تین تحریریں "ادبی دنیا" میں شائع ہوئیں اور ہم مولانا صلاح الدین احمد کے مضمون "عصمت چغتائی" (جو "صریر خامہ" کی دوسری جلد میں شامل ہے) میں "ادبی دنیا" کے دفتر میں قدیم قسم کے حضرات کی یورش سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عصمت چغتائی نے کیا کہرام مچایا ہوگا۔

مولانا نے اس مضمون میں ایک بات بہت ہی درست لکھی اور افسانے کی تنقید میں صرف یہی ایک نکتہ شہرت دوام دینے کے لیے کافی ہے کہ عصمت نے عورت کے مسائل پر عورت کی نظر سے لکھا اس سے پیشتر مرد ہی عورتوں کے بارے میں لکھتے تھے خواہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے روحانی جانشین ہوں یا مرزا ہادی رسوا ("امراؤ جان ادا") مرزا محمد سعید "خواب ہستی" ہوں یا پریم چند کا "میدان عمل" نیاز فتح پوری کا "شہاب کی سرگزشت" ہو یا "حسن پوش" کے مصنف مجنوں گورکھپوری۔

زمانے کے تغیرات کے ساتھ ساتھ عورتوں کے بارے میں مرد افسانہ نگاروں یا ناول نویسوں کے خیالات میں تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں پہلی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے مردوں کی دنیا میں عورت کا نقطہ نظر پیش کیا۔ عصمت چغتائی نے ڈاکٹر رشید جہاں کا اثر قبول کیا۔ عصمت چغتائی سے پہلے غیر حقیقی تخیل کی حکمرانی تھی اور عصمت کے ساتھ "نیچرل" کا دور شروع ہوا۔

وہ یقیناً ایک طوفان خیز مصنف تھیں اور جدید معنوں میں سماجی حقیقت نگاری بلکہ نفسیاتی حقیقت نگاری کی جانب عصمت چغتائی نے جس جوش و خروش کے ساتھ توجہ دی اس نے بہت جلد ہی شمالی ہند کے متوسط طبقے کی "خاتون خانہ" کی زندگی کے بعض ایسے گوشے وا کر دیے جن کے بارے میں ہنوز لب نہ کھلے تھے۔ ایک اہم لکھنے والے کا کمال یہی ہے کہ وہ اس طرف دیکھے جس طرف دیکھا نہ گیا ہو یا اگر دیکھا گیا بھی ہو تو اس طرح جو دیکھا نہ گیا ہو جس طرح کہ دیکھا جانا چاہیے۔

1942ء میں عصمت چغتائی کے افسانوں کا مجموعہ "چوٹیں" شائع ہوا۔ کرشن چندر نے اس کتاب کے پیش لفظ میں (جس کا اقتباس ڈاکٹر ذوبیہ رنگوا کی کتاب "بھارتیہ ساہتیہ کاروں کے سکشی کار" (Sakshtkar) سے لیا گیا ہے) بہت کام کی بات کہی ہے۔

"پہلے پہل جب عصمت کے افسانے اردو رسالوں میں چھپے تو لوگوں نے کہا "کوئی مرد لکھ رہا ہے ان کہانیوں کو ہماری شریف بہو بیٹیاں کیا جانیں افسانے کیسے لکھے جاتے ہیں۔ لیکن جب عصمت یہ افسانے لکھتی رہیں اور لکھنے پر اڑی رہیں تو ارشاد ہوا "لڑکی ہوتا تو بھی وہ کیا لکھیں گی۔ سخن کہیں کی ابھی جب دیکھو چٹکلے سناتی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ لڑکی بھی کیا بلا ہے۔"

"پھر وہ دور آیا" ہاں لڑکی ہیں! خواتین افسانہ نگاروں کی صف اول میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ عورتوں کی نفسیات کو خوب سمجھتی ہیں وغیرہ وغیرہ اور اب یہ حال ہے کہ عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اس شرمندگی کے مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

عصمت چغتائی کا پہلا مجموعہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے پہلے مجموعے کے بعد آیا۔ فیض احمد فیض اور ن۔ م۔ راشد کے شعری مجموعے بھی عصمت کے پہلے مجموعے کے آس پاس ہی آئے۔ چالیس کی دہائی کے شروع سال اردو ادب کی تاریخ کے "انقلابی سال" قرار دیے جا سکتے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ سر سید احمد خان اور ان کے بعد ترقی پسند تحریک روایتی جمود کی جس عمارت پر پے در پے ضرب کاری لگا رہی تھی وہ اب آہستہ آہستہ مائل بہ شکستگی تھی۔ انہوں نے ابتدائی دور میں اس قدر بے باکی کے ساتھ لکھا کہ سماج کے ٹھیکیداروں کے دل ہل گئے۔ ان کے یہاں ایک تند و تیز قلم ایک چلتی ہوئی سنانے والی زبان کا دور دورہ تھا۔ ذہنی تحفظات کے بغیر لکھنے کی روش پر کاربند ہونے کا عزم، ان کی اپنی زندگی، زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے سلسلے میں جرأت کا مظاہرہ۔ بی اے بی ایڈ کر کے علی گڑھ گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس کی حیثیت سے آغاز۔ دلیر اور ترقی پسند ادباء کے ساتھ ذہنی رفاقت کا مظاہرہ کچھ کم انقلابی مظاہر نہ تھے۔

یوں لگتا تھا کہ عصمت چغتائی کو دوسروں کو جھنجھلانے میں مزہ آتا تھا۔ اور جب قارئین ایک دوسرے سے پوچھتے ہوئے کہ آخر یہ عصمت چغتائی کون ہے تو یہاں بھی اپنے نام سے فائدہ اٹھا کر خوش ہوتی دکھائی دیتی تھیں۔ والدین نے ان کا نام عصمت خانم ہی تجویز کیا تھا لیکن عصمت اڑ گئیں کہ اس نام پر "صنف نازک" کو واضح حجاب ہے۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح ان کے نامور بھائی مرزا عظیم بیگ چغتائی "کولتار" جیسی تحریروں سے اپنے بارے میں ایک عجیب و غریب اور اسمارٹ شخصیت کا تاثر دینا چاہتے تھے۔ عصمت چغتائی مردوں کے معاشرے میں مردوں کو زچ کرنے پر تلی ہوتی تھیں۔ ممکن ہے کہ ان کی شوخ طبیعت کے پس پشت بعض ایسی نفسیاتی گرہیں ہوں جنہوں نے عصمت کے یہاں Id اور Ego کے مابین تصادم پیدا کیا ہو۔ وہ فنا فی الشعور اور جبلت کی ترجمانی سے اجتناب نہیں برتتیں۔

لیکن عصمت چغتائی کا اصل ہدف وہ ریا کار سماج ہی تھا جو اخلاقی برائیوں اور بدکاریوں میں گلے گلے گرفتار ہونے کے باوجود ان برائیوں کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھا۔ ان برائیوں کے رنگوں کے بارے میں Colourblind ہوتا جاتا تھا۔

عصمت چغتائی نے فن افسانہ نگاری میں اپنے لیے جو مخصوص جگہ بنائی وہ اس نظریے کے تحت تھی کہ مرد لکھنے والے عورتوں کو آدمی کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اور عجب اتفاق ہے کہ عصمت نے یہ بات 1988ء میں ڈاکٹر رنگراے سے اپنے انٹرویو میں کہی جب کہ یہی بات مولانا صلاح الدین احمد عصمت چغتائی کے بارے میں "معاصر پٹنہ" میں شامل اپنے مضمون میں بہت پہلے کہہ چکے تھے۔

"عصمت نے اپنی کاوشوں سے ہمارے سماج کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس نے عورت کو وہ باتیں بیان کرنے کا راستہ دکھایا ہے جنھیں وہ اب تک اپنے نفس کی گہرائیوں میں ضرور محسوس کرتی تھی لیکن جن کے اظہار پر قدرت نہیں تھی۔ اور خوبی یہ ہے کہ فن کار نے زندگی کی یہ بے ضرر حقیقتیں ایسے دل آویز طریقے سے پیش کی ہیں کہ ہمارے اوسط درجے کے پڑھنے والے جو ہمارے جھوٹے اور دوغلے ادب کے تکلفات اور تصنعات کے عادی ہو چکے ہیں اس سے بدک کر بے مزہ نہیں ہوتے بلکہ آہستہ آہستہ اس سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ موضوع کو سلیقے سے نبھانے کی یہ حیرت انگیز قدرت مجھے اردو افسانے اور مصنف میں ایسی فراوانی سے نظر نہیں آتی۔ (معاصر خاص 1949ء جلد دوم 359-60)

اور حقیقت تو یہ ہے کہ عصمت چغتائی نے ناولٹ "ضدی" بھی انسانی زندگی کے ایک رخ کو واضح کرنے کے لیے لکھا تھا۔ یہ فرانسیسی ناول "حاجرہ" کا جو دراصل ایک ماہر کی ناول کا ترجمہ تھا کا اردو ترجمہ تھا۔ عصمت نے ناول کے اردو ترجمے کو اپنے رنگ میں رنگ کر اسے ذات پات کے جہنم میں جلتے بھنتے ہندوستان کا نوحہ بنا دیا۔ بعد میں اس ناولٹ نے ایک کامیاب فلم کا روپ دھارا۔ لیکن عصمت نے اصل فرانسیسی ناول کی حیثیت اس خوبی کے ساتھ چھپائی کہ واقعتاً ان کی فن کارانہ صلاحیت کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔

عصمت چغتائی نے حقیقت نگاری کے فن میں جان ڈال دی۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے مکتب نگارش سے بعد میں آنے والوں نے بھی استفادہ کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعد میں آنے والوں نے عصمت چغتائی کے موضوعات کا اتباع کیا بلکہ مکتب نگارش کے اتباع سے مراد محض اس قدر ہے کہ عصمت چغتائی نے شمالی ہند کے متوسط مسلم اور نچلے متوسط طبقے کی زندگی میں چھپا ہوا بکھرے ہوئے کرداروں کے لیے جذبہ ہمدردی پیدا کیا۔ کرداروں کی تفہیم زندگی کی تفہیم ہوتی ہے۔

عصمت افسانوں کے متعدد مجموعوں کی خالق ہیں۔ "کلیاں" 1942 "چوٹیں" (1942) "ایک بات" (1942) "ضدی" (ناولٹ 1942ء) "دو ہاتھ" (1955ء) "ٹیڑھی لکیر" (1943ء) "تین اناڑی" (1964ء) "معصومہ" "ایک قطرۂ خون" (1975ء)۔ انھوں نے متعدد فلموں کے اسکرپٹس بھی لکھے اس کے ساتھ ساتھ چند فلموں میں اداکاری بھی کی۔

عصمت چغتائی متعدد وجوہات کی وجہ سے جدید اردو افسانے کی قیامت قامت شخصیت تسلیم کی جاتی رہیں گی وہ گزشتہ چند سال سے نسبتاً خاموش زندگی گزار رہی تھیں لیکن انھوں نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں اس قدر ہلچل مچائی تھی کہ آخری چند برسوں کی "خاموش زندگی" بھی دراصل ان کے بھرپور ادبی کیریئر کی طوفان خیزی کے بعد کا ایک قدرتی وقفہ لگتا ہے اور اب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ہمارے بیشتر جدید افسانہ نگار اور جدید افسانے کے نقاد اس حقیقت کو تسلیم کریں گے کہ آج اردو افسانہ جس مقام سے خطاب کر رہا ہے وہ عصمت کی ادبی ریاضت کے بغیر نشان منزل نہ بن سکتا تھا۔ عصمت چغتائی آزادی کی عظیم الشان تحریک اور ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ایک ہی زقند لگا کر بڑا نام بن گئیں۔ ان کے بارے میں یہ دلچسپ جملہ دہرایا جا سکتا تھا "وہ آئیں" "انھوں نے دیکھا اور انھوں نے فتح کر لیا"۔ عصمت چغتائی اردو افسانے میں محض ایک منفرد طرز تحریر کے حوالے سے یاد نہیں کی جائیں گی بلکہ وہ ان گنت مسائل کے حوالے سے بھی یاد کی جائیں گی جو ان کی وجہ سے اردو افسانے کی دنیا کا ناگزیر حصہ بن گئے۔

بعض حضرات نے عصمت چغتائی کے بارے میں خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کی شہرت میں عظمت کم اور حیرت زیادہ ہے۔ بعض حضرات نے عصمت چغتائی کو رشید جہاں کی نسوانی بغاوت کی توسیع سے تعبیر کیا ہے اور "جنس نگاری کے پردے میں معاشرتی حقیقت نگاری کا فریضہ سر انجام دینے والی ادیبہ" قرار دیا ہے۔ عزیز احمد نے انھیں "رجعت پسندانہ اور مریضانہ رجحان کی افسانہ نگار" گردانا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے عصمت چغتائی کو شمالی ہند کے مسلم متوسط طبقے کی خواتین کے بارے میں سب سے زیرک افسانہ نگار قرار دیا ہے اور اس طرح شمالی ہند کے مسلم سماج کی ایک بے لاگ نقاد بھی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ عصمت چغتائی نے معاشرے کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی۔ انھوں نے جس طرح منافقت اور ریاکاری کا پردہ چاک کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عصمت چغتائی نے عورت کے مسائل پر عورت کے زاویے سے لکھا بلکہ یوں کہ مردوں سے زیادہ اعتماد کے ساتھ لکھا اور اس پر مستزاد یہ کہ بے باکانہ انداز میں لکھا۔ وہ ایک صاحب طرز ادیبہ تھیں۔ عصمت چغتائی غالباً اردو ادب کی پہلی ادیبہ ہیں جو ادب کے ذریعہ سماج میں تبدیلی کے عمل کو تیز تر کرنا چاہتی تھیں اور ایک بڑی ادیبہ کی طرح انھوں نے اپنی اہمیت اس طرح بھی اجاگر کی کہ اپنے زاویۂ نظر کو عام کر دیا اور متوسط طبقے کی خواتین کے مسائل کے لیے اہم امور کے محور کو ممکن بنایا۔ عصمت چغتائی اپنے افسانے "لحاف" کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ اس افسانے کے بارے میں پطرس (احمد شاہ بخاری) نے "نئے زاویے" (جلد دوم) (1944ء) میں بہت سخت رائے دی ہے "جو آرٹسٹ عصمت چغتائی کی طرح اپنی مخلوق کو یوں حیوانیت کے کنارے لے جاتا ہے وہ گوار

کی دھار پر چلتا ہے چنانچہ ان کے مشہور افسانے "لحاف" میں جیسا میں سمجھتا ہوں ان کا قدم ہی اکھڑ گیا۔ ان کی لغزش یہ نہیں ہے کہ انہوں نے بعض سماجی ممنوعات کا ذکر کیا ہے۔ سماج اور ادب کی سرحدیں کب ایک دوسرے کے متوازی ہوتی ہیں لیکن اس کہانی کا مرکزی عمل کوئی دل کا معاملہ نہیں بلکہ ایک جسمانی حرکت ہے۔ کیا یہ اعتراض ایک فنکار کی آزادی کی تحدید نہیں ہے؟

عصمت چغتائی نے زندگی پر مکمل تنقید کی اور اس طرح خود اپنے اوپر تنقید کو بھی ممکن بنایا۔ ان کی تحریر کی بے ساختگی کا تعلق ان کی ذہنی پختگی سے ہے۔ ان کا مشاہدہ کیا ہے ایک نوع کا ریڈیائی مطالعہ ہے۔ ایکسریز (X-Rays) کی طرح۔ ان کے زمانے کی مسلم عورت سماج میں اس بری طرح پچھڑی ہوئی تھی کہ عصمت چغتائی نے سوچا کہ بلند و بانگ اور بلند آہنگ ہوئے بغیر اس عورت کی حالت زار کی جانب توجہ مبذول نہیں کرائی جا سکتی۔

عصمت کا خیال تھا کہ اگر معاشرے میں عورت کو اس کا صحیح مقام دیا جائے تو پھر وہ معاشرہ ترقی کر سکتا ہے ورنہ معاشرہ بذات خود لنگڑی کمر ہو کر رہ جائے گا۔ مسلم خواتین کی سماجی تاریخ تحریر کرنے والی عصمت چغتائی اور ان کے جلو میں قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنے والی بعض خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کیے بغیر اس ساخت اور سیاکاری کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا جس نے پورے سماج کو مجروح کر رکھا تھا۔

عصمت چغتائی واقعتاً صاحب طرز ادیبہ ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ناول بھی فلمی کہانیاں بھی انہوں نے دو فلموں میں اداکاری بھی کی۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متعلق رہیں اور اس سلسلہ میں ان کا یہ قول بڑا دلچسپ ہے کہ "عورت اگر ترقی پسند نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی۔" عصمت چغتائی آج بھی بہت مقبول ادیبہ ہیں اور وہ حضرات جو عصمت چغتائی کی حقیقت نگاری یا افسانہ نگاری کو انگریز جون آف آرک یا ووبلو کے فن سے موازنہ کر کے عصمت چغتائی کی قدر و قیمت گھٹانا چاہتے ہیں وہ سب سے پہلے اپنے معاشرے کو امریکی معاشرے کی سطح پر لے جانے کی کوشش کریں ورنہ اس نوع کا مقابلہ بے سود ٹھہرے گا۔ عصمت صرف ہمارے زمان و مکان کی ساخت و پرداخت ہیں۔ عصمت چغتائی نے جس استقامت کے ساتھ اپنے سماج کی منافقت کا پردہ چاک کیا ہے اور عورت ہوتے ہوئے چاک کیا ہے وہ بذات خود ایک ادبی انقلاب ہے جو برصغیر کی سماجی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔ غالباً اسی لئے عصمت چغتائی کی خدمات کا سب سے کامیاب اعتراف مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہوئی وہ برصغیری عورت ہے جو باوقات مردوں کی دنیا میں بیشتر مردوں سے بہتر کارگزاری کا مظاہرہ کر رہی ہے اور اپنے آپ سے یا اپنے سماج سے کسی طور پر شرمندہ نہیں ہے۔

عصمت چغتائی آج کی پڑھی لکھی اپنے حقوق کے بارے میں آگاہ اور اپنے حقوق کی جنگ لڑتی ہوئی خاتون کی فکری رہبر ہیں۔ عصمت چغتائی کے افسانوں اور ناولوں نے آزادیٔ نسواں کے لیے کارِ نبوت کا کام کیا ہے۔

بقیہ: ادبی جہاد

رہ گئے ہیں۔ اچھا ہے کہ تم اس روش سے محفوظ ہو کیونکہ بعض اوقات صرف احتیاط کے تقاضوں کے پیشِ نظر اختیار کئے جانے والا "توازن" عقیدے اور عدت کے بے لگام سیلاب پر حاوی آجاتا ہے۔ ادبی تنقید ایک ادبی فن پارے کے مطالعے کے لئے درکار تناظر میں اس فن پارے کی خود رو قیمت کے تعین ہی کا کام ہے"

اس مندرجہ بالا گفتگو کو ضبطِ تحریر میں لانے کے بعد ڈاکٹر محمد علی صدیقی رقم طراز ہیں کہ میرے ادبی سفر میں یہ جملہ منارہ روشنی کا کام کرتا ہے۔

صفحہ ۱۸ کے دوسرے پیراگراف میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی پروفیسر کرار حسین کے متعلق فرماتے ہیں کہ "کرار حسین کا ایک مخصوص نظریہ علم تھا۔ کرار صاحب افلاطون نظریۂ علم کے قائل نہ تھے۔ جس کے مطابق انسان کا علم اس کے تحت الشعور میں محفوظ ہے اور علم حاصل کرنا دراصل علم کی بازیافت ہے"

اسی مضمون میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب یوں فرماتے ہیں کہ "کرار صاحب مذہبی رہتے ہوئے بھی زیادہ سائنسی ہو گئے۔ عقیدہ اور علم کے مابین کیا فرق ہے؟ کیا عقیدہ علم پر اثر ڈالتا ہے یا علم عقیدے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ فرد کا علم جس قدر وسیع گہرا اور دوسرے علوم کے تناظر میں اپنے عقیدے کو دیکھے گا عقیدہ اسی قدر موروثی ہونے کے بجائے تجرباتی اور اخذ کردہ ہوگا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا مندرجہ بالا مضمون جس کے حوالے ابھی میں نے پیش کئے یہ مضمون ہمارے دور کے انتہائی اہم نقاد اور مفکر پروفیسر کرار حسین کی شخصیت پر مضمون ہے اس مضمون کو میں دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی ایک کوشش تو کہہ سکتا ہوں مگر یہ حاصل نہیں سمجھتا کیا ہی اچھا ہو کہ دورِ حاضر کی ایک انتہائی اہم شخصیت پروفیسر کرار حسین پر ایک ضخیم کتاب تحریر کرے جس میں پروفیسر کرار حسین کی زندگی کے ہر گوشہ پر تفصیل سے اہلِ علم و دانش اور مجھ جیسے طالب علموں کے لئے مواد موجود ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام صرف اور صرف ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے شاہکار قلم کا منتظر ہے۔ کیونکہ دورِ حاضر میں یوں تو بہت نقاد اور دانشور موجود ہیں مگر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کو یوں ان لوگوں سے منفرد خیال کرتا ہوں چونکہ ڈاکٹر صاحب اردو ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کے حوالے سے بھی ایک اہم مقام کے حامل ہیں اور پروفیسر کرار حسین صاحب سے ڈاکٹر صاحب کو قربت حاصل رہی ہے اور یوں پروفیسر کرار حسین صاحب کی شخصیت، فکر، فلسفۂ حیات پر ان سے بہتر لکھنا کسی کے بس میں نہیں۔

محسن احسان

رسم سجدہ کو معتبر رکھا
اپنی دہلیز پر ہی سر رکھا

ہم نے اس آنکھ کا وظیفہ کیا
جس نے بے خواب عمر بھر رکھا

وَصل کی ساعتوں میں بھی ہم نے
آنکھ کو آنسوؤں سے تر رکھا

جگنوؤں کے چراغ ہاتھ میں ہیں
راہ کو روشنی سے بھر رکھا

جس کو منزل کا کبھی خیال نہ تھا
اس مسافر کو ہمسفر رکھا

جو شجر گلستاں میں بویا نہیں
آشیاں اس کی شاخ پر رکھا

ہم تو وہ راہرو رہے محسنؔ
جس نے شانوں پہ اپنا گھر رکھا

o

نامی انصاری

ڈھونڈتے رہ گئے مگر نہ ملا
پانیوں میں کہیں گہر نہ ملا

کیسے دنیا جہاں کو سر کرتے
زورِ بازو کمان بھر نہ ملا

بے یقینی کی دھوپ تھی سر پر
دُور تک سایۂ شجر نہ ملا

شہر کا شہر سیلِ آب میں تھا
آدمی کیا ہے جانور نہ ملا

رینگتے سائے ہر طرف دیکھے
آرزو رہ گئی بشر نہ ملا

جانے کس کس کو لے گئی آندھی
شہر میں کوئی باخبر نہ ملا

سب کے سب کھو گئے کہاں نامیؔ
اک پرندہ بھی شاخ پر نہ ملا

o

سید مشکور حسین یادؔ

نیند کے ماروں کو ایسا بھی تو دیجے کوئی خواب
کھول دے ذہنوں کے سب دُھوپ دریچے کوئی خواب

یوں بھی دکھلاؤ مری جان انا کے تیور
گرمیٔ شوق سے ہر لمحہ پسیجے کوئی خواب

کچھ تو معلوم ہو دُنیا کو جنوں کا رُتبہ
اس طرح اپنے گریبان میں سیجے کوئی خواب

بے طرح بگڑی ہے شکل آپ کے دیوانے کی
آئنے کی طرح مت سامنے کیجے کوئی خواب

جتنا جی چاہے پیو بندشِ پیمانہ نہیں
خوب چھلکا ہے تو پھر اوک سے پی جے کوئی خواب

ہم کہ دیوانے حقائق کو لئے پھرتے ہیں
ہم بھی کچھ ناز کریں ہم پہ بھی ریجھے کوئی خواب

ہر نفس طالعِ بیدار کا ہوتا ہے گماں
سامنے رکھتا ہے کچھ یوں بھی نتیجے کوئی خواب

بس یونہی یادؔ رُخِ جاں سے اُٹھیں گے پردے
کبھی لیجے کبھی دیجے کبھی جیجے کوئی خواب

O

مرتضیٰ برلاس

ٹوٹے بے شک مگر جُھکے نہ کہیں
ہوں گے ہم سے بھی سَر بھرے نہ کہیں

اپنی اپنی اَنا کے مارے ہوئے
ایسے بچھڑے کہ پھر ملے نہ کہیں

ہے جو ناداں کو زُعم دانائی
تجربہ اُس کا لے مرے نہ کہیں

جانے کس سمت کا ہے قصدِ سفر
آگے لُٹ جائیں قافلے نہ کہیں

گھر سے نکلیں تو ڈر یہ لگتا ہے
لوٹ کر ہم جو آ سکے نہ کہیں

آئینہ خانے میں نہ لاؤ اُسے
سب دُزدگ جائیں آئینے نہ کہیں

قُرب کچھ اعتماد چاہتا ہے
ورنہ بڑھ جائیں فاصلے نہ کہیں

O

نقاش کاظمی

کہتے ہیں اس کو لوگ ترے نام کا درخت
آنگن میں جو لگا ہے نیا آم کا درخت

میں خوش گماں بہت تھا مگر مجھ پہ ٹوٹ کر
ایک اور آ پڑا نئے الزام کا درخت

مُرجھا گئی ہے ساری نئی کونپلوں کی کوکھ
اب پھل کہاں سے دے دلِ ناکام کا درخت

میں جب بھی لوٹتا ہوں پرندوں کے ساتھ ساتھ
حیرت سے دیکھتا ہے مجھے شام کا درخت

تنہا کھڑا ہوا ہوں میں اپنی تلاش میں
گلشن میں جیسے گوشۂ گمنام کا درخت

انسان' آدمی کی ہی تکمیلِ ذات ہے
پودے کی ابتدا سے ہے انجام کا درخت

اک لحہ عکسِ چشمِ غزالاں تو بن کے دیکھ
یہ تُو ہے یا بہشت میں بادام کا درخت

نقاشؔ کتنے نام محبت نے لکھ دیئے
شاید ترا بدن ہے بڑے کام کا درخت

O

عبدالعزیز خالدؔ

اس دیارِ شور وشر سے ہم کو نسبت ہے' جہاں
دانش و ادراک ہر دو ایک جنسِ رائیگاں

چھوڑ جائے ہر کوئی کارِ جہاں کو ناتمام
مہلتِ تکمیل مرگِ ناگہانی دے کہاں!

فکر کی چینک بھی ہوتی کاش اہلِ ذکر میں
ان میں نا آتی خرد افروزیِ روحِ زماں

جو نقیبِ امن تھے مردِ مُبارز بن گئے
ڈھل گئی نعرۂ کشتار میں بانگِ اذاں

سابقہ جس سے پڑے آشفتہ مغز ہو بے لحاظ
ہو گئے غائب کہاں جانے محبت پیشگاں؟

ہر کشیدہ قد نہیں ہے درخورِ نعمائے دل
کر دیے ارزانیوں نے بے کشش زیبا رخاں

یہ طلسمِ کُن یہ حیرت خانۂ غیب و شہود
آسماں در آسماں ہے کہکشاں در کہکشاں

شعر میں حکمت بھی ہوتی ہے' بیاں میں سحر بھی
ہو نہ حائل لیکن اس خوبی کا ہر شعر و بیاں

ہر کسی کو ہو نہ قدرت معرضِ خاطر خواہ پر
شاہدی اس کی خلیل 1 و اصمعی 2 کے دیں بیاں

گونجیں کانوں میں ہمارے نغمہ ہائے شعلہ تاب
ہم نوا گر کیوں نہ ہوں ان کے طفیل آتش بجاں؟

گوشہ گیری ہم کو ہے خالدؔ حصارِ عافیت
ہم ہیں ان سے اور ہم سے بے نیاز اہلِ جہاں!

1 خلیل بن احمد بصری.... موجدِ عروض
2 عبدالملک اصمعی بصری... لغوی اور نحوی جسے خلیفہ ہارون الرشید "شیطان الشعر" کہا کرتا تھا۔

O

محمودالحسن

یہ کرشمہ بھی ترا نقشِ کفِ پا کر دے
ہم تھکے ماندوں کو ہمدوشِ ثریا کر دے

ہے عجب تیرگیِ یاس سے دل کا عالم
جلوہ افروز چراغِ رُخِ زیبا کر دے

لب تو وابستۂ زنجیرِ انا ہیں لیکن
دل یہ کہتا ہے کہ اظہارِ تمنا کر دے

وہ تو کہتے ہیں مرے دل کو کریں گے آباد
کوئی اندازہ ویرانیِ صحرا کر دے

کم نہیں شانِ گدائی بھی اگر تو اُس کا
رُوکشِ سطوتِ اسکندر و دارا کر دے

پھر دمِ گریہ تصور ہے اُسی کا دل میں
جو مرے اشک کے ہر قطرہ کو دریا کر دے

میں شہنشائی کا طالب تو نہیں ہوں یا رب
تُو مجھے حلقہ بگوشِ شہِ بطحاؐ کر دے

پھوٹ نکلے گا یہیں چشمہ حیواں محمودؔ
اور زخمِ دلِ بے تاب کو گہرا کر دے

O

کرشن کمار طور

خبر نہیں ہے کہ ہوں کس کی رہگذر میں ، میں
مرے ستارے ہیں ٹھہرے ہوئے سفر میں ، میں

اگرچہ دہر ہے قائم ترے اشارے پر
عجیب بات کہ ہوں دہر کی نظر میں ، میں

خود آگہی کا تماشا بہت نرالا ہے
خود اپنے سر سے جو نکلوں تو اپنے سر میں ، میں

یہ کس حوالے سے میری حیات روشن ہے
ہوں شب میں جتنا فزوں اس قدر سحر میں ، میں

مرے زوال کا اس سے بڑا ثبوت ہے کیا
ہوں اپنے آپ سے بیگانہ اپنے گھر میں ، میں

وفورِ شوق سے دونوں نبھا رہے ہیں طورؔ
مرے اثر میں ہے دنیا ترے اثر میں ، میں

O

جاوید شاہین

نظارہ عجب اُس کے گریباں کی طرف تھا
ہر آنکھ کا رخ سینۂ عریاں کی طرف تھا

دو راستے تھے ایک جگہ رزم جہاں میں
اک گھر کی طرف دوسرا زنداں کی طرف تھا

لیٹا رہا میں گھاس پہ سائے میں بڑی دیر
آگے کا سفر سارا بیاباں کی طرف تھا

بیٹھا ہوا تھا حُسن بہت حالتِ غم میں
رجحان مگر شہرتِ ارزاں کی طرف تھا

تارے کہ اتر آئے تھے اک دشتِ بلا میں
مہتاب کسی قریۂ ویراں کی طرف تھا

یہ کیسے ہوا کہ میں نکل آیا سرِ دار
جانا تو مجھے کوچۂ جاناں کی طرف تھا

کچھ پڑ سا گیا دیدۂ مشتاق میں اُس وقت
جب گرم تماشا کسی میداں کی طرف تھا

اک ہاتھ تھا دنیا کا مری جیب پہ شاہیں
جو دوسرا تھا میرے گریباں کی طرف تھا

O

مامون ایمن (نیویارک)

فِراق و وِصل کے قِصّے کہاں تک
نئے دن رات نے چھینی زَباں تک

زَمیں کی سَرگرانی دیدنی ہے
جُھکا ہے غم کے آگے آسماں تک

قدم کا لڑکھڑانا' کیا تعجب
اُلجھتا ہے زَباں سے اَب بَیاں تک

تمنّا خواب ہے' یوں آدمی کا
سَفر ٹھہرا مکاں سے لامکاں تک

حقیقت ڈھونڈ لیتی ہے فسانے
گہی کی زَد میں آتے ہیں گُماں تک

دُعا کے پاؤں چُومے گا اَثر اَب
کِرن پہنچے گی شاید سایباں تک

خساروں میں سَفر ہوتا ہے دِل کا
زیاں کے دَر سے راہِ رائیگاں تک

کبھی تو جھک سے اُڑ جائے گا یہ دِل
طَلب کو ضبط روکے گا کہاں تک

کہیں کیسے کِسی سے زَخم ہجرت
بُلاتا ہے وفا کا آستاں تک

جہاں تک روشنی ہو گی غموں کی
چلوں گا ساتھ دُنیا کے وہاں تک

بَنا ہے دیس بھی پردیس اَب تو
نظر آتا ہے صحرا' گُلِ جاں تک

جُنوں کا سِلسلہ پھیلا ہے' ایمن!
سَرابوں سے سَوادِ کہکشاں تک

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ ماؤنٹین ویو، کیلیفورنیا (یو ایس اے)

رہ گیا زخم ہرا، پاس میرے تیرے بعد
ہے یہ الفت کا صلہ، پاس میرے تیرے بعد

اِک تیری یاد مچلتی ہے ابھی سینے میں
اور اِک حرفِ دُعا، پاس میرے تیرے بعد

چاند تو ڈوب گیا، کالے سمندر میں کہیں
چھوڑ کر اندھا خلا، پاس میرے تیرے بعد

ہر گھڑی مونگ سی دلتا ہے میرے سینے پہ
دل شکن ہجر تیرا، پاس میرے تیرے بعد

رونقِ محفلِ یاراں بھی تیرے ساتھ گئی
اِک ہیولہ سا رہا، پاس میرے تیرے بعد

تھک گیا ڈھونڈ کے میں تجھکو بھری دنیا میں
کچھ تو ہو تیرا پتہ، پاس میرے تیرے بعد

وقت کی تیز ہوا اِس کو بجھا دے نہ کہیں
ٹمٹماتا ہے دیا، پاس میرے تیرے بعد

تیرا پیغام سنا جاتی ہے جب جی چاہے
تیری یادوں کی صبا، پاس میرے تیرے بعد

تپتے صحرا میں کوئی چھوڑ گیا مجھ کو
رہ گئی تشنہ وفا، پاس میرے تیرے بعد

سرُور انبالوی

جس کے نگر گیا تھا میں کتنے ہی مان سے
اُس نے مجھے گرا دیا اُونچی چٹان سے

اب اور ابتلا میں تو نہ مُجھ کو ڈالئے
آیا ہوں میں گُزر کے کڑے امتحان سے

بوڑھا شجر بھی آندھیوں کی زد میں آ گیا
محروم ہو گئے ہیں گھنے سائبان سے

سیلاب فصل کے ساتھ درانتی بھی لے گیا
جینے کا حق بھی چھین لیا ہے کسان سے

پانی کا ریلا مٹی بھی ہمراہ لے گیا
وابستہ میری یادیں تھیں کچے مکان سے

پیڑوں پہ ایک پنچھی بھی آتا نہیں نظر
دُکھ اس کا پوچھئے گا ذرا باغبان سے

معنی وفا کے اب تو لغت سے مِٹ گئے
یہ شے نہ مل سکے گی کسی بھی دکان سے

مایوس ہو کے دیر سے جب لوٹ آئے ہم
میلہ میں وہ بھی آ گیا تھا آن بان سے

میرا ہی سینہ اُس نے نشانہ بنا لیا
نکلا جو تیر اُس کی کڑکتی کمان سے

اُٹھیئے سرُور انبالوی اب کون آئیگا
بیٹھے ہوئے ہو راہ میں تم کس گمان سے

O

ڈاکٹر صابر آفاقی

کاش ہم ملیں کبھو چہرہ بہ چہرہ روبرو
درد سنائیں مو بہ مو چہرہ بہ چہرہ روبرو

نغمۂ حیات پر کان لگائیں بام و در
دف بجائے آپ تُو چہرہ بہ چہرہ روبرو

لب پکارے العطش چشم بولے الحیا
دل کہے سبو سبو چہرہ بہ چہرہ روبرو

رات دن وصال میں عشق کے خیال میں
کامران و سرخ رو چہرہ بہ چہرہ روبرو

میں رہوں نہ تُو رہے نہ کوئی ہاؤ ہو رہے
ایک رنگ ایک بُو چہرہ بہ چہرہ روبرو

ہم کبھی جدا نہ ہوں منکر وفا نہ ہوں
مر کے کھوئیں کو بہ کو چہرہ بہ چہرہ روبرو

قتل گاہ عشق میں یعنی راہ عشق میں
خون سے کریں وضو چہرہ بہ چہرہ روبرو

اب تو جستجو یہی صابؔر آرزو یہی
بانہیں ڈالیں در گلو چہرہ بہ چہرہ روبرو

O

قیصر نجفی

مشکوک جب ہو جائے فضا حد نظر تک
اپنوں کو بھی لوگ آنے نہیں دیتے ہیں در تک

لیتا ہے مرا دوست بھی ایثار سے اب کام
دیتا ہے مرا ساتھ مگر اپنے ہی گھر تک

جاؤں میں کہاں لے کے خذف جانِ حزیں کا
بے مول ہیں اس شہر میں تو لعل و گہر تک

اب کے بھی وقوعے کا یہ پہلو تھا الم ناک
ہر شخص ہی خاموش رہا شور سے شر تک

کم ظرف ہو قاتل تو یہ بتلاتی ہے تاریخ
بولا کئے ہیں پھر شانوں سے اترے ہوئے سر تک

کچھ امن پسند ایسے بھی ہیں شہر میں قیصؔر
پھرتے ہیں سرِ عام لئے تیغ و تبر تک

O

غلام مُرتضیٰ راہی

(بستی فتح پور یوپی ۔ بھارت)

اپنے لیے کرتے ہوئے ہموار بھی آئے
موجوں کے تھپیڑوں سے کئی پار بھی آئے

بکنے کے لیے ہم سرِ بازار بھی آئے
ہم جیسے غلاموں کے خریدار بھی آئے

اندیشہ کبھی رہتا تھا ہر ایک سے مجھ کو
اب چاہے کوئی کھینچ کے تلوار بھی آئے

فطرت کو بدلنے سے بدل جائے گی صورت
غصہ جسے آتا ہے اُسے پیار بھی آئے

سچائی تو سب آ گئی ہے میری نظر میں
اب اس کے لیے قوتِ اظہار بھی آئے

دریا کا سفر جا کے سمندر میں ہوا ختم
صحرا ہی نہیں بیچ میں کہسار بھی آئے

تم موڑ کوئی راہ میں آنے نہیں دینا
آگے کہیں چاہے مری دیوار بھی آئے

O

غالب عرفان

ہے مدتوں سے مرے امتحان میں اب تک
وہ ایک شخص جو ہے اپنی آن میں اب تک

وہ میرا حادثۂ انتخاب تھا لیکن!
وہ ڈھونڈتا ہے مجھے اپنے گیان میں اب تک

غبارِ وقت میں گم ہو گیا اچانک وہ
جسے میں دیکھتا تھا آسمان میں اب تک

نہ جانے کیسے محرک ہے اس کا دستِ عمل
کہ میری فکر ہے گہرے گمان میں اب تک

ہتھیلیوں پہ لکیریں بگڑتی مٹتی ہیں
ستارے ٹوٹتے ہیں آسمان میں اب تک

حروف و صوت کے پیکر فرازِ عرفاںؔ سے
نئے زمانے اُگلتے ہیں دھیان میں اب تک

O

ماجد سرحدی

فصلِ گل کے آتے آتے گلشن کون سنوارے گا
اپنے گھر کو ہم نہ سنواریں گے تو کون سنوارے گا

دیوانوں کی عظمت کا اب اس سے بڑا اعجاز ہو کیا
موسمِ گل ہر دیوانے کو اپنے آپ پکارے گا

محنت کش کھلیانوں کے بھی سُکھ کا موسم دیکھیں گے
نئی سحر کا سورج آخر روپ نیا اک دھارے گا

اس مٹی کا قرض ہے ہم پر اس کی حفاظت اپنا فرض
اس دھرتی کا ہر اک انساں اپنا قرض اتارے گا

آن بھی ہے شان بھی ہے ہم سب کی پہچان بھی
اپنا لہو ہم نذر کریں گے جب بھی دیس پکارے گا

ماجدؔ صاحب کو مستقبل کی کچھ ایسی فکر نہیں
دیکھو یہ دیوانہ پھر سے جیتی بازی ہارے گا

O

خیال آفاقی

کوئی دیکھے تو مرے ہاں ترا مہماں ہونا
اور پھر اس پہ مرا بے سرو ساماں ہونا

حسن کو یوں بھی کسی نے نہیں دیکھا ہو گا
یعنی وہ اس کا مجھے دیکھ کے حیراں ہونا

کر گیا مجھ کو ابد تک کے لئے صرفِ ملال
ایک لمحے کے لئے اس کا پشیماں ہونا

کوئی تو آئے مری صحت' زمانہ دیکھے
صورتِ دشت کا تصویرِ گلستاں ہونا

میرے مشرب میں نہ تھی قیس کی تقلید مگر
مجھ سے دیکھا نہ گیا شہر کا ویراں ہونا

مذہبِ عشق میں بنیاد پرستی کے بغیر
مرحلہ شوق کا ممکن نہیں آساں ہونا

کارِ بے سود کے حامل ہیں خیال ایک سے ایک
کیا ضروری ہے تمہارا بھی غزل خواں ہونا

O

سید خورشید انور رضوی

تُو بھی اپنے درد کی بپتا سُنا
آج اپنا دل بھی ہے ڈوبا ہُوا

اک تسلسل ہے گذرتے وقت کا
کوئی اِک بھولا، کوئی یاد آگیا

وہ محافل، وہ مشاغل، وہ سماں
دل میں اِک میلہ سا رہتا ہے لگا

اب کہاں وہ انجمن آرائیاں
اب تو ملتا بھی کسی سے خواب کا

اب کدھر وہ راستے، مانوس لوگ
اب وہ نقشہ ہی نہیں اِس شہر کا

کیوں کہیں بھی جی نہیں لگتا مرا
وقت تو اب بھی نہیں ایسا بُرا

O

شاہد واسطی

یہ بھی سچ بات ہے اس کو کبھی دیکھا بھی نہیں
یہ بھی سچ ہے کہ کوئی سامنے رستہ بھی نہیں

کیوں کہوں میں کہ کوئی دیکھنے والا بھی نہیں
بات یہ اپنی جگہ ہے کہ میں اچھا بھی نہیں

جا چکا شہر سے وہ ترکِ تعلق کر کے
یاد آجاتا ہے دل سے مرے اُترا بھی نہیں

کس نظر میں ہے طلب کس میں ہوس ہے اس کی
بھانپ لیتا ہے سبھی اتنا وہ سادہ بھی نہیں

رفتہ رفتہ جو رگ و پے میں اُتارا اُس نے
میں نے وہ زہر مگر جان کے اُگلا بھی نہیں

روک دے جو اُسے آنے سے قسم کھاتا ہوں
راستہ میں کوئی جنگل کہیں پڑتا بھی نہیں

سوچتا ہوں بڑی مدت سے یہی میں شاؔہد
جان لیوا وہ نہیں اور مسیحا بھی نہیں

O

حسیر نوری

وقت کے بے رحم ہاتھوں سے بچا کوئی نہیں
یہ وہ مجرم ہے کہ جس کی ہے سزا کوئی نہیں

آرزوئے خودنمائی مجھ کو لے آئی کہاں
پتھروں کا شہر ہے اور آئینہ کوئی نہیں

اپنی اپنی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں سب یہاں
اس کو کیا کہئے کہ میرا ہمنوا کوئی نہیں

کرب ہے تنہائیوں کا میرے سینے میں مگر
خامشی کا راز کیا ہے پوچھتا کوئی نہیں

مجھ پہ تہمت رکھنے والے شکریہ صد شکریہ
مجھکو اس فکر و نظر سے اب گلہ کوئی نہیں

شوخیٔ الفاظ تجدید وفا ہے اب بھی
اس روش پہ چلنے والا دوسرا کوئی نہیں

ٹوٹ کر میں منتشر سا ہو گیا ہوں اے حسیر
جانتے سب ہیں مگر پہچانتا کوئی نہیں

O

علی آذر

آنکھ سے بہنے کو اشکوں کا سمندر مچلے
مصلحت کہتی ہے کہ ایک نہ آنسو نکلے

پتھر آ آ کے برستے ہیں مری یادوں پہ
بے ردا شہر کی ان گلیوں میں جب شام ڈھلے

رحم آیا نہیں اے شمع فروزاں تجھ کو . . .
کتنے پروانے تیری روشنی پانے کو جلے

جانے کیا کیا ہے رقیبوں نے اڑائی جاناں
تم تو ملتے نہیں، اب کوئی بھی مجھ سے نہ ملے

یا فراوانیٔ زر ہو، یا غریبی بے حد
اس جگہ پاپ کی بنیاد پڑے، جرم پلے

کسی صورت بھی قرار اس کو نہیں ماں کے بغیر
لاکھ بہلاؤں مگر بچہ نہ میرا بہلے

کسی پروانے کا ہے منتظر یارو شاید
دل کا بے چین دیا جانے کیوں دن رات جلے

لٹنے کا غم نہ مناؤ علی آذر اتنا . . . .
ایک تم ہی نہ تھے جو درمیاں اپنوں کے لٹے

O

خاور خان سرحدی

چھپتی خواب ہیں پلکوں پہ سنورنے والے
نیند کی گود سے بچے ہیں اُترنے والے

اوس کے باغ میں خوشبو کا بدن بھیگا ہے
اب وہ سانسوں کے محل میں ہیں ٹھہرنے والے

شب گزیدہ مرا احساس ہوا ہے روشن
رات کے زینے سے اب دن ہیں اُترنے والے

اپنی تحویل میں رکھتے ہیں ہزاروں طوفاں
پھول شبنم کے خزاں سے نہیں ڈرنے والے

بخشدے پھر مجھے تو اپنی ادا کے جلوے
روح کے آئینہ خانے میں سنورنے والے

o

سیف الرحمن سیفی

آ ملی خستگی جب ہجر کی اُفتاد کے ساتھ
کیا کہوں کیا ہوا مجھ خانماں برباد کے ساتھ

گفتگو کرنے مرے ساتھ بہت دیر تلک
کون آ جاتا ہے چپکے سے تری یاد کے ساتھ

مجھ کو مسمار کریں آپ مگر دھیان رہے
کتنے پیوستہ ہیں پتھر مری بنیاد کے ساتھ

ایک آزاد ریاست کے لیے ہجرت میں
ظلم کیا کیا نہ ہوا تھا مرے اَجداد کے ساتھ

آخری عمر میں بہتوں کو رُلا دیتی ہے
اِس قدر خوش نہ ہو تُو بیٹھ کے اولاد کے ساتھ

شعر کہہ لیتے ہیں موزوں یہ بہت ہے ہم کو
اور تقطیع بھی کر لیتے ہیں اعداد کے ساتھ

حرف شکر ہیں مرے اور قلم تیغ مری
میں کہ لڑ سکتا ہوں سیفیؔ ستم ایجاد کے ساتھ

o

بھگوان داس اعجاز
(دلی بھارت)

زمانے کی ہم نے جو تصویر پائی
کبھی آنکھ روئی کبھی مسکرائی

مرے گھر میں جو آگ تم نے لگائی
وہ اپنے ہی اشکوں سے ہم نے بجھائی

وہ عزت وہ اوقات رہنے دے بھائی
گرا کر اٹھائی اٹھا کر گرائی

چلی آ رہی ہیں زمانے کی رسمیں
کہ ہوتی رہی پریت کی جگ ہنسائی

نہیں اپنی نیت پہ کوئی بھروسا
جہاں اُن کو دیکھا وہیں ڈگمگائی

جب کھل گئی بے وفائی کسی کی
دلیلوں سے دینے لگے وہ صفائی

میری آرزوؤں کے اجالے مٹے جب
تیری یاد نے زندگی جگمگائی

پُریدہ ہے زخموں سے اعجاز کا دل
کھڑا تیرے در پہ وہ دیتا ہے دہائی

O

انور جاوید ہاشمی

دل کہیں' ذہن کہیں' آنکھ اُدھر بات کہیں
رہنے پاتے ہیں کہیں!ایک سے حالات کہیں؟

اُس نے پوچھا ہے مرا حال بتاؤں کہ نہیں
میری مشکل ہے بھڑک جائیں نہ جذبات کہیں

صاحب انجمن ہوا جائے تو تعبیر ملے
خواب کے واسطے کافی ہوئی اک رات کہیں

شعر سننے کے لیے حوصلہ رکھنا ہو گا
قافیہ تنگ نہ ہو جائے اے حضرات کہیں

آج کے دور میں دشوار ہے لکھ دینا غزل
استعارہ ہے کہیں اور علامات کہیں

O

کاوش پرتا پگڈھی (انڈیا)

وہ پھیلا ہے تو دریا ہو گیا ہے
سمٹ جانے پہ قطرہ ہو گیا ہے

وہ اک بدمست چیتا ہو گیا ہے
بدن جب سے سیانا ہو گیا ہے

اسے کہتا ہے باتونی زمانہ
وہ گھر پہنچا تو گونگا ہو گیا ہے

ابھی ہم ہیں جوانی کے سفر میں
ہمارا بچہ بوڑھا ہو گیا ہے

جسے دنیا پیمبر مانتی تھی
عدالت میں وہ جھوٹا ہو گیا ہے

اکھاڑو جڑ سے اُس بوڑھے شجر کو
گدھوں کا وہ بسیرا ہو گیا ہے

کہاں تک موند کر آنکھیں چلیں ہم
کہ سارا شہر ننگا ہو گیا ہے

ابھی ہوں بطن مادر ہی میں لیکن
مری قسمت کا سودا ہو گیا ہے

نہ رادھا ہے نہ گھر میں رُکمنی ہے
کنہیا اب اکیلا ہو گیا ہے

ہمیں ہی حق نہیں اپنے بدن پر
امیروں کا کھلونا ہو گیا ہے

بہت محتاط تھا لکھنے میں کاوش
فسانہ پھر بھی لمبا ہو گیا ہے

O

پروفیسر غفار بابرؔ

دلِ آزار کو تیرے لئے زنجیر کرتے ہیں
تیری زلفِ رسا کو یُوں بھی ہم تسخیر کرتے ہیں

"حقیقت" کو ہم "افسانہ" کبھی ہونے نہیں دیتے
ہم اپنے خواب کو بھی خواب کی تعبیر کرتے ہیں

کسی کے "کہنے سُننے" پر رقم کچھ بھی نہیں کرتے
جو اپنے جی میں آتا ہے وہی تحریر کرتے ہیں

ہمیں اُن شاعروں کی سوچ پہ کچھ سوچنا ہوگا
"نوائے صبح" کو جو "نالۂ شبگیر" کرتے ہیں

کچھ ایسے باغباں تخریب کاری میں ملوث ہیں
"چمن" میں "گُل" کو جو آمادۂ شمشیر کرتے ہیں

ہمیں "رانجھا" بنا دیتا ہے جب "ذوقِ جمال" اپنا
بنا کر "حُور" کو بھی جھنگ کی ہم "ہیر" کرتے ہیں

ہمیں اپنے وطن کی خاک سے اتنی محبت ہے
کہ ہم اس "خاک" کو بھی خاک سے "اکسیر" کرتے ہیں

نکل آتا ہے خود تصویر کے پردے سے یار اپنا
"تصور" "آئینۂ دل" میں جب ہم "تصویر" کرتے ہیں

بدل دیتے ہیں بابرؔ ہم خراج اپنے مقدر کا
بدلنے کے لئے "تقدیر" جب "تدبیر" کرتے ہیں

O

شارق بلیاوی

وقت پہ سر کو جھکانے کا ہنر جانتے ہیں
کیسے طوفان سے بچتا ہے شجر جانتے ہیں

دلِ غم خوردہ تری تلخ نوائی ہے بجا
آگ جلتی ہے تو اُڑتے ہیں شرر جانتے ہیں

درد کا سیل رواں تجھ سے بھلا کیا رُکتا
تیری مجبوری بھی اے دیدۂ تر جانتے ہیں

ہم تو پڑھ لیتے ہیں آنکھوں سے حقیقت دل کی
کیسی ہوتی ہے محبت کی نظر جانتے ہیں

تجھ کو منظور نہیں ہم تو بتا جائیں کدھر
ساری دنیا میں فقط تیرا ہی در جانتے ہیں

آنسوؤ تم میں چمک کم تو نہیں پر یہ لوگ
آب کے قطرۂ جامد کو گہر جانتے ہیں

دھوپ کرتے ہیں کشید اپنے غمِ ہستی سے
رات کو دن میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں

O

شگفتہ نازلی

کیا آپ نے انہیں کہا احساں نہ کیجئے
پھر کیا ہے کیا نہیں سُنا' احساں نہ کیجئے

ہوتا ہے کچھ تو وصف جو حرفوں میں ڈھلتا ہے
اپنے دیباچے کا ذرا' احساں نہ کیجئے

آتا تھا آپ کو کسی مد میں یہاں ضرور
دیکھیں مزاج پُرسی کا' احساں نہ کیجئے

دل کی بھڑاس تو بہت احسن نکال لی
اب معاف ہو کہا سُنا' احساں نہ کیجئے

سارے ہی کام ہو چکے مرضی سے آپ کی
رہنے دیں کار لاتعلق' احساں نہ کیجئے

جتلائیے اُسے جو ہو لاعلم آپ سے
سو اس خلوصِ خاص کا' احساں نہ کیجئے

اب خیر خواہی کی بھلا تعریف کیا کریں
ہر درد لادوا رہا' احساں نہ کیجئے

کیسا ہی اختلاف ہو سُن پاتے ہیں کہاں
دیکھا ہے ظرف و حوصلہ' احساں نہ کیجئے

سکریٹ سارا نازلی اُس کا اُڑا لیا
آئے گا نام خاص سا' احساں نہ کیجئے!

O

امتیاز احمد دانش

(اردو بازار، بھارت)

ہم اسے دیکھ کر بہت روئے
بے کفن لاش پر بہت روئے

کر گیا کوچ اس جہاں سے وہ
ملتے ہی یہ خبر بہت روئے

مدتوں بعد جب ملے ان سے
رکھ کے شانے پر سر بہت روئے

شہر نو میں کہیں اماں نہ ملی
چھوڑ کر اپنا گھر بہت روئے

کتنے خانوں میں بٹ گیا چہرہ
آئینہ توڑ کر بہت روئے

بے سبب گھر میں شور تھا دانش
ماجرا دیکھ کر بہت روئے

○

فیصل عظیم

دل تو اب تک ضد پہ اڑا ہے
سر تھوڑا سا جھکنے لگا ہے

اب آپے سے باہر کیوں ہو؟
پیمانہ لبریز ہوا ہے؟

اب کے نشہ دیر میں ٹوٹا
اور بدن اب ٹوٹ رہا ہے

میں تو جنگل میں ناچا تھا
اس کا اب احساس ہوا ہے

کوئی مجھے کیا ضائع کرتا
میرے پاس رکھا ہی کیا ہے

میں اس موڑ پہ کیسے آیا!
یہ تو وہی سیدھا رستہ ہے

میں بھی جوش میں بول رہا ہوں
وہ بھی پیار سے دیکھ رہا ہے

○

نوید سروش

دوڑتا جانب منزل ہر اک انجان ملا
راہ میں جو بھی ملا بے سر و سامان ملا

پیار میں ہم نے جسے پھولوں کے تحفے بھیجے
اُس کی جانب سے ہمیں میر کا دیوان ملا

رات تصویر نے پھر کر دیا زخموں کو ہرا
بعد مدت کے تصور میں کوئی آن ملا

رم کیا صحرانوردی کی ابھی زندہ ہے؟
جو بھی رستے میں ملا چاک گریبان ملا

وقت نے کتنے بدل ڈالے جنوں کے معیار
خالی آشفتہ سروں سے ہمیں زندان ملا

شہر بھر نے ہمیں جس کے لیے دیوانہ کہا
شہر بدری کا اُسی سے ہمیں فرمان ملا

بھوک اُگنے لگی جب گاؤں کے کھیتوں میں سروش
دوڑتا شہر کی جانب ہر اک انسان ملا

○

حسن عباسی

مرتی ہوئی زمیں کو بچانا پڑا مجھے
بادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے

وہ کر نہیں رہا تھا مری بات کا یقیں
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے

اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

بھولے سے میری سمت کوئی دیکھتا نہ تھا
چہرے پہ ایک زخم لگانا پڑا مجھے

یادیں تھیں دفن ایسی کہ بعد از فروخت بھی
اُس گھر کی دیکھ بھال کو جانا پڑا مجھے

اُس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار
کل آئینے پہ ہاتھ اُٹھانا پڑا مجھے

ایسے بچھڑ کہ اُس نے تو مر جانا تھا حسنؔ
اُس کی نظر میں خود کو گرانا پڑا مجھے

○

پرویز ساحرؔ

اور تو کیا' اے خُدا! درکار ہے
مجھ کو بس تیری رضا درکار ہے

کوئی خود سا دُوسرا درکار ہے
آئنے کو آئنہ درکار ہے

ہم چراغوں کو فضائے حبس میں
سانس لینے کو ہوا درکار ہے

کچھ بھی اِس دُنیا میں ناممکن نہیں
اِک ذرا سا حوصلہ درکار ہے

ہم کو بھی لیکن ولیؔ کے یار سا
کوئی یارِ دل رُبا درکار ہے

مَیں کہ ساحرؔ اِک سخن ور ہُوں' مجھے
کچھ میسّر سے سِوا درکار ہے

○

مظہر بخاری

رنگ و نور کا جیسے دریا مانگ لیا
رات تو سّنانے نے تارا مانگ لیا

ریزہ ریزہ ہو کے رہے گا جسم میرا
آج تو مجھ کو اُس نے سارا مانگ لیا

پل بھر کو تو بھول گیا مَیں خود کو بھی
کل جب اُس نے مجھ سے رستہ مانگ لیا

حبس زدہ موسم سے تنگ آئے تو پھر
صحنِ بدن میں ایک دریچہ مانگ لیا

اِک مسکان کی خواہش پر ناراض ہے تو
جیسے کسی نے تیرا سراپا مانگ لیا

ابھی تو ہم آزاد نہ ہونے پائے تھے
اُس نے مظہرؔ ہم کو دوبارہ مانگ لیا

○

مسٹر پیٹر

جوگندر پال

''تم شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟''

ہمارے کالج کی سٹاف لسٹ پر پوری ایک درجن عورتوں کے نام تھے' مگر میری صرف سِنگی سے ہی اتنی بے تکلفی تھی..... نہیں' بے تکلفی ہی نہیں' کچھ ہی کچھ میں وہ..... میں اکثر محسوس کرتا..... میرے گلے میں بانہیں ڈالے ہوتی اور مجھ پر جھکتے ہوئے اچانک اپنی سیٹ کی جھٹک پا کر اپنی کرسی کو مجھ سے ذرا اور دور کھینچ لیتی اور میں ہنسنے لگتا تو وہ چوکر پوچھتی' تم اس کیوں رہے ہو؟

اِس وقت بھی مجھے ہنستے ہوئے پا کر اس نے پوچھا۔ ''کچھ کچھ کیوں کئے جا رہے ہو؟''

میری کچھ کچھ اور او نچی ہو گئی۔ ''بس یونہی۔''

''بس یونہی'' اس نے میری نقل اتار کر پوچھا۔ ''آخر تم کسی بالغ کی طرح کب سوچنا شروع کرو گے؟''

''جب بالغ ہو جاؤں گا سِنگی۔'' مجھے معلوم تھا کہ اُسے اوروں کے خودسر بالغ رویوں سے بھی چڑ ہے۔

سِنگی نے میری چائے میں چینی کی دو ٹکیاں گرا کر جو میت کی کر ایک پری قاعت کا سیکھو۔

''زیادہ میٹھی ہوتی ہیں سِنگی۔''

''اور مزہ بھی۔'' بیرے کو اور چائے لانے کو کہہ کر وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''میں کہہ رہا تھا' اب شادی کر لو۔ میں تمہیں دلہن کے لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''سٹوپڈ!'' وہ اپنے جسم کو اونے کپڑوں اور باتوں کو ہمیشہ مجرد کی اصطلاحوں سے ڈھانپ کر رکھتی تھی۔ ''مَیرج کی اِنسٹی ٹیوشن ہمارے جذبۂ رفاقت کی تسکین کے لئے بہت ناکافی ہے خان۔ اِس اِنسٹی ٹیوشن کا یہی رول ہے کہ ہمیں اپنی علاقائی کاروں کا قانونی لائسنس مل جائے.....''

''تو آؤ پھر شادی کئے بغیر ہی.....''

''نان سنس!..... ہم جانور ہیں یا انسان؟ کیا ہم مَیرج اور سیکس کے بغیر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے؟ انسانی تعلقات کا انحصار اس پر نہیں کہ سماج سے لائسنس لے کر ہم پوری ایک صدی جوڑ کر بیٹھے رہیں.....''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں سِنگی ڈیئر' جو کام پل بھر میں ہو سکتا ہے اُسے انجام دینے میں ہم پوری ایک صدی کیوں صرف کریں؟.....''

''نہیں!'' اس نے مجھے ٹوک دیا۔ ''پہلے مجھے اپنی پوری بات کہہ لینے دو.....''

میں بے چینی سے میز کے نیچے اپنی دونوں ٹانگیں ہلا ہلا کر اب اپنے آپ کو فلسفہ کی لیکچرار کی پوری بات سننے کے لئے تیار کرنے لگا لیکن اسی اثنا میں خوش قسمتی سے بیرا چائے لے کر آ گیا۔ ''لو تمہاری چائے آ گئی ہے۔''

اس نے مجھے نظر انداز کر کے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''میں وہ نہیں کہہ رہی ہوں جو تم سمجھ رہے ہو.....''

میں خوش ہو گیا کہ اس نے میری بات کی تو ضیاء کی ہے۔

''تم مردانی لوگ بہت سطحی ہوتے ہو خان.....''

''وہ تو ہے ہی..... '' مگر میں نے ہتھیار ڈالتے ڈالتے خواہ مخواہ پستول کا گھوڑا دبا دیا۔ ''مگر گہرائی کا اب تول بھی تو کسی سطح سے ہی ہو سکتا ہے۔''

''نہیں یار وہ کوئی سے کام مت لو۔'' سِنگی اپنی چائے کے پانی میں دودھ ملاتے ہوئے خوش رنگ ہونے لگی۔ ''تم لوگ دراصل اپنی روح کے وجود سے بے خبر ہو' بس جسم کی بے تکی کھلاوٹ سے ہی جی بہلائے رکھتے ہو۔ تم واقعی بہت سطحی ہو۔ ذرا سوچو بھی تو صرف کے دھرے پر سوچتے ہو' حالانکہ خالص سوچوں کے امکانات عمل سے لاتعلق ہوتے ہیں اور.....'' وہ شاید اپنے کپڑوں میں میری آنکھوں کے گھسنے کی آہٹ پا کر اپنی قمیص کا اوپری بٹن بند کرنے لگی اور اس کا ذہن انسانی تہذیب میں پہناوے کی اہمیت کی طرف مڑ آیا اور وہ خالص سوچوں کے امکانات کو بھول کر بتانے لگی ''خان' انسان بھی اگر جانوروں کی طرح بے لباس رہنے کا عادی ہوتا تو کوئی مہذب مخلوق اُسے بھی اپنے چڑیا گھروں میں بند رکھتی.....''

ایک خیال آنے پر میں اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ ''تم نے پڑھا سِنگی؟ امریکی لوگوں نے ایک بڑا دلچسپ کھیل شروع کیا ہے۔''

''کیا؟ کوئی جسموں کا کھیل؟.....''

اِس نادان فلسفی کو کون سمجھاتا کہ جسموں کے بغیر روحوں کے خدوخال پر بھی نظر نہیں ٹھہرتی۔ ''ہاں' امریکی لوگوں نے ایک تحریک چلائی ہے کہ جانوروں کو بھی انسانوں کی طرح ہر وقت کپڑوں میں نظر آنا چاہیے۔''

''واٹ..... شٹ!''

''ہاں'' میں یہ سوچ کر ہنسنے لگا کہ ہماری سِنگی بھی ایک پیاری سی پالتو بلی ہے جسے کسی معزز امریکی نے ہر جانب سے مخملی ڈھانپ رکھا ہے..... ہا ہا..... میں اور زیادہ ہنسنے لگا..... انسان بھی تو اپنے آپ کو اسی خوف سے ڈھانپ کر رکھتا ہے کہ اس کا حیوان چھپا رہے.....

"بڑا اچھا خیال ہے" ہماری قلفی کے ذہن کو بھاگ دوڑ کے سوا اور کیا ہی کیا ہوتا ہے۔ "لباس کا تصور اسی لئے ہے کہ بقول نجیں خان' کہ ہماری حیوانیت کی ستر پوشی ہوتی رہے۔ اسی لئے ہمارے معزز بن چڑیا گھروں کے ننگے جانور دیکھنے نکلتے ہیں تو اپنی برتری جتانے کے لئے بڑے بڑے سوٹ پہنے ہوتے ہیں...... جانتے ہو کیا؟......" اُس نے چائے کا پیالہ خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ "پچھلے ہفتے میں بھی ریگل زو دیکھنے چلی گئی تھی۔ اس وقت تو مجھے یہ بات قطعاً نہ سوجھی پر کیا خان' کہ ننگے ننگے افریقی بن مانسوں اور عربی گھوڑوں کو دیکھ دیکھ کر میں سارا دن پریشان رہی۔ یقین کرو ایک سیاہ گھوڑا تو...... اب میں تمہیں کیسے بتاؤں؟......"

میں ہنستے ہنستے گویا نڈھال ہو رہا تھا۔

اسی دوران اچانک مجھے یاد آیا کہ آج تو ایکویٹر کلب میں سٹریپ ٹیز شو ہو رہا ہے۔

سٹریپ ٹیز!...... کتنا عجیب نام ہے۔ خوبرو عورتیں مردوں کو ٹیز کرنے کے لئے ناچ ناچ کر اپنے لباس کے سٹریپ اتارتی چلی جاتی ہیں۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ شو شروع ہونے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔

"ستی! مجھے کہیں جانا ہے"

ستی حیرت اور غصے سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"تم تو کہتے تھے کہ ساری شام اکٹھے ہی بسر کریں گے۔"

"ویری سوری ستی! مگر......"

"مگر جانا کہاں ہے؟"

"سٹریپ ٹیز شو......!" میں نے ذرا جھجک کر اُسے بتایا۔

ستی بھی خواہش آمیز جھجک سے میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی۔

"تم......!؟"

"ہاں' کیا یہ حق صرف مردوں کو ہی حاصل ہے؟ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ عیاش عورتیں اپنی عفت کے ٹکڑے اتار اتار کر کیونکر مسکراتی رہتی ہیں......"

"تو چلو!"

جب ہم ایکویٹر کلب کی بلڈنگ میں داخل ہوئے تو وقت سے دس منٹ اوپر ہو گئے تھے۔

ریسپشنسٹ نے مجھے روک لیا۔

"سوری! آپ جیکٹ پہنے بغیر ہال میں نہیں جا سکتے۔"

"ارے بھئی! جانے دو!" مجھے شام کے وقت جیکٹ پہننے میں بڑی الجھن ہوتی تھی۔

"سوری سر! ہماری کلب اسی لئے معزز گنی جاتی ہے کہ ہم اپنے اصول نہیں توڑتے۔"

"معزز!" ستی نے ناک سکوڑ کر میرے کان میں کہا۔ "شیطان بھی معزز ہوتا ہے؟"

"ہاں ستی' آج تمہیں یقین ہو جائے گا کہ دوزخ اور دنیا میں سب سے بڑے اعزاز کا مالک بھی آرچ اینجل ہے۔" پھر میں نے ریسپشنسٹ کو مخاطب کر کے کہا۔ "اوکے! آپ مجھے کلب کا ایک جیکٹ کرائے پر دے دیجیے۔"

"یس سر!"

میں نے جیکٹ پہن لی اور کلب ہال میں داخل ہوتے ہوئے ایک نیم عریاں عورت کو ناچتے دیکھ کر ٹھہر گیا۔

"چلو!" ستی نے مجھے ٹہوکا دیا۔ "آگے بڑھو۔"

اور ہم آگے بڑھ کر ایک کونے میں صوفوں میں دھنس گئے۔

"اوہ!"

ستی نے نیم عریاں ڈانسر کی طرف نظر اٹھائی تو وہ اپنے لباس کا ایک اور سٹریپ اتار کر پرے پھینک رہی تھی۔

"یہ عورت ہے یا......"

"عورت!" میں نے مسکرا کر اُس کا فقرہ پورا کیا۔ "دونوں طرح یہ عورت عورت ہی ہے۔ کپڑے اتار کر عورت مرد تو نہیں بن جاتی۔"

"تو خان' سیکس کا تصور ہی کیا کم گھناؤنا ہے جو اس کی پریڈ بھی کی جائے۔"

"مس' سکینڈلس! مگر اسی لئے تو اتنے لوگ جمع ہیں۔"

"مجھے تو...... یہاں ڈر سا لگ رہا ہے یار!" ستی کے لب و لہجے سے بھی آنسوؤں کے غلاف کے سٹریپ اتر رہے تھے۔

میں نے بیرے کو بلایا۔

"برانڈی اور جنجر ایل دو کے لئے۔"

"میں بھی برانڈی پیوں گی؟"

"نہیں؟"

"نہ بابا' کڑوی ہو گی۔" اُس نے اپنی نگاہ پھر سٹریپ ٹیز پر اٹھا لی۔

"ڈیم نیشن!......"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اُس نے جمائی بھر لی ہے یا نہیں۔

سٹریپ ٹیزرس نے ناچتے ناچتے اپنے بازو ہوا میں لہرائے تو اُس کے لباس کا ایک اور ٹکڑا نیچے آ گرا۔

"کیا یہ عورت آخر میں بالکل ننگی ہو جائے گی خان؟"

"یہ بیچاری ہی کیا؟ آخر میں تو ہم سب بالکل ننگے ہو جاتے ہیں۔"

وہ شاید نہیں سمجھی مگر مجھے لگا ہے کہ وہ ہنس رہی ہے۔

اتنے میں برانڈی اور جنجر ایل آ گئی اور میں ستی کے برانڈی کے گلاس میں جنجر ایل ملانے لگا۔

"نہیں، میں برانڈی نہیں پیوں گی۔" اس نے گلاس پرے کر دیا

"صرف جنجر ایل!"

"تھوڑی سی۔" میں نے پھر ملائم سا اصرار کیا۔ "میری خاطر!....."

ستی نے مسکرا کر گلاس تھام لیا۔

"اِس سٹرپ ٹیز شو میں کچھ آرٹ نہیں۔" ہمارے پہلو کی میز پر ایک انگریز نوجوان اپنی محبوبہ سے کہہ رہا تھا "اِٹ اِز ناٹ آ سِین لَوَر!....."

"ٹو اِن ڈیڈ!"

"پیرس میں ایک سٹرپ ٹیز دیکھی تھی میں نے" انگریز نوجوان بے چینی سی آواز میں بتا رہا تھا۔ "دی کوئین آف سٹرپ ٹیز آرٹ! اُف اسے بھولی فُل بلڈ آپ ٹو ٹوا....."

"بڑی کڑوی ہے" ستی نے جلدی جلدی برانڈی کے گھونٹ بھرے تو سٹرپ ٹیز آرکسٹرا کی دھنیں تیز تیز ہو کر جامے سے باہر آ گئیں۔

"مرد کی ذات بہت بری ہوتی ہے" ستی اپنے وزنی لباس کے باوجود کچھ ہلکی معلوم ہونے لگی تھی۔ "تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"چلو واپس چلتے ہیں۔"

"نہیں، میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں، کیا یہ عورت واقعی اتنی گری ہوئی ہے؟..... اتنے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے سارے کپڑے اتار دے گی؟....."

اِسی اثناء میں تین اور سٹرپ ٹیز ناچتی ہوئی فلور پر اتر آئیں اور اپنی اشتہاری سی تھرکتے گاتے گلوکار کی آواز مزید سرگرم ہو گئی۔

ٹک!
ٹک ایٹ مور وائیٹ لیگرا!
واٹو ونگ بیوٹی!
بر آل وائیٹ لیگرا!
بر.........

"تری بکواس!" پہلو کی میز پر انگریز نوجوان کی محبوبہ نے اپنی ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی کر لیں۔

"ہاں تری بکواس! اگلے سال میں تمہیں پیرس لے جاؤں گا۔ وہ بات یہاں کہاں؟....."

"کیا وہ گانے والا آدمی وہیں کھڑا کھڑا گاتا رہے گا؟" ستی اپنا گلاس خالی کر کے مجھ سے پوچھنے لگی۔

"ہاں۔"

"او.....ہ.....میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہی تھی۔"

"کیا؟"

"کہ یہ بھی گاتے گاتے اپنے کپڑے اتارنا شروع کر دے گا۔" نہ جانے وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

"تمہارے لئے اور برانڈی؟"

"نہیں!"

"ایک اور پلیز!....." میں نے پھر ملائم سا اصرار کیا۔

"سب مرد ننگے ہوتے ہیں۔"

اور میں نے دو اور برانڈی اور جنجر ایل کا آرڈر دے دیا۔

دفعتاً کلب ہال کی بتیاں دھیمی ہونے لگیں اور چاروں سٹرپ ٹیزر تھرک تھرک کر اپنے اپنے پہناوے کے ٹکڑے سرعت سے فرش پر گرانے لگیں اور اُن کے عریاں جسموں پر تھرکتے سایوں میں اُن کی برہنگی کا دور طاری ہو گیا تو مجھے معلوم ہونے لگا کہ انہوں نے اپنی اپنی چمڑی پہن کر اپنے وجود کے ہر حصے کو نہایت احتیاط سے ڈھانپ رکھا ہے۔

"ستی!" برانڈی اور جنجر ایل کا گھونٹ بھرتے ہوئے مجھ سے رہا نہ گیا۔ "آؤ ہم دو ایک ماہ کی ایک چھوٹی سی شادی کر ہی لیں۔"

"وا.....ٹ؟!.....دو ایک ماہ....."

ہال کی مدھم روشنی میں میرے پرامید چہرے پر پرچھائیں پڑ گئی لیکن وہ اپنا گلاس خالی کر کے کہنے لگی۔

"صرف آج" (صرف جنجر ایل!)

اچانک میرے کانوں میں دو چار غبارے پھٹے اور میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ چاروں سٹرپ ٹیز ناچنے کے انداز میں چلتے چلتے ستی کے آس پاس آ کھڑی ہوئی ہیں، اپنے آگے بازوؤں میں ہوا سے بھرے ہوئے رنگ برنگے غبارے لئے ہوئے مادر زاد ننگی! سب تماشائیوں کی نظریں ادھر ہماری جانب ہی ٹک گئیں۔

"اِن میں بھلا سب سے ننگی کون لگ رہی ہے؟" انگریز نوجوان کی محبوبہ نے اپنے بوائے فرینڈ سے سوال کیا۔

"وہ.....!" اس کے بوائے فرینڈ نے ستی کی طرف انگلی اٹھا کر جواب دیا۔ "جس نے اپنے آپ کو اتنا ڈھانپ رکھا ہے۔"

زندگی جاگتی ہے ...... عذرا اصغر

"ارے بجو! بی بی مجھے تو وہ کلو ہوٹل میں چائے پلانے لے جا رہا تھا" ثمن نے ہال کمرے میں داخل ہوتے ہی بلند آواز سے کہا۔ پورا مجمع ثمن بی بی کی طرف پلٹ پڑا۔

"کون تھا ثمی.... کیا ہوا.....؟"

"بی بی میں ویگن سے اتری ادھر موڑ پر سوچ ہی رہی تھی کہ پیدل شروع ہو جاؤں کیونکہ دوسری ویگن آ ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے مارے گھبراہٹ میں ایک کار کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ آگے دو نوجوان مرد بیٹھے تھے۔ انہوں نے گاڑی روک کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ میں سیٹ پر بیٹھ گئی تو کلوا کہنے لگا۔

"آپ بتائیں کس ہوٹل میں چلیں؟"

"ارے بجو! غضب خدا کا۔ پھر تو نے کیا کہا؟"

"میں کیا کرتی۔ میں نے کہا۔ بھیا تم نے غلط سمجھا۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ تیرا بھلا ہو مجھے وہاں اماں بانگا کے موڑ پہ اتار دے۔"

"پھر....؟" بہت سی متجسس آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

"پھر کیا؟ کہنے لگا ہم تو تمہیں صرف چائے پلانا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔ اچھا میں چائے والی نہیں تھی۔ بس تیری مہربانی مجھے اس موڑ پہ اتار دے۔ موڑ پہ اتارتے ہوئے کہنے لگا۔ آئندہ خیر سوچ سمجھ کے کسی کے ساتھ مت بیٹھنا۔ کمبخت میرے بیٹے جیسے تو تھے۔"

ثمن نے چادر تہہ کی اور ستون کے نیچے کھڑی ہو کے پسینہ خشک کرنے لگی۔ سب عورتیں کھسر پھسر کر کے ہنسنے لگیں۔ ثمن کے ساتھ بیتے واقعے پر تبصرہ شروع ہو گیا۔ کسی نے کار والوں کی شرافت کو سراہا۔ کسی نے زمانے کے بگڑتے چلن کو گالیاں دیں اور کوئی ثمن کی حماقت پر تبصرہ کرنے لگی۔ ثمن نے کہا۔

"اے میں تو اکثر کسی نہ کسی سے لفٹ لے لیتی ہوں۔ یہ کمبخت جھاڑو پھرے جانے کس شکار کی تلاش میں تھے۔" اس نے کہا اور بے نیازی سے اونچی کھنکھناتی آواز میں صدا لگائی۔ "نعرۂ صلوٰۃ" درود شریف کے شور کے ساتھ سب عورتیں سروں پہ دوپٹے کے پلو ڈال کے درود پڑھنے لگیں۔ درود پڑھنے والوں میں ثمن کی آواز سب سے نمایاں اور اونچی تھی۔

آئیے میں آپ کو ثمن سے تفصیل کے ساتھ ملواؤں۔

ثمن کا نام شمیم بانو ہے۔ ثمن کسی امیر و کبیر گھرانے کی چشم و چراغ نہیں ہے۔ وہ ایک غربت زدہ خاندان کی فرد ہے۔ اس کو ایک نظر دیکھ لینے سے ہی اس کی اقتصادی حالت اور سماجی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے مگر ثمن ہر محفل کی روح رواں ہے۔ کسی گھر میں شادی کی تقریب ہو یا کوئی غم، ثمن ہر جگہ موجود ہوگی۔ کسی نے مجلس عزا یا میلاد کی محفل منعقد کرنی ہے تو ثمن کی خدمات کا حصول ضروری ہوگا۔ پڑھنے والیوں کا انتظام بھی ثمن ہی کو کرنا ہوگا۔ ثمن ہر خاندان کی مددگار ہے۔ ڈھلتی عمر کی جوان لڑکیوں کے رشتوں کا بار بھی ثمن کے کندھوں پر ہے۔ اس لئے کہ اس کا آنا جانا ہر گھر میں ہے۔ وہ سب کو جانتی پہچانتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جن گھروں میں اس کا عمل دخل اور آنا جانا ہے انہی گھروں کے مرد ثمن کے نام اور وجود سے چڑتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ثمن کوئی بری عورت ہے۔ وہ شاید اس کی متمولیت کو پسند نہیں کرتے جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہے۔ اس کی عمر بمشکل چالیس پینتالیس برس ہوگی مگر بیشتر خواتین اور بالخصوص کم عمر بچے والی خواتین جو عمر میں اس سے صاف بڑی نظر آتی ہیں وہ بھی اسے خالہ کہہ کر پکارتی ہیں۔ ثمن کو اس بزرگی پر کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ وہ ہر حال میں مگن اور صابر و شاکر رہتی ہے۔ وہ پورے دس بچوں کی ماں اور ایک معذور بوڑھے نابینا شوہر کی بیوی ہے۔ وہ کسی سے کچھ مانگتی نہیں مگر کوئی کچھ دے دے تو انکار بھی نہیں کرتی۔ ایک دکھ چھوڑ کے اس کے سارے بچے زیر تعلیم ہیں۔ ایک دن میں نے کہا۔

"ثمن مجھے اپنی کہانی سناؤ"

میری بات سن کے اس نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ جیسے یقین کرنا چاہ رہی ہے۔ حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا لکھو گی؟ چھپواؤ گی؟" اس نے ہاتھ کو قلم کی پوزیشن میں لا کر لکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

میں سوچ میں پڑ گئی۔ سنبھل کر بولی۔

"اچھی لگی تو لکھوں گی بھی اور چھپواؤں گی بھی۔ تمہیں کوئی اعتراض ہوگا؟" وہ ہنسی۔

"تو میری کہانی بھلا کون پڑھے گا؟"

"تمہیں کیا پتہ" میں نے پوچھا۔

"کہانیاں تو عذرا بی بی رنگین ہوتی ہیں۔ خوبصورت خوبصورت ملکہ رانیوں کی۔ راجاؤں کی۔ عشق محبت کی۔ ہم سے جیسے لوگوں کی کہانیوں میں بھلا کیا دھرا ہے۔ غربت افلاس رونا پیٹنا۔ جن کے پیدا ہونے پر نہ کسی کو خوشی ہوتی ہے اور مر جائیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس دنیا کے وجود پر ایک بوجھ ہیں ہم تو۔ ہم سے تو کہیں بہتر امیروں کے پالتو........"

"ارے ثمی تم تو فلسفہ بولنے لگیں۔ تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی تو جانے دو۔ معاف کرو۔ شاید میں نے تمہیں دکھی کر دیا۔" میں شرمندہ ہو گئی۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہی ہوں میری زندگی میں ایک گھڑی بھی تو رنگین نہیں ہے تمہیں یا کسی کو میری داستان سن کر کیا خوشی ہوگی۔ کیا ملے گا؟ پھر خواہ مخواہ رنجیدہ ہونے سے فائدہ؟"

"کبھی کبھی کسی کا غم بانٹ لینے سے بھی زندگی میں رنگ بھر جاتا ہے

کم از کم تمہارے دل کا بوجھ کچھ کم ہوگا" میں نے کہا "صاحب کچھ تو بتائیے"

"اچھا!" وہ تعجب سے بولی "ہاں شاید تم سچ کہتی ہو۔ بعض مرتبہ ہمدردی کا ایک لفظ بہت سے دکھ ختم کر دیتا ہے" وہ مسکرائی۔

"تو بی بی میں جب پاکستان آئی تو جانے کتنی بڑی تھی۔ پاکستان میرے سامنے بنا تھا مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ جو باتیں دوسروں سے سنی ہیں وہ یہ ہیں کہ اماں تو راستے میں ہی کہیں مر کھپ گئی تھیں۔ ابا نے مجھے بہ دوری کے ایک جاننے والے خاندان کے سپرد کر دیا۔ میں وہیں پلی بڑھی۔ ابا ان کے سپرد کر کے ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہ آئے۔ جانے مارے گئے یا میری ذمہ داری کو اپنے گلے سے اتار کے نیا گھر بسا لیا۔ میں ان کی پہلی پہلی تو اولاد تھی۔ خیر! جب میں تیرہ چودہ برس کی ہوئی تو میرے محسنوں نے ایک معمولی آدمی کے ساتھ میرا نکاح کر دیا۔"

"اتنی چھوٹی عمر میں؟" مجھے تعجب ہوا۔

"ہاں چھوٹی عمر میں۔ نہیں اپنی عزت جو بچانی تھی۔ اپنا خاندانی وقار سنبھالنا تھا" وہ بولی۔

"مگر تمہاری چھوٹی عمر کی شادی کے بیچ ان کی عزت کہاں سے آگئی؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بی بی! ان کا بھرا پرا خاندان تھا۔ کل کلاں کو ان کے گھر کا کوئی لڑکا میرا ہاتھ پکڑ کے کہتا۔ اماں میں اسے چاہنے لگا ہوں۔ میں تو اسے اپنی جورو بناؤں گا تو بتاؤ اماں تو دو کوڑی کی نہ رہتیں۔ بھلا کسی فضا لی گیری؟ جس کا آگا نہ پیچھا۔ لے پالک لونڈیا کو کیسے وہ اپنی بہو بنا لیتیں؟ خاندانی وقار کا جنازہ نہ نکل جاتا؟ وہ جنہوں نے مجھے پالا تھا۔ تکلف ورنہ سے رکھ رکھاؤ کی بی بی تھیں۔ ادھر میں نے جوانی میں قدم رکھا اور ادھر انہوں نے میرے دو بول پڑھا دیئے" وہ لمحہ بھر کو رکی۔ جیسے برسوں کا بوسیدہ پردہ کھسکا کے کچھ دیکھ رہی ہو۔ کچھ ٹٹول رہی ہو۔ میں چپ رہی۔ کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولی۔

"جس آدمی کے پلے مجھے باندھا گیا تھا وہ ریلوے میں کانٹا بدلنے والا تھا اور اس کا گھر وہیں ریل کی پٹریوں کے پار تھا۔ گھر کیا تھا۔ ایک جھونپڑا کہہ لیں۔ کچی دیواریں۔ بلکہ نہیں دیواریں کہنا غلط ہوگا۔ بس برائے نام چار دیواری کھینچ کے ایک رکاوٹ بنالی گئی تھی۔ یا گھر کا تصور پیدا کر لیا تھا"

"ہاں میں کچھ گئی" میں نے اس کے قصے میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"اس چار دیواری کے اندر ایک کوٹھڑی ہمارا کل اثاثہ تھا۔ اس میں ایک جھلنگا پلنگ تھا اور اس پر گودڑ کے کام کا ایک بستر...... مٹی کی سڑی سی ہنڈیا۔ سلور کی ایک پچکی ہوئی پلیٹ، پانی پینے کے لئے ایک گدلا سا پیالہ اور بس۔ میرے مہربانوں نے چار جوڑے کپڑے اور دو چار برتن، ایک بستر مجھے رخصت کرتے وقت دیا تھا۔ میں جس گھر میں پلی بڑھی تھی وہ لٹے پٹے مہاجروں کا گھر ہونے کے باوجود ایک منظم گھر تھا۔ اس گھر کی ایک تہذیب تھی۔ تمدن تھا اور تشخص تھا۔ میں وہاں رہ کر چار لفظ پڑھ گئی تھی۔ مجھے زندگی بسر کرنے کا ایک طرح شعور آگیا تھا۔ کچھ خواب میری آنکھوں کی پلکوں پر تھرتھرائے تھے۔ میری پتلیوں میں چکو چکے تھے" اس نے ٹھہر کر ایک گہرا سانس کھینچا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"افضل کے گھر آ کر در و دیوار کو میں نے وحشت سے دیکھا اور صبر کا کڑوا گھونٹ پی کے شکر کرلیا۔ یہی میرا مقدر تھا۔ مجھے افضل کی غربت کا گلہ شاید نہ ہوتا مگر اس کی عیاشی کے آگے میں حوصلہ ہار گئی" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے۔

"افضل عیاش تھا؟" میں نے پوچھا۔

"تھوڑا بہت؟ پیٹ بھر کے۔ اسے جوا کھیلنے کی لت تھی۔ چھٹی کے اوقات میں وہ جوا کھیلا کرتا تھا۔ ایک دن ابھی وہ گھر نہیں آیا تھا کہ اس کا ایک دوست میرے گھر کی کچی دیوار پھلانگ کے گھر میں داخل ہوا۔ رات ایک پہر گزر چکی تھی لیکن میں ابھی جاگ رہی تھی۔ اس کے کودنے کی آواز سن کر میں نے سوچا کہ افضل آیا ہے۔ پلنگ پہ لیٹے لیٹے اونچی آواز میں کہا۔

"یہ دیوار کود کے گھر میں داخل ہونے کا کیا طریقہ ہے؟"

"آنے والے نے کوئی جواب نہیں دیا اور کوٹھڑی میں داخل ہو کر دروازے کی کنڈی چڑھائی اور دوسرے پلنگ پہ بیٹھ کر بولا۔

"سوہنا بہت گا نہیں۔ مال اچھا ہی رکھتا ہے"

اجنبی آواز پہ میں نے چونک کر دیکھا اور لالٹین کی بتی اونچی کی "کون ہو تم؟" کڑک کے میں نے پوچھا مگر اندر سے میں منجمد ہو رہی تھی۔ اپنے ڈر کو میں بمشکل چھپا سکی۔

"میں؟ تم مجھے نہیں پہچانتیں" اس نے تعجب سے کہا پھر بولا۔

"ہاں تم کیسے جانو گی۔ میں وہ ہوں جس کے ہاتھوں افضل نے آج تمہیں ہارا ہے" وہ ہنسا۔ میں تو اس کا جملہ سن کے شل ہوگئی مگر ہمت کو برقرار رکھا۔ میں آنگنی سے پلنگ سے اٹھی اور کوٹھڑی کی کنڈی کھول کے بھاگ پڑی۔ میں کس طرف جا رہی تھی؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔ نہ راستہ جانتی تھی اور نہ منزل کا پتہ تھا۔ بس میں دوڑ رہی تھی۔ بے سمت۔ کچی چھپلی بہت دور تک اپنے پیچھے مجھے کسی کے بھاگنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر کچھ یاد نہیں۔ ادھر کے آگئی مگر رات کا وقت، اندھیرا سناٹا اور میں اکیلی عورت، اور شیطان میرے تعاقب میں۔ گویا شکاری شکار پہ جھپٹ رہا تھا اور شکار جان بلکہ عزت بچانے کو پناہ کی تلاش میں تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں ایسی جگہ آن پہنچی جہاں کچھ دکانیں ابھی کھلی تھیں۔ مجھے ذرا تسلی ہوئی۔ چلتے چلتے ایک آدمی سے میں نے اپنے سابق مہربانوں کا پتہ پوچھا اور پھر دوڑ پڑی اس کے بتائے ہوئے راستے پر۔ غرض جب میں اپنے اس گھر پہنچی تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ اماں شاید نماز پڑھنے کے لئے اٹھ چکی تھیں۔ میں نے دروازے کی کنڈی بجائی اور لمحہ بھر میں دروازہ کھل گیا۔

اماں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ حیرت سے بولیں "تو؟" ان کا ادھورا فقرہ میں نہ سن سکی۔ بس اتنا یاد ہے کہ دروازہ کھلتے ہی میں اندر منہ کے بل گری تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی شاید ...... " کچھ دیر تک نہ وہ کچھ بول سکی اور نہ میں کچھ پوچھ سکی۔

دونوں جانب قطعی خاموشی رہی۔ ہمارے سانسوں کی آوازیں بھی معدوم ہو گئی تھیں۔ ایک لمبے توقف کے بعد اس نے پھر سلسلہ کلام شروع کیا۔

"فضل دو مرتبہ مجھے لینے آیا مگر میں نے اماں سے کہہ دیا کہ میں کچھ بھی کر لوں گی۔ کسی کے گھر کے برتن مانجھ لوں گی مگر اب اس کے گھر واپس نہیں جاؤں گی۔ میرے منہ بولے ماں باپ طلاق کے جھنجھٹ میں پڑنے کو تیار نہ تھے اور میں واپس جانے پر راضی نہ تھی۔ حالات بڑے کشیدہ تھے۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرے محسن میرے وجود کو بوجھ محسوس کر رہے ہیں اور وہ کسی بھی وقت مجھے کہہ سکتے ہیں کہ "بی بی اپنا انتظام کرو"

وہیں ہمارے محلے میں ایک غریب لیکن پڑھے لکھے مہذب میاں بیوی رہتے تھے۔ جنہیں سب لوگ بھائی میاں کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ لاولد تھے اور اپنے نہایت چھوٹے سے گھر کی ڈیوڑھی میں پرچون کی مختصر سی دکان سے اپنا رزق کماتے تھے۔ کچھ ہی دن پہلے ان کی بیوی بھی انہیں اکیلا چھوڑ گئی تھیں۔ بڑے دیندار بزرگ تھے بھائی میاں۔ ایک روز میں ان کی بیوی کی تعزیت کرنے ان کے گھر چلی گئی۔ باتوں باتوں میں میرے حالات کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے

"تم زیادہ فکرمند نہ ہو۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ اللہ بہتر کرنے والا ہے"

پھر انہی کی کوششوں کے نتیجے میں فضل سے میری طلاق ہوئی۔ مگر اب مسئلہ یہ آن پڑا کہ اب میں کیا کروں گی؟ کہاں رہوں گی؟ بھلا زندگی کیسے بسر ہو گی؟"

بھائی میاں میرے محسن تھے۔ وہ بہت ہی آڑے وقت میں میرے کام آئے تھے۔ اب میں اپنے ہر معاملے میں ان سے ہی مشورہ کیا کرتی تھی۔ نہیں معلوم تھا کہ میرے محسن مجھے برداشت نہیں کر پا رہے۔ وہ مجھے تسلی دیتے رہتے۔ اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے۔ ایک دن جب میں بہت مضطرب تھی میں ان سے اپنی مشکل کا ذکر کر رہی تھی اور وہ خاموشی سے سنے جا رہے تھے تبھی یکدم گردن جھکا کر دھیرے سے بولے "شمیم بانو بی بی! میں نہیں جانتا مجھے یہ بات کہنی چاہئے یا نہیں۔ اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ اس بات کا تمہارے اوپر کیا ردعمل ہو گا لیکن یقین کرنا یہ بات میں بغیر کسی لالچ کے اور پورے خلوص کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں کسی لحاظ سے بھی تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تاہم یہ میری مخلصانہ پیش کش ہے اگر تم منظور کرو"

لمحہ بھر کو میں ان کا منہ تکتے حیران رہ گئی۔

بھائی میاں گردن جھکائے میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب سی معصومیت اور خفت طاری تھی۔ بڑی مشکل سے میں بول سکی۔

"بھائی میاں ...... وہ ......!"

"میں جانتا ہوں شمیم بی بی میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ مگر یقین کرو اس پیش کش میں میری ذاتی غرض کو ہرگز دخل نہیں ہے"

"نہیں بھائی میاں آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ مجھ جیسی بدبخت آپ کے ......" وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے منہ کو اپنے ہاتھ سے بند کرتے ہوئے بولے

"شمیم بانو جاؤ تم اپنے گھر جاؤ۔ میں کسی مناسب وقت پر سید صاحب سے خود بات کر لوں گا" یہاں تک پہنچ کے وہ چپ ہوئی اور مسکرا کر بولی۔

"عذرا بی بی! اب وہی بھائی میاں میرے شوہر اور میرے بچوں کے باپ ہیں۔" شمیم کہتی رہی۔

"گھر کی ڈیوڑھی میں ان کی پرچون کی چھوٹی سی دکان تھی۔ گزر ہو جاتا تھا۔ پھر بچے ہونا شروع ہوئے تو لاولد بھائی میاں کا گھر فرزندوں کے نور سے بھر گیا۔ گھر میں بہار اتر آئی۔ ننھی منی کلکاریوں سے در و دیوار گونجنے لگے۔ وہ بہت خوش تھے اور میں بھی۔ دکان میں ہم نے کچھ اور اضافہ کر لیا تھا۔ وقت اطمینان سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ مگر پھر ان کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا اور وہ نابینا ہو گئے۔ اور ہمارا کاروبار بھی مندا پڑ گیا۔ ماشاءاللہ دس بچوں کا خرچ اور مہنگائی کا یہ زمانہ ......؟"

"شمیم تم نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس دور اور ان حالات میں تم بچوں کی پلٹن بنا رہی ہو؟" میں نے تحیر آمیز لہجے میں اس سے کہا۔

"تم سچ کہتی ہو عذرا بی بی۔ میں نے ناعاقبت اندیشی کی۔ مگر مقدر میرے بس میں ہوتا تو جانے کب کا چمکا کے اپنے اندر اجالا کر چکی ہوتی۔ یہ سب تو قسمت کے چکر ہیں۔ ہم غریب نادار لوگ تو زمین کا بوجھ ہیں۔ یوں بھی ہمارے خالی پیٹوں سے امیروں کی جھولیاں بھرتی ہیں۔ اور ہمارے ان گھڑ ہاتھوں سے ہی تاج محل تعمیر ہوتے ہیں۔ ہم ترسے ہوئے لوگوں کی دولت یہ اولاد ہی تو ہے"

میں بیٹھی خالی خالی نظروں سے شمیم کو تکتی رہی۔ اس نے اپنے کپڑے کے تھیلے سے پانوں کی ڈبیہ نکالی۔ ایک پان میری طرف بڑھا کے مسکرائی اور بولی۔

"لو پان کھاؤ عذرا بی بی۔ زیادہ فکر نہ کرو ہاں۔ دولت، عزت، شہرت کا گھوڑا دوڑتے دوڑتے کیا پتہ کبھی میرے دروازے پر بھی آن رکے۔ میرا بڑا بیٹا خیر سے انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے۔ اور اس سے چھوٹا ......"

بکائین کی کہانی

انور زاہدی

بکائین درحقیقت نیم ہی کی ایک قسم گنی جاتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ یہ اس پیڑ رو ہے کہ بکائین کا درخت اپنے قد و قامت میں نیم کے درخت کے مقابلے میں قدرے چھوٹا ہوتا ہے لیکن نیم ہی کی طرح سرسبز گھنا اور سایہ دار۔ ساون کی رت کے آتے ہی جہاں نیم میں نمبولیاں نظر آنے لگتی ہیں ...... وہاں بکائین کے چھوٹے سے درخت میں بھی نمبولیوں کے گچھے انگوروں کی مانند لٹکے نظر آتے ہیں ...... نوجوان لڑکیوں کا گایا ہوا گیت ...... کچے نیم کی نمبولی ساون جلدی آئیو رے ...... ساون رت کی کالی گھٹاؤں کے آسمان پہ چھانے کے ساتھ ہی فضا میں گونجنے لگتا ...... مجھے بکائین کے درخت کو دیکھتے ہی نذر علی یاد آنے لگتا ...... جو ہمارے گھر کے چھوٹے سے لان اور پودوں کی دیکھ بھال کے لئے بطور مالی ہفتے میں تین دن آیا کرتا تھا۔

والدہ کے انتقال کے بعد سے کئی بار سوچا تھا کہ کسی اتوار کے دن نذر علی کو اپنے ساتھ قبرستان لے جاؤں گا اور والدہ کی قبر پہ بکائین کا پودا لگوا دوں گا۔ مجھے یہ پودا کئی وجہ سے پسند تھا۔ ایک تو نیم جیسا ہونے کے باوجود قد میں چھوٹا اور دیکھنے میں خوبصورت۔ دوسرے چھوٹا ہونے کے باوجود سایہ دار بھی اور برسات کے موسم میں اس میں نیم ہی کی طرح نمبولیاں بھی گچھوں کی صورت میں لگی نظر آتیں ...... ایک اور وجہ جو اسے پسند کرنے کی تھی وہ یہ کہ امی کو یہ درخت ہمیشہ اچھا لگتا اور اسی کی مناسبت سے برسات کے موسم میں وہ اکثر بچپن میں ساون کے گیت سنایا کرتیں ......

آج اتوار کا دن تھا ...... اور نذر علی نے صبح ہی مجھے ناشتے کے بعد والدہ کی قبر پہ بکائین کا پودا لگانے کے بارے میں یاد دلاتے ہوئے قبرستان چلنے کو کہا تھا۔

"سر جی ...... آپ یہاں کسی ایسے ہسپتال سے واقف ہو گئے جس میں نفسیاتی مریضوں کا شعبہ ہو"

کار چلاتے ہوئے میں نے ایسے چونک کر برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نذر علی کی طرف دیکھا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو اور وہاں میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا انسان نہ ہو کوئی غیر مانوس مخلوق ہو۔ دراصل ہم شہر کے رہنے والے ایک ایسے نفسیاتی عارضے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ہم خود کو تو مسٹر نو آل سمجھتے ہیں اور شہر کے نسبتاً سستے علاقوں میں رہنے والوں کو لوئر مڈل کلاس کہہ کر حقیر گردانتے ہیں اور شہر سے باہر کے مضافات یا دور افتادہ دیہاتوں کے باسیوں کو انسان ہی نہیں گردانتے ...... محض اس لئے کہ وہ شہری سہولتوں سے محروم ہوتے ہیں ......

یعنی ہماری دانست میں اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ وہ ہم سے ہمارے لائق کوئی بات بھی کر سکیں۔ چہ جائیکہ برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نذر علی نے مجھ سے ایک ایسا سوال کر ڈالا تھا ...... جس پر میں ششدر تھا۔

نذر علی جو ہمارے گھر کے چھوٹے سے لان اور پودوں کی نگہداشت اور پرداخت کے لئے بطور مالی ہفتے میں تین دن آیا کرتا تھا ایک سیدھا سادا دیہاتی تھا۔ قد کا ذرا دبلا پتلا سانولی رنگت کا پچیس تیس برس کا جوان تھا جس کے چہرے پر چمکتی ہوئی آنکھیں اس کی ذہانت کی چغلی کھاتی تھیں۔ اس کی شکل صورت میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جو قابل توجہ ہوتی ...... اور نذر علی جو کبھی کیاریوں کو درست کر رہا ہوتا ...... کبھی گملے میں نیا پودا لگا کر اس میں مٹی کو برابر کرنے میں مشغول ہوتا ...... یا کبھی گھاس میں سے خودرو جنگلی جڑی بوٹیوں کی صفائی میں مصروف ہوتا ...... اپنے کام کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو جاتا۔

"سر جی ...... اللہ کا شکر ہے ...... آپ سنائیں کیسے ہیں ......؟ آج بہت دنوں بعد نظر آئے ......"

عام طور سے دفتروں اور گھروں میں کام کرنے والوں کا ساتھ دفتری قسم کے لوگوں سے رہتا ہے اس لئے وہ بھی آہستہ آہستہ اپنی گفتگو میں بتدریج ایک دیہاتی ٹچ کی جگہ اپنے لہجے اور الفاظ کو گفتگو میں ضم کر لیتے ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ شہریوں کے ساتھ گزارا کرنے والے سادہ لوح انسان بھی آخر کار ریاکاری کے ملمع سے خود کو نہیں بچا پاتے اور ہم انہیں مہذب کہنے لگتے ہیں ...... مگر اس کا اپنے کام میں دل لگا کر اپنے ارد گرد سے بے خبر غافل ہوئے رہنا ایک ایسی ادا تھی جس نے مجھے کئی مرتبہ اس سے بات چیت کرنے پر آمادہ کیا۔

"تمہارا نفسیاتی مریضوں سے کیا تعلق ہے؟"

بجائے اس کے سوال کا جواب دینے کے میں نے احساس برتری دکھاتے ہوئے اپنے گھٹیاپن کا ایک ثبوت دے دیا تھا۔

"وہ سر جی ...... میں دراصل اپنی بیماری کی وجہ سے پوچھ بیٹھا تھا ...... کہ شاید آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکیں ......"

ایک مالی کا کام کرنے والے لڑکے کو بھلا ایسا کونسا عارضہ لاحق ہو سکتا ہے جس کے لئے اسے کسی نفسیاتی معالج کی ضرورت پیش آ جائے ...... یہ نفسیاتی بیماریاں تو بس شہر میں رہنے والوں ہی کا مقدر ہوتی ہیں ...... ایک بار پھر مجھے اپنے شہری ہونے کا خیال آ گیا تھا مگر پھر ساختہ بھری شفقت جتاتے ہوئے میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"نذر علی ...... کیا مرض ہے تمہیں ...... کچھ بتاؤ تا کہ ہم بھی جانیں ......؟"

یعنی اس سوال میں بھی جہاں ایک طرف نذر علی پہ احسان جتانے کی کیفیت نمایاں تھی ...... وہیں دل میں چھپی ہوئی یہ خواہش بھی کہ ذرا دیکھیں تو آخر

یہ دیہاتی قاش کا نوجوان بھلا کس نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہے......

مگر میرے اس جواب سے حوصلہ پاتے ہوئے نذر علی نے ایک نہایت گہرے اعتماد کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہنے لگا

"سر جی مجھے پانچ سال سے نیند نہیں آئی...... بس یوں سمجھیں... کہ میں ان تمام برسوں میں کبھی سویا ہی نہیں...... بس جاگتا ہی رہا ہوں......"

"پانچ برس...... کیوں بھئی...... آخر ایسا کیوں......؟"

"صاحب... مجھے اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی...."

ابھی وہ اپنا فقرہ بھی مکمل نہ کر پایا تھا... کہ میں نے اس کی بات کو سنے بغیر یہ پوچھ لیا۔ "محبت...... اور تمہیں......؟"

جیسے میری دانست میں محبت کرنے کا حق بھلا دیہاتیوں کے پاس کہاں...... میری دانست میں یہ صلاحیت تو صرف شہر میں رہنے والوں ہی کے بس کی بات تھی...... لیکن نذر علی نے بڑے سکون سے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے ایسا کہا......

"سر جی... میں اس وقت دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا......" یہ تب کی بات ہے...... اور بس انہی دنوں میں وہ لڑکی پہلی بار ہمارے گھر شادی کی تقریب میں شرکت کرنے اپنے گھر والوں کے ہمراہ آئی تھی......"

میں تو صرف اس کی نفسیاتی بیماری ہی کے بارے میں سن کر چکرا گیا تھا...... رہی سہی کسر اس کے منہ سے محبت کے ذکر کو سن کر پوری ہو گئی۔ لیکن جب نذر علی نے اپنے دسویں جماعت میں پڑھنے کے بارے میں بتایا.... تو جیسے مجھے یقین نہ آیا تھا اور میں نے یکدم ایک بار پھر نذر علی کی بات کاٹ کر پوچھا

"تو کیا تم نے دسویں کا امتحان دیا......؟"

"جی سر...... میں نے ایف ایس سی تک پڑھا... میٹرک میں میری سیکنڈ ڈویژن آئی تھی اور میں نے آگے انجینئرنگ کے خیال سے ایف ایس سی میں داخلہ بھی لے لیا تھا... لیکن وہ... شاید قدرت کو منظور نہیں تھا...... ہم سر... "کوٹک" کے دیہات کے رہنے والے ہیں.... آپ تو بھکر بھی گئے ہوں گے...... ہمارا گاؤں "کوٹک" بھکر کے شمال مغرب میں دریائے سندھ کے دوسری پار جہاں دریا ہمکل کے فاصلے پر "لونی" والے پہاڑوں کے نزدیکی سلسلے نظر آنے لگتے ہیں...... دیکھی زمین میں واقع ہے

سر جی ہم.... "مونے" قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں.... یہ قبیلہ ملاحوں کا قبیلہ ہے جو اپنی کشتیوں پر مسافروں کو دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر لے جاتے ہیں۔ ہمارے قبیلے کا یہ کام خاندانی ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے حالانکہ اب قبیلے کے بہت سے لوگ نقل مکانی کر کے دوسرے شہروں میں جا بسے ہیں اور روزگار کے لئے نئے نئے پیشے اپنا لئے... لیکن کوٹک کا دیہات ابھی موجود ہے اور وہاں کے رہنے والے مونے ملاح بھی آباد ہیں......

یہ الگ بات کہ ملاحوں کی جوان نسل گاؤں چھوڑ کر باہر جا چکی ہے اور اب کوٹک میں بسنے والے ملاحوں کی بڑی تعداد بوڑھوں پر مشتمل ہے۔ دریا پر کئی پلوں کے بن جانے سے اردگرد کے دیہاتوں سے آنے جانے والے مسافر اب تیز رفتار بسوں میں دریا کے اوپر بنے ہوئے پلوں پر سفر کرتے ہیں۔ اور دیہات کے بچے کچھے ملاح دریا سے مچھلیاں پکڑ کر اپنا گزر بسر کرنے کا سلیقہ سیکھ رہے ہیں......

میں اب نذر علی کی باتوں میں کھو گیا تھا...... اُسے بتا نہ سکا کہ میں ایک زمانے میں ضلع بھکر میں ایک سرکاری اہلکار کی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔ چونکہ میں کوٹک نہیں گیا تھا لیکن مجھے اس علاقے کا جغرافیہ اور حدود اربع اچھی طرح سے معلوم تھا مگر میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا......

"یہ لونی والے پہاڑوں سے تمہاری کیا مراد ہے......؟"

"سر جی...... لون نمک کو کہتے ہیں نا...... اور دریائے سندھ کے پار جو پہاڑی سلسلے ہیں ان سے برسات کے دنوں میں طوفانی نالے جب بہہ کر آتے ہیں تو اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو بہا کر لے جاتے ہیں...... ان نالوں کا پانی نمکین ہوتا ہے جی...... بس اسی وجہ سے ان نالوں کو "لونی" کہا جاتا ہے...... اور وہ پہاڑ جہاں سے یہ پانی کے ریلے اپنے ساتھ بہا لاتے ہیں "لونی والے پہاڑ" کہلاتے ہیں۔"

"لیکن نذر علی تم تو اپنی محبت کی بات کر رہے تھے...... اور پہنچ گئے لونی والے نالوں اور پہاڑوں تک......"

سر جی...... دراصل میری محبت ان لونی والے نالوں اور لونی والے پہاڑوں کی زمین ہی سے متعلق ہے...... اس لئے آپ کو ان کے بارے میں بتانا بھی ضروری تھا جی سر...... جب میں نے پہلی بار اس لڑکی کو اپنے گھر میں بہن کی شادی میں گاتے اور ناچتے ہوئے دیکھا تھا...... تو میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا جی...... وہ کوئی بہت خوبصورت لڑکی نہیں تھی سر...... لیکن مجھے یوں لگا تھا جیسے اُس سے زیادہ خوبصورت لڑکی سارے کوٹک میں نہ ہوگی...... وہ ہمارے قبیلے کی بھی نہیں تھی۔ لیکن میری بہن کی بارات میں آنے والے باراتیوں کے ہمراہ آئی تھی...... نہ میں نے اس سے کوئی بات کی..... بلکہ میں بات تو کر سکتا ہی نہیں تھا.... میں تو گم تھا بس اُسے دیکھ کر بولنا ہی بھول گیا تھا۔ شادی ختم ہوئی... میری بہن بیاہ کر دوسرے گاؤں چلی گئی.... وہ بات ختم ہو گئی لیکن میری بات جہاں شروع ہوئی تھی وہیں کی وہیں رہ گئی۔ مجھے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کے بعد سے نہ میرا کھانے پینے میں جی لگتا تھا...... نہ پڑھنے لکھنے میں...... بس یوں جانیں جیسے وہ لڑکی میری بہن ہی کے ساتھ نہیں لے گئی تھی بلکہ میری روح کو بھی اپنے قبضے میں کر کے چلی گئی تھی...... مجھے یوں لگتا تھا...... جیسے میرا جسم کوٹک میں ہے لیکن میری روح دریا پار کی اس بستی میں منتقل ہو گئی ہے...."

"تو تم نے شادی کیوں نہ کر لی اس لڑکی سے.... جو تمہیں اتنی اچھی

گئی تھی......" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

پہلی بار میں نے مذرنجل کی آنکھوں میں روشنی کی چمک دیکھا...... جو بجھتے ہوئے چراغ کی طرح اک دم بجھ گئی......

"سر جی...... ہمارے سوات قبیلے میں شادی کرنا کوئی آسان بات نہیں...... ہمارے ہاں شادی لڑکے اور لڑکی کی نہیں بلکہ ان کے بزرگوں کی ہوتی ہے پہلے تو ہمارے ہاں یہ بات ہی قبول نہیں کی جاتی کہ کوئی لڑکا یا لڑکی اپنی شادی کے بارے میں اپنی پسند کا ذکر کرے اور اگر کبھی ایسا ہو بھی جائے تو اُسے سختی کے ساتھ دبا دیا گیا...... تاکہ مستقبل میں کوئی دوبارہ ایسی جرأت نہ کرسکے...... بڑے سخت لوگ ہیں جی ہمارے قبیلے والے...... اور ایسے ہی سخت ان کے رسم و رواج......"

"تو تم نے اپنے ماں باپ سے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا......؟"

"سر جی...... میرے والد تو میرے عاشق تھے...... اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے جی...... مجھ سے بہت پیار کرتے تھے لیکن میری والدہ کے انتقال کے بعد خاندان والوں نے میرے والد پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ وہ دوسری شادی کرنے پر مجبور ہوگئے...... اس میں شاید ایک وجہ گھر میں چھوٹے بہن بھائیوں کی نگہداشت کا مسئلہ بھی تھا جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ہم لوگ ملاحوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں...... بس اسی حوالے سے ماہی گیری بھی کسی حد تک ہمارے پیشے کا ایک حصہ سمجھیں۔ لہٰذا جب ہمارے گھر کے مرد اپنے کام کاج کے سلسلے میں گھر چھوڑ کر نکل جاتے ہیں تو کبھی کبھی کئی کئی دن گھر واپسی نہیں ہوتی۔ شاید اسی لئے میرے والد نے دوسری شادی کو قبول کیا اور یوں ہمارے ہاں ان کی دوسری بیوی کی شکل میں سوتیلی ماں نے قدم رکھا۔ چھوٹے بہن بھائی تو کسی نہ کسی طور دوسری ماں سے بہل گئے تھے لیکن میں اُسے ذہنی طور پر قبول نہ کرسکا...... یہی صورتحال کچھ اُدھر بھی رہی۔ ہماری اس سوتیلی ماں کا رویہ سوتیلی ماؤں جیسا تو نہ تھا...... لیکن جانے کیوں میرے بارے میں وہ ہمیشہ جارحانہ رویہ لئے رہی۔ جب میں نے اپنے والد کو اپنی پسند کے بارے میں بتایا...... تو میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ وہ کس قدر خوش ہوئے تھے لیکن سر جی...... خوشیوں کا بھی عجب عالم ہے ان کی بوچھاڑ بس ایک ہی طرف سے پڑتی ہے...... جب کہ جلتے ہوئے موسم کی تپش باقی تمام سمتوں سے اس خوشی کی بوچھاڑ کو جھلانے کے در پے ہوتی ہے......"

میں جو اب تک مذرنجل کو محض ایک معمولی سا ملاح سمجھتا تھا...... اس کی باتوں کو سن کے حیران ہوئے جارہا تھا...... کیا یہ اس وجہ سے تھا کہ اس نے ایف اے ہی تک تعلیم حاصل کی تھی...... یا اس لئے کہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں اتنے کڑے احتمالات سے گزر چکا تھا......؟ ویسے محبت بھی ایک عجیب شے ہے اگر آپ کا اس سے سابقہ نہیں پڑا تو آپ جانتے ہی نہیں کہ یہ ظالم کیا کیا گل کھلاتی ہے...... ایک عام سے بے ضرر انسان کو کس قدر توانا بنا دیتی ہے ایک معمولی سی عقل و دانش رکھنے والے کے باطن میں کیسے کیسے گلزار کھلاتی ہے مریض عشق کے ہاں بھوک پیاس جیسی بنیادی خواہشیں مٹ جاتی ہیں...... وجود سے نکل...... اور قطرے میں دریا...... دیکھنے کی صلاحیت پا جاتا ہے...... اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک عام سا انسان دیوانگی سے فرزانگی تک کی ساری حدیں پھلانگ جاتا ہے۔ جب یہ محبت کن وفا کی حدوں سے بھی ماورا ہو جاتی ہے تو صوفیوں...... ولیوں...... اور پیغمبروں کا روپ دھار لیتی ہے۔ شاعر اسے دماغی خلل سے تعبیر کرتے ہیں...... تاریخ جسے ہیر، سوہنی اور منصور کے ناموں کے چراغ روشن کرتی ہے۔ میں خود کو اب مذرنجل کے سامنے ایک ملامت کے ہاتھوں مار کھایا ہوا بے حد حقیر انسان جان رہا تھا اور وہ مجھے متوجہ کرتے ہوئے بولے جارہا تھا۔

"میں سر جی...... والد نے اس رشتے کو پسند کر لیا لیکن میری سوتیلی ماں نے نہ جانے کیوں اس رشتے کی شدید مخالفت کی۔ اس کے باوجود والد میرے رشتے کی بات لے کر لڑکی والوں کے ہاں دریا پار گئے۔ اور واپس آئے تو مجھے بتا کر نہال کر دیا کہ لڑکی کے والدین نے میرا رشتہ پسند کر لیا ہے...... میری سوتیلی ماں کو تو جیسے یہ بات بالکل پسند نہ آئی تھی...... وہ والد سے لڑ جھگڑ کے اپنے میکے چلی گئی۔ سر جی اُس بار دریائی گرمی پڑی تھی کہ بس نہ پوچھیں...... ہمارے علاقے میں تو آپ جانتے ہی ہیں جب تک پانی نہ ہو فصل کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ رہی سہی کسر اس بار کے موسم نے پوری کر دی تھی۔ ایسی خشک سالی تھی کہ دور دور پانی کا نشان نہ تھا...... دریا اپنے کناروں سے کہیں آگے جا کر جلتی زمین میں بس پانی کی ایک لکیر کی طرح نظر آنے لگا تھا...... آسمان پہ سورج نکلتا تو ڈوبنے کا نام نہ لیتا...... سارا سارا دن...... ملاح اپنی کشتیاں لئے مسافروں کی راہ تکتے لیکن لگتا تھا جیسے اس موسم میں یا تو لوگ گھروں سے نکلنا بھول گئے تھے...... یا پھر دریا پار سے آنے والے مسافروں کو بھی تپش کے خوف سے وحشت ہوگئی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ سال تپش پہ نحوست کا سال تھا۔ ہمارے اپنے گاؤں میں گرمی کی شدت سے بہت سے لوگ جن میں موسم کو جھیلنے کی تاب نہ تھی مر گئے۔ جو اُمید سے تھے وہ بچ رہے۔ میری سوتیلی ماں بھی اپنے میکے سے کبھی واپس نہ آئی۔ ساون کے مہینے میں میری شادی طے تھی۔ رسم کے مطابق ایک بار شادی سے پہلے ہمارے گھر والوں کو لڑکی والوں کے ہاں جانا تھا اور ایک بار انہیں بھی ہمارے ہاں آنا تھا۔

اچانک بارشیں شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ گاؤں والے ہی کیا قرب و جوار کے سارے دیہاتوں میں خوشی کے شادیانے بج اُٹھے...... ہر فرد خوش تھا کہ اب زمین سے فصل ہی نہیں اُگے گی...... بلکہ پانی میں بھی مچھلیاں زندگی کا ناچ دکھائیں گی...... اور جب دریا کا پاٹ اتنا پھیل جائے گا کہ دوسرا کنارا نظر نہ آسکے تو مسافروں کو دریا پار کرنے کے لئے کشتیوں کی احتیاج ہوگی...... یعنی ہم ملاحوں کے جیون میں ایک بار پھر خوشحالی اپنے رنگ بکھیر دے گی......

بارشوں کے مسلسل ہونے سے نہ صرف رُت بدل گئی تھی...... بلکہ ہر چہرے پر خوشی کا رنگ اپنی رونق دکھا رہا تھا۔ ہمارے ہاں سے لڑکی والوں کے ہاں

بقیہ ہائیڈ ہر لائبریری میں ملاحظہ فرمایئے

ایلڈرلی لیڈی

عابدہ تقی

"بی بی جی ہمارے زمانے میں تو شادی بیاہ پر سادہ سا لال جوڑا ہوتا تھا پر اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔" ماسی کبریٰ اسے جوس کا گلاس پکڑاتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور وہ اپنی ٹیپ ہاتھ میں پکڑے کسی برائیڈل ڈریس کے بلاؤز کا ناپ چیک کر رہی تھی جو اس کی ٹیم کے ممبرز ایک Dummy کو پہنا چکے تھے۔

"یہ چیز بہت زیادہ ہیوی ہو گا اور آپ لوگ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ پلیز ڈبل ری چیک آف ورک مجھے جنید جمال صاحب کو کل یہ سب ڈریسز نمائش کے لئے تیار کر کے دینے ہیں" وہ اپنی اسٹچنگ ٹیم کے ساتھ سر کھپا رہی تھی۔

"بی بی جی یہ اتنے سارے لباس کس کے لئے بنا رہی ہیں جی"
ماسی پھر شروع ہو گئیں۔

"نمائش کے لئے بنا رہی ہوں آپ پلیز ماسی گلاس وہاں رکھ دیں۔" فون کی گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی جسے اس نے مشکل سے اٹھایا تھا کہ اتنی بھی فرصت نہیں تھی اس کے پاس لیکن دوسری طرف جنید جمال کی آواز جادو جگا رہی تھی۔

"ویلکم ڈونٹ وری بے بے، وی ول بی آن ٹائم۔ آپ شام کو یہاں کا ایک چکر لگائیں اور ماڈلز کا کیا بنا؟ ریہرسل کا کام کیسا جا رہا ہے؟ اور وہاں یہ ایڈیل ڈریس جو میں بنا رہی ہوں اس کے لئے کس کو سلیکٹ کیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے جسٹ بریف می؟" مارے پریشانی کے اس کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"ریلیکس ڈیئر ماڈلز ہینڈل ہو رہے ہیں۔ ببیا ملک پر ٹرسٹ کرے گی شی از آن کیٹ واک ان ریہرسل سیشن جسٹ ناؤ" جنید جمال نے جواب دیا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"میں تو فرسٹ ٹائم اس کا نام سن رہی ہوں کون ہیں یہ محترمہ؟"
اس کے سوال پر جنید جمال کے قہقہے نے اس کا موڈ ہی اپ سیٹ کر دیا۔

"شی از اے چارمنگ لیڈی" اور پھر تھوڑا وقفہ دے کر less than you کا اضافہ کر دیا۔

"میں اس وقت شو کی کامیابی میں انٹرسٹڈ ہوں ورنہ تمہاری ماڈلز کے چارم سے مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں۔" اس کی بات پر دوسری طرف سے بھی کچھ کہا گیا اور پھر فون بند ہو گیا۔

"بی بی جی ہماری بستی میں بھی میری رشتے کی بہن کی ایک لڑکی بھاگ بھری کی شادی ہے سچ تو میں نے ان کو بتایا میری بی بی بہت قیمتی جوڑے تیار کرتی ہیں۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ آپ سے دلہن کا جوڑا بنوانے میں کتنے پیسے لگ جائیں گے۔" ماسی نے للچائی ہوئی نظروں سے ادھ سلے اور خوبصورت کامدار ایڈیل ڈریس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ ماسی! بھاگ بھری اسے افورڈ نہیں کر سکتی یہ لاکھوں کا ہے لاکھوں کا۔ میں بستی والوں کے لئے نہیں بناتی ہوں یہ جوڑے۔ یہ نمائش کے لئے ہیں باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں" اس نے جوس کا گلاس لاتے ہوئے کہا۔

"اوکے ٹیم! یہ بلاؤز ان ساری Dummies پر فٹ کریں اور ساڑھیاں پہناتے ہوئے ٹرن ٹال کا اور پلو کا بہت خیال رکھیں۔

"نعیم صاحب مجھے بتائیں کہ ٹرانسپورٹ آ گئی کہ نہیں یہ ساری آئٹمز ہال میں پہنچانی ہیں کب ہو گا یہ سب۔ اور ماڈلز کی میک اپ ٹیم کو فون کرو پلیز پلیز ہری اپ۔ میک شیور آف یور کمنگ ٹو بی پرفیکٹ اینڈ ان ٹائم" وہ پھر چلانے لگ گئی۔

"ہاں بی بی بہت خوش قسمت ہوتی ہوں گی جو یہ جوڑے پہنتی ہوں گی ہیں ہاں۔ ہائے ہائے غریبی" ماسی نے ٹھنڈی آہ بھری اور گلاس اٹھا کر نکل گئیں۔

ڈریس اینڈ ڈریسز کے نام سے شروع کی گئی اس کی بوتیک اب باقاعدہ ایک انڈسٹری بن چکی تھی۔ اب تو اس کا نام ہی شارٹ کر کے "ڈی اینڈ ڈی" رکھ لیا گیا تھا اور روبانہ مظہر ہی اس کی پہچان تھی۔ کل "ڈی اینڈ ڈی" کا گرینڈ فنکشن تھا اور جنید جمال کے لئے بہت ہی روشن دن۔ کیونکہ جنید جمال کو نیشنل ڈائریکٹر کا عہدہ تو پہلے ہی دیا جا چکا تھا اور جلد ہی وہ بزنس پارٹنر بھی بننے والا تھا روبانہ کی مہربانیوں سے۔ بلاشبہ روبانہ نے اس ڈریس بزنس کو ایک بین الاقوامی سطح تک لانے میں بہت کام کیا تھا اور یہ بات بہت قابل ستائش تھی کہ اس نے یہ سب کام اکیلے ہی کر لیا تھا لیکن جب سے جنید جمال نے اسے جوائن کیا تھا اس کے بزنس کو کافی وسعت ملی تھی۔ اور آج کا یہ فنکشن دونوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ روبانہ نے یہ فنکشن ایک بہت بڑے فائیو سٹار ہوٹل میں ارینج کیا تھا جس میں ڈریسز کی نمائش، جیولری کی نمائش اور میوزیکل شو بھی شامل تھا۔ جنید جمال اور روبانہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے مبارکبادیں وصول کر رہے تھے۔ شہر بھر کی ایلیٹ کلاس موجود تھی اور روبانہ آج جتنی توجہ سے خود تیار ہوئی تھی وہ ماڈلز سے بھی زیادہ دلکش لگ رہی تھی خاص کر جنید جمال کی ساری توجہ اس پر مرکوز تھی۔ جنید جمال کا کمال تھا کہ اس نے "ڈی اینڈ ڈی" کی اونر روبانہ مظہر کی نگاہوں میں ایک قابل ذکر جگہ بنائی تھی۔ اس کی کامیابی اور محنت نے روبانہ کو کافی متاثر کر لیا تھا۔ صرف محنت نے نہیں، اس کی بولتی آنکھوں کے پیام نے اس

کے خوبصورت جملوں اور اس کی شخصیت کے چارم نے بھی رومانہ کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے اتنے نزدیک آ چکے تھے کہ ہر طرف یہ تاثر عام تھا کہ دونوں کی یہ انڈرسٹینڈنگ کسی رشتے کی صورت میں انجام پذیر ہوگی۔ یہ بات دونوں کے گھر میں بھی محسوس ہونے لگی تھی لیکن دونوں طرف Who cares والا ہی موڈ جاری تھا۔ پراجیکٹس، بیرون ملک نمائشیں اور ایکسپورٹ یہ سب اتنا مصروف کن اور تھکا دینے والا کام تھا کہ ان کے جذبوں کی راہ میں حائل نہیں تھا لیکن ایک بات دونوں کے درمیان کسی وقت بھی فاصلوں کی خلیج حائل کر سکتی تھی جذبوں کی گہرائی کے باوجود بھی اور رومانہ کو اس بات کا احساس تھا۔

"تو سب سے پہلے آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ آپ کو ڈریس ڈیزائننگ کا بزنس کرنا چاہیئے" رومانہ مظفر سے یہ سوال پرائیویٹ چینل کے ایک مشہور پروگرام کے لئے کیا جا رہا تھا اور میزبان کے اس سوال پر بہت سارے منظر ان کے ذہن میں اس پل کے ہزارویں حصے میں کسی فلم کی طرح گھوم گئے۔

اس کے کالج کی فیئرویل پارٹی میں جانے کے لئے اس کے پاس کوئی نیا جوڑا تک نہیں تھا۔ یہ ان کی بدحالی میں اتنی تنگی تھی کہ وہ اسکول سے ملنے والی تنخواہ سے اس کے لئے ایک نیا ڈریس بنا سکتیں جہاں اس کے اور چھوٹی بہنوں اور بھائیوں کی تعلیم بھی ان کی تنخواہ کھینچ رہی تھی۔ اور رومانہ کا گروپ سارے کا سارا بہت امیر گھرانوں کی بگڑی ہوئی رئیس زادیوں کا تھا جن کے لئے مہنگے سے مہنگے ڈیزائنر کوئی مسئلہ نہیں تھے۔ کالج میں اگرچہ یونیفارم تھا لیکن اس میں بھی صرف رومانہ ہی ذرا گھٹیا قسم کے کپڑے کے ایک ہی یونیفارم میں سارا سال گذار دیتی۔ تو اس مسئلے کا حل اس کی ایک امیر اور دیالو کلاس فیلو نے کر دیا۔ اسے اپنا ایک پہنا ہوا جوڑا دے کر جو اس پارٹی والے دن چاہے بھی خوب تھا اور تھوڑے سے میک اپ اور اس سے مانگی ہوئی جیولری نے اسے بہت حسین اور جاذب نظر بنا دیا تھا اور بعد میں جب وہ ماریہ کو واپس کرنے گئی تو اس نے بڑی نخوت سے کہا۔

"اوہ نیور مائنڈ رکھ لو رومانہ میں ایک بار کی پہنی ہوئی چیز واپس نہیں لیتی" اور رومانہ کو اگرچہ بہت برا لگا لیکن پھر بھی وہ اسے واپس لے آئی۔

اس ایک ڈریس کی بناوٹ پر غور کرتے کرتے اس نے ایک مرتبہ ایک سستے کپڑے سے ایک اسٹائلش سوٹ خود سلائی کر لیا اور وہ اس کی امیر سہیلیوں میں پاپولر بھی ہو گیا تو پھر وہ اس سے یہ کام کروانے لگ گئیں۔

"پیسے نہیں ہیں بیچاری کے پاس لیکن آئیڈیاز بڑے زبردست ہیں" اس کی دوستوں کے تبصرے اس تک پہنچتے رہتے تھے اور گریجویشن کے لئے اس نے فیس اور کتابوں کا خرچ بھی یونہی نکالا۔ اپنی سلائی مشین پر وقت اور دماغ استعمال کرتے کرتے کبھی کبھی وقت اور قسمت خود ہی آگے بڑھنے کا راستہ دے دیتے ہیں۔ اس کی کلاس فیلو لیزا کی ماما نے اپنے کے جیولا زوم میں ڈریس کی نمائش کروائی تھی اور ان کے ساتھ بھی سارا کام رومانہ نے کروایا تھا۔ یہیں سے ماریہ اور پھر اور دوسری خواتین کی تعریفوں نے اس کی سرپرستی شروع کر دی۔ پھر اس نے اپنا چھوٹا سا ایک آفس بیگم رؤف کے ساتھ مل کر کھولا۔ جب آرڈرز زیادہ آنے لگ گئے تو منافع کی تقسیم پر ان کی اور رومانہ کی جھڑپ ہو گئی۔ اور یوں رومانہ نے اپنا ایک الگ سیٹ اپ بنا لیا۔

شروع شروع میں تو اسے اپنا مقام بنانے کے لئے کافی کوششیں کرنی پڑیں کیونکہ مارکیٹ میں بوتیکس اور ڈریس ڈیزائنرز کی کمی نہیں تھی تو ایسے میں بزنس لینا اور ایک مقام بنانا بھی خاصا جان جوکھوں کا کام تھا لیکن پھر ایک امریکن خاتون وینڈی فورمین کا ساتھ مل جانے سے اسے باہر کے ملکوں میں اپنا کام بھجوانے کا موقع مل گیا اور یوں نیشنل اور انٹرنیشنل لیول پر بے مثال ڈریس ڈیزائننگ کی روایت ڈالنے والی وہ ایک واحد خاتون تھی جس نے دو چند سال لگا کر ایک نمایاں مقام بنا لیا تھا۔ اب فلم ہو یا ڈرامہ یا شادی کے فنکشنز یا بیرون ملک نمائش رومانہ کی D N D کا نام ہر طرف گونج رہا تھا۔ اور جواب میں اس نے اصل حقیقت کو اپنے تک ہی رکھا۔

"میں یونہی میں شروع سے کچھ الگ سا کام کرنا چاہتی تھی you know something creative تو میں نے ڈریس ڈیزائننگ کو ٹرائی کیا۔ آئیڈیا اور کلک ہٹ ہو گیا اور اب آپ کے سامنے ہے سب کچھ" اس نے ادا سے مسکرا کر کہا۔

"میڈم اکیلے اتنا کچھ کیا آپ نے یا آپ کے خیال سے کسی اور کا بھی شیئر ہے اس سارے پراجیکٹ پر آپ کا ساتھ دینے میں؟" اس سوال پر اس کی نگاہیں بے اختیار جنید جمال کی طرف اٹھیں جو دور مہمانوں کے ایک ٹولے میں گھر کر بھی اسی کی طرف بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور رومانہ نے دھڑکنوں میں عجیب سی ہلچل محسوس کی۔ "تمہارے چہرے پر نہیں لکھے ہیں سالوں کے وہ عدد جنہیں تم اپنی بڑائی میں شمار کرتی ہو رومانہ۔ پھر اتنا concious کیوں رہتی ہو ہر وقت اس ایک بات سے۔ جب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تو کسی کو نہیں پڑنا چاہیئے" "تمہیں تم" والے ڈانٹ دیا کرتا تھا جب بھی وہ اپنے اور اس کے درمیان اس فرق کو یاد کرواتی لیکن اس ڈانٹ میں ایک یقین دہانی، ایک re-assurance ہوتی اور اسے جذبوں کی سچائی کا یقین آ جاتا۔ اپنے محبوب کی بات کا اعتبار نہ کرنے والی تو کوئی عورت پیدا ہی نہیں ہوئی اس لئے زمین پڑے اور اس نے انٹرویو لینے والی ٹیم کو کوئی مناسب جواب دے کر مطمئن کر دیا۔ اور پھر جنید جمال کا انٹرویو شروع ہو گیا اور وہ مہمانوں میں مصروف ہو گئی۔

"روما پلیز میٹ سبرینا ملک آج کے شو کی کوئین"، رومانہ کو بہت سے فارن ایکسپورٹرز نے گھیر رکھا تھا جب جنید اس سے سبرینا کو ملوانے کے لئے لایا۔

"پلیزڈ ٹو میٹ یو سبرینا اینڈ ویل ڈن۔ یو ور ٹوٹلی ونڈرفل" اس نے سبرینا سے ہاتھ ملایا۔

"تھینکس میم" "یہ سب آپ کی اور جنید صاحب کی کوششوں سے ممکن ہوا ہے" سبرینا نے رومانہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس نے کچھ ہی دیر دیکھا تھا جنید کے اور اس کے دوستانہ تعلق کا اور اس جائزے میں تھوڑا حسد بھی شامل تھا۔ 'ساری دنیا نے آج مجھے یعنی سبرینا ملک کو اس کی خوبصورتی پر کامپلیمنٹس دیے تھے اور یہ رومانہ منظر' ونہہ یہ جنید کو کیا سوجھی اس خاتون پر مرمٹنے کی؟ سبرینا سوچوں کو چھپاتے ہوئے رومانہ منظر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وائٹ کلر کی لانگ ان سلک کی ساڑھی اور میچنگ جیولری میں رومانہ میک اپ کے ساتھ اچھی لگ رہی تھی ٹھیک ہی ہے مگر جنید کے ساتھ جچتی نہیں عمر میں بڑی لگتی ہے۔ سبرینا نے اپنے سارے تاثرات اپنی مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے رومانہ کی بہت تعریف کرنی شروع کر دی۔

"You are such an intelligent lady and you have a stamina for this kind of demanding business." جنید ٹھیک کہتا رہا ہے کہ آپ کے پاس ان لمیٹڈ آئیڈیاز ہیں ڈیلس ایریا ہینڈلنگ کے لئے" اس نے رومانہ کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اب تم جیسا ٹیلنٹ بھی ساتھ ہے تو میں اسے ٹیم ورک ہی کہوں گی۔" رومانہ کھل کر مسکرا دی اور پھر اسے شاکر کی دوسری طرف سے آواز آئی تو وہ ایکسکیوزمی کہتی ہوئی ادھر چل دی جنید جمال کے ساتھ۔

"اس couple کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے سبرینا" عمیرہ بھی اب کیٹ واک کی تھکن کو بھلانے کو کوک کا گلاس ہاتھ میں لئے وہیں چلی آئی تھی۔

"Odd couple" سبرینا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سنا ہے جنید اور وہ شادی کرنے والے ہیں۔ جب سے جنید کو دیکھا ہے کیسے اسے فلرٹ کرتا ہے" شاید کوئی اپنی عمر اس نے اٹھا رکھی تھی رومانہ پر۔

"اماں لگتی ہے اس کی۔ اداکاری دیکھو ذرا، میں نے سنا ہے کہ اس نے اپنی wrinklies چھپانے کے لئے فیشل کاسمیٹک سرجری کروائی ہے پور اولڈ گرل" "کیا کیا کرنا پڑ رہا ہے جنید جمال کو پکڑنے کے لئے" یہ ماہر تھی۔

"وہ کچھ کرے یا نہ کرے کچھ کام کر چکا ہے جنید کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ اس میں کچھ زیادہ ہی انٹرسٹڈ ہے میں نے مسز خلیل کو کہتے سنا ہے کہ دونوں شادی کرلیں گے"

"غلط سنا ہے اور اگر صحیح بھی سنا ہے تو اب ایسا ہوگا نہیں" سبرینا نے اپنے لانبے بالوں کی لٹ کو انگلی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"شرط لگالی ہو" عفت نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"I bet over it" سبرینا کے لہجے میں کچھ تھا جسے بلا غور کے سارے گروپ نے محسوس کر لیا تھا۔ کچھ تو تھا۔

"جیلس ہے" عمیرہ نے چھیڑا۔

"نہیں یار He is my obsession اور یہ رومانہ منظر تو پرابلم کاری" اس نے کہا تو سب زور سے ہنس دیں۔

"او یو نو ہی از سویٹ ہارٹ اور اسے پانے کے لئے کیا میں اتنا نہیں کر سکتی؟" وہ ہنس ہنس کے بات کر رہی تھی۔

"پریکٹیکلی یار یو آر رائٹ لوکنگ آل ریڈی" اس کے پرفیکٹ فگر پر ملازن ڈریس سے جھانکتے گورے بدن کو دیکھتے ہوئے سارے گروپ کو یقین آگیا تھا۔ "شی از لوکنگ ڈوننگ بےبے" لیکن کیا ایسا واقعی ہو سکے گا سب نے گردنیں ادھر موڑ کر دیکھا جہاں رومانہ منظر کھڑی مہمانوں سے باتیں کر رہی تھی۔ ساقی کی طرح اس بات سے بے خبر کہ کچے گھڑے کی مٹی پانی میں گلنا شروع ہو چکی تھی۔

"سارے رسالے اور سارے اخبار دیکھے آئی ہوں میں کل کے فنکشن کے It was a success" لیزا کل کے فنکشن کی خوشی منانے چلی آئی تھی اور بہت ایکسائٹڈ تھی۔

"ارے ہاں اس فنکشن کا کوریج تو زبردست ہے" رومانہ مارننگ نیوز میں اپنی تقریب کا کوریج کم دیکھ رہی تھی اور سینا ما سوچ رہی تھی کہ وہ جنید جمال کے ساتھ تصویر میں کتنی شاندار لگ رہی تھی اور اس کا وہاں سے نظریں ہٹانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"جنید نے کچھ کہا تم سے مطلب شادی کے پروپوزل کے بارے میں" لیزا نے بھی اخبار دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سنو لیزا! اگر عورت عمر میں مرد سے کچھ سال بڑی ہو تو یہ جو کچھ سالوں کا فرق ہے وہ ان کی محبت کا کوئی sad event ہی بن جاتا ہے کہیں نہ کہیں آ کر" وہ چائے بناتے ہوئے لیزا اپنی واحد دوست سے اپنے خدشات شیئر کر رہی تھی۔

"او کم آن رومانہ کس قسم کی باتیں لے بیٹھی ہو تم۔ اگر مرد عمر میں بڑا ہو عورت سے اور محبت سچی ہو تو کوئی فرق پڑتا ہے ان کے آپس میں ریلیشن شپ میں؟" لیزا نے الٹا اسی پر سوال کر دیا۔

"عورت کو اس لئے فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کی محبت کی بنیادیں جذبوں کی گہرائی پر ہوتی ہیں لیکن مرد کے ہاں کہیں نہ کہیں کوئی extreme decision کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے"

"لک ڈیئر رومانہ میں کافی ایگزامپلز کوٹ کر سکتی ہوں اس

پوائنٹ کی فورمیں جہاں عمروں کے گیپ سے بھی کامیاب شادیاں ہوئی ہیں اسی دنیا میں اسی کلب پر "لیزا خاصی جذباتی ہورہی تھی۔

"اچھا آئی ول ٹرو میری آل آف دیم ڈون یو آئی ڈون"۔ رومانہ کی دلچسپی بڑھ رہی تھی یا پھر وہ اپنے دل میں بنے ہوئے محبت کے گھروندے کو کسی جاہ گیں باہر سے بچانے کی تیاری کرنا چاہ رہی تھی۔

"آئی ایم ناٹ اے ویری رچ پرسن لیکن پھر بھی اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے دین میں عمروں کے فرق سے شادیوں کی مثالیں ہیں جہاں خواتین کے چند سال بڑے ہونے نے بھی رشتوں کے تقدس کی مثال قائم کی۔"

"وہ سب مثالیں ہماری سوسائٹی میں عورت کو سپورٹ دینے کے لئے ناکافی ہیں کیونکہ ہماری سوسائٹی از لائیک۔" رومانہ کا رویہ تیکھا ہورہا تھا آج۔

"چلو ماڈرن امریکن بھی کئی مثالیں ہیں کہو تو دوں اب دیکھو وہ پاپ سنگر بہا مائیکل جیکسن اور ڈطرچ خیال "لیزا بات پوری کرنے سے پہلے ہی ہنس پڑی۔

"شٹ اپ لیزا You are being nasty now"

وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دی تو اس ہنسی میں اس کی پریشانی بھی کہیں تحلیل ہوگئی اسے ماضی کی سب باتیں یاد آنے لگ گئیں۔ مجھے زندگی کی ساتھی ایک سمجھدار عورت چاہیئے تمہاری طرح کی' یہ بھی وہ بارہا کہہ چکا تھا۔

'جتنے ہمارے خیالات ملتے ہیں رومانہ' ہمیں تو بہت پہلے ہی شادی کرلینا چاہیے تھی خیرات از نیور ٹو لیٹ' اسے یاد آیا ایک پرلس میٹنگ سے آتے ہوئے وہ کتنا جذباتی ہو رہا تھا۔ اور جانے کتنے خوبصورت لمحے ایک ایک کرکے رنگوں کی دنیا آنکھوں کے سہارے بسانے لگے گئے۔ خاص طور سے اُسے کیفے کا وہ منظر یاد آگیا جہاں جنید حال نے اس کے اور اپنے ویڈنگ ڈریس کی بات کی تھی۔

"اپنی شادی پہ کیسا ڈریس بناؤ گی مائی ڈیئر لیڈی روما" وہ دونوں ایک کیفے میں بیٹھے تھے اور جنید اس کی طرف جھکا ہوا اسے دلچسپی سے دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

"ہم ــــــ میں نے سوچا نہیں کبھی"۔ ایک دم چہرہ ڈش کرنے لگ گیا تھا۔

"کم آن' ابھی نہیں سوچو گی تو پھر کب سوچو گی میم" اس نے تھوڑا ادب سے سر جھکانے کی ایکٹنگ کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"کسی نے مجھے پروپوز ہی نہیں کیا ابھی تک"۔ وہ اپنی خالی انگلیوں کی طرف دیکھنے لگ گئی جس میں ایک انگوٹھی کی کمی تھی۔

"آپ کس سے چاہتی ہیں کہ وہ آپ کو پروپوز کرے؟" سوال بے حد ڈائریکٹ تھا۔

"میں کوئی ایسا کہ جو میرے ساتھ دور تک چلنے کی سکت رکھتا ہو Someone caring and sharing "وہ بات کہتے کہتے رکی۔ ' کبھی سوچا نہیں تھا ایسا پہلے وہ تو کام کرتے کرتے ایک مشین بن گئی تھی اور اب اس ورکنگ روبوٹ کو دوبارہ عورت کا روپ دھارنے میں کتنا مزہ آرہا تھا۔

'میرے جیسا چلے گا؟" جنید نے ٹیبل پر پڑے گلدان سے ایک پھول کھینچ کر اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب؟" وہ جیسے انجان بن گئی یکدم۔

"مطلب کہ میرے جیسا ڈیم اسمارٹ' ہینڈسم' کواللٹک' کیئرنگ اینڈ شیئرنگ اینڈ بلا۔ بلا ــــ بلا ــــ" وہ بات ختم کرکے ہنس دیا تو وہ ماحول کر ساری فضا سکرا اٹھی ہو۔ دل اس زور سے دھڑکا کہ اسے گہری گہری سانسیں لینا پڑیں' دور کہیں شہنائی گونجتی ہوئی سنائی دینے لگ گئی۔ وہ اس نے پہلے کب سوچا تھا یہ بھی آئے گا زندگی میں۔

"چاہے وہ مجھ سے عمر میں کچھ سال چھوٹا ہو پھر؟" رومانہ نے سوال indirect کردیا۔

"اور اگر اس کے چند سال چھوٹے ہونے کے باوجود بھی اس کے جذبوں کا وزن زیادہ ہو تو پھر؟ خیر چھوڑو اس بے تکی بات کو۔ ہاں تو پھر کیسا ڈریس ہونا چاہیے آپ کی ویڈنگ کا" اس نے پھر سوال اس کی طرف اچھالا۔

"سوچوں گی۔" کئی اچھے اچھے برائیڈل ڈریسز اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگ گئے جو اس نے تیار کئے تھے ساتھ ساتھ ان دلہنوں کے چمکتے ہوئے چہرے بھی جنہوں نے وہ ماڈل ڈریسز پہنے تھے۔

"اور میرا ڈریس؟ اس پر بھی تم ہی کام کرلینا ویسے بھی میں تو پراجیکٹ کو بھی ہینڈل کرتا ہوں جب وہ پرفیکشن کے ساتھ سامنے ہو" اس نے رومانہ کے کانوں کے جھمکے کو انگلی سے چھیڑ دیا۔ اور اس ایک چھیڑ نے رومانہ کی دھڑکنوں کے کتنا چھیڑ دیئے۔

"Falling in love with a boy like you is easy, so easy" یہ سنڈی لیپر پر بنا پارلس اپنے مخصوص اسٹائل سے گا رہی تھی اور وہ اپنے بستر پر نیم دراز اس گانے کے میوزک کے ساتھ ساتھ اپنے جھمکے کو بار بار چھو رہی تھی ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ۔ اور اب لیزا کی بات سے اسے سب یاد آگیا تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی گئی۔

لیکن اب تو کافی عرصے سے جنید نے اس ٹاپک پر کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ بلکہ ان کی ملاقاتوں میں بھی کافی طویل وقفے آنے لگ گئے تھے۔ نیا نیا ٹون پے بات ہوتی تھی اور کبھی کبھی پرلس لانچ فنکشن میں میٹنگ۔ جانے کیا ہو گیا تھا وہ مصروف رہنے لگ گیا تھا مگر کہاں؟ میں نے پتہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مگر کیوں۔ میں جھجکنے لگ گئی ہوں یا پھر شاید وہ مجھے اوائڈ کر رہا ہے

اتنا کھل کھلا اظہار کرنے کے بعد تو کیا ہوا جس لے خوابیدہ دوشیزگی کی طرح تھے
سے وہ مسکرائی۔ پھر میں اسے بتاؤں گی کہ اپنا برائیڈل ڈریس تیار کر چکی ہوں
میں جو سب سے لنا کشش ہے اور جنید وہ تو ہے ہی پرنس اس کے لئے بھی کوئی
شاندار ڈریس ہونا چاہئے۔ وہ سوچوں میں بہت دور جا چکی تھی۔

"او۔ کے ڈیئر اب کچھ کھانے کو دو میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور
تمہاری طرف چلی آئی" لیزا نے آواز لگائی تو وہ خیالوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔

"او۔ کے۔ چلو کچن میں خود ہی کچھ کرتے ہیں اور جنید کو فون بھی
کرتے ہیں اس کے بعد" وہ دونوں کچن میں آ گئیں۔

"روما تمہیں پتہ ہے ہیریٹا کیا کرتی پھر رہی ہے آج کل" لیزا
کافی عرصے سے روما سے اس موضوع پر بات کرنا چاہ رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہے ماڈلنگ بھی what else she can
do ایک ماڈل تو وہی کرے گی نا جو اس کا جاب ہے"

"یہ تمہیں کس نے کہا ماڈلنگ کی ہے جاب ہو لاقصہ۔ یقیناً جنید نے"
لیزا کا خیال بالکل درست تھا۔

"ہاں سچ سچ کہہ رہا تھا کرشی اور ٹی وی پر وہ شیفل Imean in
her performance on the show" اس نے بے نیازی
سے جواب دیا۔

"اور اس ماڈلنگ پرفارمنس کا نہیں بتایا جو وہ سچ سچ کی واقف
میں کر رہی ہے آج کل۔" لیزا کو غصہ آ رہا تھا۔

"نہیں نہیں یار۔ ماسٹر جنید جمال کا کبھی بھی انٹرسٹ نہیں رہے۔
وہ ایک پرانی ویلیوز والی فیملی سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی اماں اور بہنوں سے میں
مل ہوئی ہوں۔ وہ بھی کٹر روایتی خیالات رکھتی ہیں" تو سنر میں تو سن طنز کی ہوا نے
پر دونوں اچھل پڑیں۔

"تم بھی اس بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو گوسپ ماسٹر ڈ"
روما نے لب لٹکائے فرق کرنے لگی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلے اپنے محبوب
پر یقین کی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ لیزا نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر موضوع بدل دیا۔

"کاش کاش یار تم جنید جمال کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو۔ ہاں
آج شام کلب کی پارٹی میں کیا کیا پہنوں؟ اور تم کیا پہنو گی؟ کوسٹیوم تھا کوئی رولنگ
ہی پہن کے دکھاؤ جو اپنی ویڈنگ کے لئے بنایا ہے بڑی اینڈ ڈی کی owner
نے" لیزا پھر شرارت پر اتر آئی تھی۔

"شٹ اپ بکواس بند کرو تم اس اینڈ بی اے ایکس بے بی اینڈ
کیری دس بیک فاسٹ فوڈ بی ٹیبل" روما نے اسے آرڈر دے ڈالا۔ اور اب
"سلیس باس" کہنے کے سوا لیزا کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

کلب کی گیدرنگ میں اس کی آج جنید جمال سے ملاقات ہوئی
تھی۔ وہ پارلر میں تیار ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اور جب وہ مجھے ڈراپ
کرنے آئے گا تو میں اس سے ڈائریکٹ بات کروں گی کہ ہم کی شادی کے سلسلے
کو آگے بڑھنا چاہئے اب۔ اس سے آگے سوچنے سے ہی وہ ہنس کر گئی اور یوں
بھی گاڑی اب پارکنگ میں پارک کر چکی تھی وہ اور محبت پر اس کے یقین نے اس
کے چہرے پر بہت سے رنگ بکھرا دئے تھے۔

"واؤ روما وٹ اے بیوٹی آر یو" اسے تانیہ نے کلب کے
دروازے پر روک لیا۔

"تھینک یو! جنید کو دیکھا ہے وہ آئے ہیں کیا؟" اس نے اپنی
تعریف پر مسکرا کر اگلا سوال کیا۔

"ہاں ابھی کسی کا فون ریسیو کرنے گئے ہیں منیجر کے کمرے میں"
تانیہ نے بتایا تو وہ سیدھی وہاں چل دی۔ جنید ڈارک گرے سوٹ میں کافی ہینڈسم
لگ رہے تھے اور فون پر باتیں کرتے ہوئے اور بھی چارمنگ۔ وہ دبے
پاؤں قریب چلی آئی لیکن دروازے کے پاس اپنا نام سن کر اس کے پاؤں رک
گئے۔

"ہیریٹا! کم آن میں روما سے شادی کروں گا۔ ہاں گاڈ یا سٹوپڈ
آئیڈیا تمہیں آیا کیسے؟" یہ جنید کی آواز تھی وہ لڑکھڑا گئی۔ میں ذرا فرینڈلی نیچر کا
آدمی ہوں اور اس سے شروع ہی سے ایک دوستی سی ہے لیکن وہ کچھ سمجھ جائے گی۔
میرا اور اس کا رشتہ خالص بزنس ریلیشن شپ ہے اور I respect her
because she is an elderly lady۔ اور یوں بھی روما
منظر مجھے بزنس پارٹنر بنانے والی ہے جو دراسا اور برداشت تو کرنا ہوگا"

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ جانتے کے باوجود کہ مرد
کبھی بھی قابل بھروسہ ساتھی نہیں ہوتا وہ اس پر مر مٹی تھی۔ اور ساتھی تو کیا وہ تو ذرا
دیر کو قابل اعتماد دوست بھی نہیں ہو سکتا نہ جانے کب سے اس کے یقین کی چادر کو
تار تار کر رہا تھا؟ نہ جانے کب سے اپنے لالچ کی عمارت روما کے نازک
خوابوں کی زمین پر رکھ رہا تھا۔ پھر مجھ پر کیوں ان سارے دنوں میں کھل نہیں سکا
وہ شخص اپنی اصل نیچر کے ساتھ I made a fool of myself۔ مجھے
چہروں کے ماسک کے پیچھے سے اصل چہرے دکھائی کیوں نہیں دیتے۔ میں اس
جیسے opportunist کے لئے ایک ایلڈرلی لیڈی ہوں اور بس اور وہ سارا
التفات اس کے اپنے مالی اور ذاتی فائدے کی خاطر تھا۔

"روما مجھے بزنس پارٹنر بنانے والی ہے" اس کے الفاظ کانوں
میں گونج رہے تھے "وہ ایک ایلڈرلی لیڈی ہے"۔ "او مائی گاڈ آئی ہیٹ ہم" نہیں
نہیں آئی ہیٹ آل دی مین ان دی ورلڈ" وہ سوچے جا رہی تھی۔ "خود غرض' مکار'
دھوکے باز" مرد کی صرف یہی definition ہے اور بس۔ اور پھر تھوڑی دیر
گاڑی سڑکوں پر بے مقصد دوڑانے کے بعد کچھ سوچ کر اس نے گاڑی ایک

سمت کو موڑ دی۔

"اوہ بی بی جی آپ ہماری بستی میں" ماسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں آ گئی تھی بستی میں اس کی ملازمت کی مالکن اور ماسی کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے مارے خوشی کے۔

"ماسی! تمہاری بیٹی کی لڑکی بھاگ بھری کی شادی کب ہے؟" اس نے گاڑی سے اتر کر ساری بستی کی عورتوں پر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا جو جانے کہاں کہاں سے ایک منٹ میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس عورتیں اور ننگ دھڑنگ بچے سب اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"اوہ وہ جی نئے چاند کی پہلی تاریخ پر" ماسی نے خوشی سے کہا۔ "نیند والی قریب ہے بھاگ بھری کی ماں جی۔ پر میں نے کہا تھا تو فکر نہ کر میری مالکن ضرور کچھ نہ کچھ مدد کریں گی"۔ ماسی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ "آئیں ناں بی بی جی"۔

"نہیں میں جلدی میں ہوں اندر نہیں آ سکتی"۔ کتنے کام کرنے ہیں ابھی اس نے سوچا۔ اپنے وکیل کو فون کر کے جنید کی بیجنگ پارٹنر شپ کے کاغذات کی تیاری کینسل کروانا اور اپنے بزنس کو باہر شفٹ کرنے کا اعلان' پریس کانفرنس اور اپنے سارے assets کا دفاع' جنہیں مردار گوشت سمجھ کر گدھ کی طرح نوچ لینا چاہتا ہے وہ۔ جذبے ضائع کر دیے مگر اپنے بزنس تم پر ضائع نہیں ہونے دوں گی جنید حال میں کوئی لڑکی کمزور عورت بھی نہیں' وہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی۔

"ماسی تم بھاگ بھری کو لے کر میرے گھر آ جاؤ کافی چیزیں ہیں میرے پاس بھاگ بھری کی شادی کے لئے دوپٹہ اور جیولری وغیرہ" اس نے گویا حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔

"بی بی جی آپ تو کہتی تھیں کہ بہت مہنگے ہیں یہ جوڑے بھاگ بھری اسے وہ...وہ...کیا کہتے ہیں افورڈ نہیں کر سکتی" ماسی نے اس کا بولا ہوا جملہ یاد کر رکھا تھا۔

"بھاگ بھری افورڈ کر سکتی ہے ماسی! لیکن میرے جیسی کوئی 'ایلڈرلی لیڈی' نہیں" اس نے گویا اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے ایکسیلیٹر پر پاؤں دبایا اور گاڑی زن سے دھول اڑاتی ماسی کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"اب پتہ نہیں یہ کیا ہوتا ہے ایلڈرلی لیڈی" ماسی نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا اور رحمتوں اور زبیراں کو اپنی طرف دیکھتا پا کر فوراً بات بنائی۔ "مجھے کہہ رہی تھیں بی بی اب سے میرے ساتھ بی بی انگریزی میں باتیں کرتی ہیں یہاں تو مجھے سب سمجھ آتی ہے۔ چلو بھاگ بھری سے کہو جلدی تیاری کرے" ماسی اور سب بستی والی عورتیں بھاگ بھری کو بلانے نکل دیں۔

بقیہ: بکائن کی کہانی

جاتا تھا لیکن اچانک لڑکی کے والد کو شملی ہسپتال میں داخل کروا دینے کے باعث پہلے سے طے شدہ سارا پروگرام منسوخ ہو گیا تھا میرے والد ان کی اچانک بیماری کا سنتے ہی انہیں دیکھنے چلے گئے تھے میں گھر پہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی وجہ سے رہ گیا تھا سوچا یہ تھا کہ والد کے آنے کے بعد میں اپنے ہونے والے سسر کی عیادت کو جاؤں گا...... لیکن سرجی اس بات کا موقع ہی نہیں آیا...... لڑکی کے گھر کے تمام افراد جن میں میری منگیتر بھی شامل تھی اپنے والد کی تیمارداری کی غرض سے وہیں شملی ہسپتال میں تھے۔ علاج معالجے کے بعد جب سب لوگ جن میں میرے والد بھی شامل تھے...... مریض کو لے کر لاری میں واپسی کا سفر کر رہے تھے تو......"

یہاں پہنچ کر نذر دین اپنے جذبات پہ قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار رونے لگا...... میں نے کار روک کر ایک طرف کھڑی کی اور اسے گلے سے لگاتے ہوئے دلاسہ دیا...... میں سمجھ گیا تھا کہ اب یہ کہے گا کہ لڑکی کے والد کو گھر تک پہنچنا ہی نصیب نہ ہوا اور ان کا لاری ہی میں انتقال ہو گیا...... یا پھر اسی وضع کی کوئی اور بات...... لیکن جو کہانی اس نے سسکیاں لیتے ہوئے سنائی... وہ انتہائی الم ناک تھی......

"میں... سرجی... سنانے والے کے مطابق... جو اس لاری میں موجود سواریوں میں سے بچ جانے والا واحد شخص تھا... لاری اپنے مسافروں کو لئے ہوئے جب دریا کے پل پر عین وسط میں پہنچی... تو جیسے یہی وہ مقام تھا جس کی نشاندہی شاید قدرت پہلے سے کر چکی تھی... وہاں پہنچتے ہی لاری ڈرائیور کے ہاتھوں سے بے قابو ہو کر سڑک کے گرد موجود جنگلے کو توڑتی ہوئی دریا میں جا گری... اور نیچے کوئی ساٹھ فٹ کی گہرائی میں برسات کے بپھرے ہوئے دریا کی موجوں کی نذر ہو گئی... نہ لاری کا پتہ چلا نہ اس میں موجود کسی فرد کا... لاری میں موجود پوری سواریوں میں سے بچ جانے والا واحد شخص' جس نے ہسپتال میں کئی ماہ گزارے... بعد میں یہ کہانی سنائی... بس جی میری تو دنیا اندھیر ہو گئی... میں کس کس کو یاد کروں......؟ کسے بھول جاؤں......؟ اس لڑکی کو جو میری روح اپنے ساتھ لے گئی...... یا اپنے والد کو جنہوں نے مجھے بے حد پیار کیا۔ میرے پاس تو اب نہ دل ہے نہ روح... کچھ عرصے کے بعد میں اپنے مختصر سے خاندان کو لے کر پہلے کراچی چلا گیا اور اب کئی برس سے یہاں آپ کے قدموں میں ہوں......"

نذر دین کئی برس میرے ہاں کام کرتا رہا... پھر میں نے اُسے اپنے ایک دوست کی معرفت لیبیا میں باہر بھجوا دیا...... ایک مدت تک اس کے خطوط آتے رہے... معلوم نہیں اب وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے......؟ کیا معلوم اُسے اب بھی نیند آتی ہے یا نہیں......؟

میری والدہ کی قبر پہ نذر دین کے ہاتھوں کا لگایا ہوا بکائن کا پودا اب ایک گھنیرا سایہ دار درخت بن چکا ہے...... اور نذر دین کی یادوں کی جڑیں میرے دل کی گہرائی میں اتر چکی ہیں۔

مشتاق نگاہیں

گلزار جاوید

رات کے پچھلے پہر زوردار دھماکے سے کھڑکی کے پٹ کھلنے کے باعث بنا بنایا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ گھور اندھیرے میں کچھ دکھائی دیتا نہ سجھائی آتا تھا۔ حافظے کی غیر حاضری اور اعصاب کا اضمحلال نیم مردنی کیفیت پیدا کئے ہوئے تھے۔ چند ساعتوں تک اندھیرے میں ہاتھ ٹوئیاں مارنے کے بعد ٹیبل لیمپ کا بلب روشن ہوا تو خود کو اپنے گھر اپنے بیڈروم میں پا کر حیرت اور حسرت کا احساس شدت اختیار کر گیا۔ بڑی بڑی کشادہ پیشانی، کنول جیسی روشن آنکھیں، ریشم جیسے بال، پتلے ہونٹ اور گدرایا بدن کا تصور ذہن میں تازہ ہو رہا ہے۔ ڈھن ڈھن کمرے کی اداسی اور پُراسراریت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کمرے کے باہر بارش کی ٹپ ٹپ اور ہوا کی سائیں سائیں نے ماحول کو داخلی نظم کی ماتمیت ناک بنا دیا ہے۔ درختوں پر پھڑپھڑاتے پرندے اور برسات کے پانی میں ٹرّاتے مینڈکوں کے علاوہ دور سے فائر بریگیڈ کے سائرن کی آواز نے دل کے بوجھ میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ خدا معلوم آج کس کے نصیب میں دربدری، مفلسی اور زمانے کی بے وفائی کا باب رقم ہونے کو ہے؟ بے رنگی اور بے کلی میں دور سے آنے والی یہ آواز بہت سے نئے اور پرانے زخموں کو ہرا کر رہی ہے۔

ـــ اوروں کے ساتھ ہم کو بھی ساتھ لے لے ہم رہ گئے اکیلے

کوئی بھولا بھٹکا مسافر تھکا ہارا ہو گا یا محلے کا چوکیدار اندرونی کیفیات کو ترنم کے ساغر میں بہا کر جی کا بوجھ ہلکا کر رہا تھا۔

سب کچھ مانوس، اپنا، انجانا اور ان دیکھا ہوتے ہوئے بھی اجنبیت کا قطعی احساس نہ تھا۔ میلے کی رونق اس قدر حقیقی، جاندار اور زندگی سے بھرپور تھی کہ خود کو گم کرنے، کھونے یا کھو کر پانے کو جی بے قرار تھا۔ سرمستی و سرشاری کی اس کیفیت میں میزبانوں کی محبت اور میلے میں شریک لوگوں کے والہانہ پن نے چراغ سے چراغ جلانے کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جب بھی میزبان کسی خوانچہ فروش، دکاندار، سرکاری اہلکار یا میلے میں شریک کسی شری مان، شری متی سے ہمارا تعارف کراتے تو وہ اس قدر اپنائیت، محبت اور اپنے پن کا اظہار کرتا کہ ہم شرمندگی کے احساس سے دوچار ہو جاتے۔ سٹال والے، پنڈال والے، سرکس، سینما، تھیٹر والے ہماری شناخت کے بعد پیسے لینے سے اس طرح انکار کر دیتے جیسے وہ ہمارے سگے سمبندھی ہیں۔ راہ چلتے لوگ، پان، بیڑی، سگریٹ، مشروبات اور کھانے پینے کی دیگر اشیا کی پیشکش اس قدر محبت، خلوص اور اپنائیت سے کرتے کہ ہمیں قدرت سے اکیلے پیٹ کے لئے گلہ مند ہوتے تو جی چاہتا۔ دل میں خوشی کے بلبلے اٹھنے کی وجہ اس سونے پیکر کا مسلسل اشتیاق اور طواف بھی تھا جس کی تعریف کے لئے تمام تر شاعری، مصوری اور رنگ ناکافی تھے۔

عارضی اور وقتی طور پر بنائے گئے اس میلے میں بہت سے مستقل، پائیدار، اونچی اور لمبی بیلوں کی نسبت زیادہ نظم و ضبط اور زیادہ اہتمام تھا۔ ترپالیں، ٹین اور جست کی چادروں کی چھتوں کے گرد وتنوں، شامیانوں، قناتوں سے بنے بیرسٹال، دکانیں اور پنڈال جگ مگ کرتے بجلی کے قمقموں میں، زندگی کی تمام ضروریات سجائے، میلے میں شریک لوگوں کی خدمت و میزبانی میں کچھ اس طرح مصروف تھے کہ شادی مرگ کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ کچی زمین پر خاکہ کر اور بجری ڈال کر دونوں اطراف ٹیوب نما سفید لائٹیں لگا کر میلہ دیکھنے والوں کے لئے پیدل چلنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ گرد و غبار سے بچنے کے لئے برسا پانی کے چھڑکاؤ نے مٹی کی سوندھی خوشبو اور جابجا نہایت ارزاں نرخوں پر فروخت ہونے والے پینے کے ٹھنڈے پانی کے گھڑوں کے گرد منڈھے ہوئے موتیے کے ہاروں نے ماحول کو سحر انگیز، خوشگوار اور رومانٹک بنا دیا تھا۔ دور دور پیدل راستوں کے درمیان بجلی کے کھمبے قطار در قطار نصب کر کے پیدل چلنے والوں کے لئے سہولت مہیا کی گئی تھی۔ اس کے باوجود شب کے اوقات میں اکثر دونوں اطراف کے لوگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر بے قابو ہجوم کا منظر پیش کرنے لگتے۔ بجلی کے کھمبوں کی درمیانی سطح پر مختلف اشیا کے تشہیری بورڈ آویزاں تھے جبکہ اوپری سطح پر لاؤڈ سپیکر نصب کئے گئے تھے جن پر مشہور فلمی گانوں کی ریکارڈنگ کے دوران طرح طرح کے اعلانات کا سلسلہ جاری تھا۔ لاؤڈ سپیکر اس دوہری خدمات کے باعث اس ریڈیو سیٹ کا منظر پیش کر رہے تھے جو بیک وقت ایک سے زیادہ اسٹیشن کیچ کرنے لگتا ہے۔

"بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے"..... ایک بچہ جس کا نام منوہر لال عمر سات سال، رنگ گورا، بال گھنگریالے اور قد چھوٹا ہے، ماتا پتا سے بچھڑ گیا ہے۔ جن صاحب کو ملے کرپا کر کے شو گیٹ پر پہنچا دیں..... "آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے"..... راشد صاحب، شری راشد سے بنتی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، ہاشمی عطر والے کی دکان پر پہنچ جائیں۔ ان کا پریوار ان کی راہ دیکھ رہا ہے..... "حسن والے تیرا جواب نہیں، کوئی تجھ سا نہیں ہزاروں میں"..... سردار گوربچن سنگھ سے بنتی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں کوئی سیلی کے پنڈال میں پہنچ جائیں..... "تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا"..... سمیر پرویز، شری سمیر پرویز جہاں کہیں بھی ہوں حلوہ پراٹھے والے کی دکان پر پہنچ جائیں، ان کے محترم زاہد صدیقی ان کا انتظار کر رہے ہیں..... "دل جو نہ کہہ سکا وہی راز دل کہنے کی رات آئی"..... سیاتندریاگی، شری سیاتندریاگی سے بنتی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں تماشا گھر

کے دفتر پہنچ جائیں جہاں کمیٹی کے ارکان کرم چاری اُن کا انتظار کر رہے ہیں..... "آج کی رات میرے دل کی سلامی لے لے دل کی سلامی لے لے"..... ایک چند بیگ جس کا رنگ کالا بھورا ہے پولیس کو لاوارث پڑا ہوا ملا ہے۔ جن شہریان شہر کی کا ہو نشانی بتلا کر نمائش پولیس چوکی سے لے جائیں۔

اس کے علاوہ اپنے وقت کے مشہور فلمی گانوں کی ریکارڈنگ کے دوران وقفے وقفے سے کیمرہ، موبائل، گھڑی، جیبی پرس وود دیگر قیمتی اشیا کے علاوہ عزیزوں، دوستوں، رشتہ داروں اور بچوں کے لئے بچھڑنے کے اعلانات کے ساتھ نمائش انتظامیہ کی طرف سے ترتیب دیے گئے تفریحی پروگرام ناٹک، مشاعرہ، مذاکرہ، قوالی، کوی سمیلن اور فلمی اداکاروں کے پروگرام کے دن، وقت، ٹکٹ، پاس و قیمت ناموں کی دستیابی وغیرہ کی بابت چیختی آوازوں میں پیدل اور گھڑ سوار پولیس کے چاک و چوبند دستے نمائش میں شریک لوگوں کو دست بازو پر چلتے بچوں کو مضبوطی سے تھامنے، چور اُچکوں اور جیب کتروں سے ہوشیار رہنے کی بلند آواز میں تاکید کے ساتھ نوجوانوں اور مشکوک چلنے کے لوگوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے آج کے مشاعرے اور اُس میں شریک شعرا کے ناموں کا اعلان بھی ہو رہا تھا۔ اپنے نام کے اعلان پر ہمارے دل کی دھڑکن تیز اور بے ترتیب ہو رہی تھی۔

نمائش میں جا بجا چھوٹے خوانچہ فروش اور سٹالوں پر کھانے پینے کی ہلکی پھلکی اشیا مثلاً پیزا، برگر، سینڈوچ، چائے، کولڈ ڈرنک، مشروبات، پوپ کارن، بسکٹ، چاکلیٹ، چیونگم اور پان مسالے کے علاوہ باقاعدہ کھانوں کے دو بڑے بازار الگ الگ سجائے گئے تھے۔

دائیں جانب کھانوں کا بازار دیسی اور شدھ گھی کے پکوانوں، مٹھائیوں اور طرح طرح کے مشروبات سے مہک رہا تھا۔ رنگ برنگے جھنڈے جھنڈیاں، ہار پھول، قومی رہنماؤں کی تصاویر اور چھڑکاؤ نے صفائی ستھرائی کو چار چاند لگائے ہوئے تھے۔ ہر سو پچاس قدم کے بعد کھانوں کے ذائقے، خوشبو اور سجاوٹ کا انداز جدا ہو رہا تھا۔ ہر دکان کے باہر آویزاں مارکی بینر اُن کے علاقوں اور کھانوں کی خصوصیات سے بھرے ہوئے تھے۔ کھانے کے سب سے بڑے بازار کی خصوصیات میں حلوہ پراٹھا، پوری اور چھولے کی بھاجی، بتھوے کا ساگ، دیسی گھی میں تلی ہوئی اُرد کی دال بھری کچوری، طرح طرح کے اچار، دہی بڑے، پانی کے بڑے، مٹھائی، نان خطائی، گجراتی جلیبی، اِمرتی، لڈو، ربڑی اور قلفی پر لوگوں کا ہجوم بے حساب تھا۔ اس سے ذرا آگے کھانے کے مخصوص سٹالوں اور ریستورانوں پر بگھارے چاول، بینگن کا بھرتہ، گڑھ کے پاپڑ، دال بڑی، دہی پھلکی، آلو کے کباب، مکئی، چٹنی، اچار، قلاقند اور مشروبات میلے میں شریک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر بگھارے بینگن، آلو کا بھرتہ، پاؤ بھاجی، بھنڈی کی ترکاری، مٹر کی چاٹ، پینگ کے پاپڑ، گاجر کا حلوہ، ربڑی اور دہی ملائی کا شور تھا۔ مزید آگے بڑھنے پر مچھلی کری، مچھلی فرائی، مچھلی روسٹ، جھینگے کی ترکاری، پالک پنیر، لڈو کری، دال بھات، رس گلوں اور چم چم کا اہتمام تھا۔ ساتھ کے بازار میں کڑھی، کھڑے مسالے والی اڑہر کی دال، آلو بڑے، کھٹے میٹھے اچار، باجرے کی روٹی، مونگ کی دال کے پاپڑ، کھٹے بینگن اور طرح طرح کی چٹ پٹی اور لذیذ بھاجیوں کے ساتھ شیرے میں ڈوبی نہایت نرم اور گرم گلاب جامن، پیٹھے کی مٹھائی اور پیڑوں کی بہت مانگ تھی۔ کھانوں کے آخری بازار میں مکئی کی روٹی، سرسوں کا ساگ، چنے اور ماش کی بھاری دال، چھولے بھٹورے، پنیر، مٹھائی، حلوہ پوری، نان کڑاہی، تکہ تا اور ڈھولکی کی زوردار آوازیں لگ رہی تھیں۔

ہر عمر، ہر ذوق اور ہر مزاج کی حامل، جینز، سکرٹ، ساڑھی اور شلوار قمیض میں ملبوس نوجوان لڑکیاں، عورتیں اور بڑی عمر کی خواتین، ماتھے پر بندی اور مانگ میں سیندور سجائے، کوٹ پتلون، جینز، ٹی شرٹ، سفاری سوٹ، قمیض پاجامہ، دھوتی کرتا، لاچا، پگڑی، واسکٹ اور صافہ باندھے ہوئے مردوں کے ہمراہ اپنی پسند کے سٹالوں، ڈھابوں اور ریستورانوں پر کھانوں کے ساتھ اُن کی لذت اور نفاست پر دھیمے لہجے میں خوش گپیوں کے ساتھ قومی و علاقائی موسیقی سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

بائیں جانب کھانوں کا بازار تیز خوشبو رنگ برنگے ظروف، ہار پھول، پکوانوں اور باڈی بلڈرز کے قد آور پتلے اور تیز ریکارڈنگ کے شور میں بلا کسی تخصیص کے لذیذ اور گرم گرم خوشبودار کھانوں کے باعث بے پناہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ حلوہ پراٹھا، سیخ کباب، شامی کباب، قورمہ، تکہ، شیرمال، حلیم، بریانی، قیمہ، کلیجی، مغز، نہاری، بونگ، پائے، بٹ نان، چپاتی کی جانب کالے، پیلے، نیلے، کتھئی اور سفید برقعوں میں سر تا پا ڈھکی چھپی، کچھ کے چہروں پر پورا نقاب، کچھ کے نصف چہرے کھلے ہوئے تھے۔ بہت سی نوجوان بچیاں، لڑکیاں اور کم عمر خواتین برقعوں کے بغیر قمیض شلوار دوپٹہ، ساڑھی، چوڑی دار پاجامہ، غرارہ، شرارہ اور جینز، شرٹ میں بھی ملبوس تھیں۔ کچھ خواتین کے ماتھے پر لگی بندی اُن کی پہچان میں آڑے تھی۔ اُن کے ہمراہ آئے ہوئے مردوں نے قمیض پاجامہ، تہبند کرتا، جینز، ٹی شرٹ، سفاری سوٹ اور کچھ نے جینز، کوٹ بھی زیب تن کیا ہوا تھا۔ کئی جوانوں اور بڑے بوڑھوں کے سروں پر رامپوری کیپ، جناح کیپ، ترکی کیپ، لکھنوی دوپلی اور افغانی ٹوپیوں کے علاوہ پگڑی اور صافہ بھی بندھا ہوا تھا۔ کچھ کے چہروں پر کالی، سفید اور خضاب زدہ داڑھی اور کچھ کے ہاتھوں میں تسبیح بھی نظر آ رہی تھی۔ بیشتر بڑی عمر کی عورتوں کی گود، ہاتھ یا قد تھامے ہوئے پانچ، سات، دس سال کی عمر کے بچے اپنی ماؤں، بہنوں اور خالاؤں کی طرح کھانے پینے میں منہمک تھے۔ نوجوان اور پکی عمر کے مردوں کی گود میں سال، ڈیڑھ سال اور دو سال کے بچے دونوں ہاتھ بڑھا کر کھانوں کی جانب لپک رہے تھے۔ اُن کے باپ، بھائی، چچا، تایا، ماموں اُن کے منہ میں چھوٹے

چھوٹے لقمے دیتے کے ساتھ بچوں کی بہتی ہوئی رال، ناک اور پسینہ پونچھنے میں بھی مصروف تھے۔

کھانے پینے کی اشیا کے دو باقاعدہ اور الگ الگ بازاروں کے علاوہ ایک مختصر کا بازار دہی بڑے، پاپڑی کے بڑے، فروٹ چاٹ، مٹر چاٹ، چنا چاٹ، لوبیا چاٹ، بھیل پوری، گول گپے، پکے، ادرک وغیرہ کا الگ اور سلیقے سے سجایا گیا تھا جہاں اُبلے ہوئے آلو، فنکاری سے کٹی ہوئی پیاز، مہارت سے ترشے ہوئے ٹماٹر، گول کٹے، چکور کٹے ہوئے کیلے، پپیتا، آڑو، انناس، کھیل، بڑھل، کیلے، امرود، ناشپاتی، تیز کوٹ شکر سے اور پکوڑے کے درمیان ہری مرچوں اور طرح طرح کے چٹ پٹے مسالوں کو سجا کر آنے والوں کو لبھایا اور پر چلایا جا رہا تھا۔

برف کی ثابت سلوں پر سجے گلدستوں کے چہار جانب گلاب اور موتیا کے پھول سجاوٹ اور چنگیزی کو خوب چار چاند لگا رہے تھے۔ بہت سے نوجوان اور خوبصورت جوڑے اپنی پسند کی اشیا کا آرڈر دے کر دنیا و مافیہا سے بےخبر سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ بہت سے اپنے عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو دیکھ کر پہلے سے دیا ہوا آرڈر ڈبل کر دیتے یا آنے والوں کی پسند کے مطابق اُن کے ہمراہ کسی اور جانب نکل پڑتے۔

اس چٹ پٹے اور کھٹے میٹھے بازار سے متصل منہ کا ذائقہ بدلنے اور بھرے ہوئے معدوں کو آرام پہنچانے کے لئے ایک دھرم پان بازار الگ سے سجایا گیا تھا جہاں تمام ملکی و غیر ملکی مشروبات، دیسی ساخت کی مشینوں پر تیار کردہ سوڈا واٹر، آئس کریم، قلفی، پان، بیڑی، سگریٹ، سگار اور ہر قسم کے پان مسالے مشہور زمانہ فلمی ہیرو و ہیروئن کے طور پر چٹخاروں کے بیچ دیسی، بمبئی، ساتھی، بنگلہ اور ہماری پانوں میں مراد آبادی زردہ، حیدرآبادی قوام، جبل پوری چھالی، پتی، لکھنؤ کا نوابی زردہ، بہار کا کتھا، چونا، الائچی، سپاری، کتھا اور خوشبودار پان کھانے والوں کے ہمراہ طرح طرح کے برانڈ اور طرز کے سگریٹ سلگا کر نئے اور پرانے سگریٹ نوش ہوا میں دھوئیں کے مرغولے اُڑا رہے تھے۔ منچلے نوجوانوں کی اکثریت دائیں سوڑھے میں پان دبا کر کلّے کی بائیں جانب سگریٹ دبا لیتے اور لمبے کش لیتے ہوئے اپنے دائیں بائیں گزرنے والی حسیناؤں پر آوازیں کستے ہوئے سگریٹ کا دھواں اُن کی جانب اُڑا دیتے۔ دوسری جانب سے سخت سست جملے سننے کے بعد بہت سے نوجوان "ہر ہے" کا نعرہ زور سے بلند کرتے، کچھ سرد آہیں بھرتے ہوئے ماتھے پر پڑی زلفوں کو اپنی پسند کے فلمی ہیرو کے انداز میں جنبش دے کر شخصیت کا رعب جمانے کی ناکام کوشش کرتے۔ کچھ کا انداز گفتگو بے ہودہ اور بے باک ہو جاتا اور اُن کے منہ سے خاص قسم کی بو کے بھبکے اُٹھنے کے باعث آس پاس سے گزرنے والے لوگ ناک پر ہاتھ یا رومال رکھ کر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ہمراہ آئی ہوئی خواتین کو لے کر جلد سے جلد وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے۔

کھانے پینے سے فراغت کے بعد نمائش میں شریک بیشتر خاندان اور کنبے خریداری کے لئے سجے خاص بازاروں کا رخ کرتے جہاں ملک کے کونے کونے سے مشہور و معروف اشیا کے اسٹال اپنی روایت، ہنرمندی، تجربہ اور مہارت کی تاریخ کے ہمراہ اپنے قدردانوں کے منتظر ہوتے۔ نوجوانوں کی اکثریت تھیٹر، سنیما، سرکس، موت کے کنویں اور نوٹنکی، مجرے اور سوانگ دیکھنے نکل پڑتے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی معقول تعداد نمائش کے منوّجی پنڈال میں اپنی پسند کے پروگرام دیکھنے کا اشتیاق رکھتے۔

کچھ دیر کے لئے ہم بھی اپنے میزبانوں کے ہمراہ نوجوانوں کی پیروی میں ہاؤ ہو کی جانب نکل پڑے جہاں دو چہرہ اور ایک دھڑ کی عورت دیکھنے والوں کا رش اپنی باری کے لئے ٹکٹ کی لائن میں لگا ہوا تھا۔ عورت کا جسم چادر سے گلے تک ڈھانپ دیا گیا تھا اور اس کے ہاتھ پیر کھلے ہوئے تھے۔ نہ کوئی شریف آدمی عورت کا جسم ڈھانپنے کی وجہ دریافت کرتا تھا نہ کوئی عورت سے اس کے عجیب الخلقت ہونے کی بابت کوئی معلومات لے رہا تھا۔ سب لوگ حسبِ توفیق عورت کی چادر پر چند سکے ڈال کر شوکیں لیلی اور صفا کی قدرت پر عش عش کر رہے تھے۔ ہماری اور ہمارے مہمانوں کی اگلی منزل ہنسی کے گول گپے کا سٹال تھا جہاں چھوٹے بڑے سائز کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ ان شیشوں کی مدد سے ہر عمر و قماش کے لوگ جی کھول کر ہنس رہے تھے۔ اس ہنسی کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ کسی دوسرے پر ہنسنے کے بجائے ہر کوئی اپنے آپ پر ہنس رہا تھا۔ کسی شیشے میں دیکھنے والے کا پیٹ اُبل کر باہر نکل آتا اور دھوبی کے میلے کپڑوں کی گٹھڑی جیسی کی شکل یا پانی کے گھڑے کا منظر پیش کرنے لگتا۔ کسی شیشے کے سامنے آ کر انسان کے دونوں گال لٹک کر خوف ناک صورت اختیار کر لیتے۔ چلتے چلتے اچانک آدمی کی چیخ نکل جاتی اور وہ بلا اختیار اس شیشے کے سامنے سے ہٹ کر دوسرے شیشے کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ اس شیشے میں دیکھنے والے کی آنکھیں اپنی جگہ سے ہٹ کر کبھی کانوں سے مل جاتیں، کبھی گالوں، ٹھوڑی، ناک اور ہونٹ سے آملتیں۔ اس منظر سے بھی کچھ لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر اور کچھ اپنی ہیئت کذائی سے گھبرا کر دوسرے شیشے کا رخ کرتے جہاں پہنچتے ہی دیکھنے والے کا قد کبھی اُس کے گھٹنوں کے برابر ہو جاتا اور کبھی آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔ وہ مشتاق نسوانی آنکھیں مسلسل ہمارے طواف میں تھیں۔ جہاں لوگ باگ اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکتے تھے، قدرت کے اس حسین شاہکار کے چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہو کر دیکھنے والے کو بیتاب کرنے کے لئے کافی تھا۔

اس کے بعد مہمانوں کے اصرار پر ہم لوگ ایک تھیٹر میں چلے گئے جہاں کئی جوکر چہرے اور حلیے بدل بدل کر باری باری اسٹیج پر آ کر کبھی جیب سے رومالوں کا ڈھیر نکالتے تھے، کبھی ٹوپی کے اندر سے طوطا اڑانے لگتے، کبھی پانی

پھر سے گلاس کو الٹا کر کے دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کرتے اور کبھی چھڑی کے زور سے آگ کے شعلے بلند کر کے ہاتھ کے مخصوص اشارے سے انہیں غائب کر دیتے تھیز دیکھنے والوں میں سمجھ بوجھ اور عقل کے لوگوں کے باوجود تماشا لوگ بچوں کی طرح تالیاں بجا کر جوکروں کو داد دے رہے تھے کوئی کوئی منچلا نوجوان اُن کی جانب سکے بھی اچھال رہا تھا مگر کسی کو جوکروں کے شعبدوں کی بابت کسی طرح کی جستجو اور اشتیاق قطعی نہ تھا۔

انسانوں کے کرتب شعبدے اور کمالات دیکھنے کے بعد ہم لوگوں کا رُخ حیوانات کی ہنرمندی اور مہارت کی جانب تھا جہاں شیر، ببر شیر، ہاتھی، گھوڑے، ریچھ، بن مانس، بندر، لنگور اور طوطے اپنے اپنے فن کے کمالات دکھا رہے تھے۔ شیر، ببر شیر کا رنگ ماسٹر کے ہاتھ میں تھامے ہوئے ہنٹر اور شعلے کے سامنے گیدڑ بنے کا منظر بڑا دیدنی تھا۔ ہاتھی کا اپنے سایبان کے ساتھ فٹبال کھیلنا اُس کے حکم پر دیکھنے والوں کو جھک جھک کر سلام کرنا اور مخصوص گانے کی دھن پر جھوم جھوم کر ناچنا اور سنگتا بھی حیران کر دینے والا تھا۔ ڈگڈگی اور بانسری کی آواز پر ریچھ کا ڈانس اور لوگوں کو چڑانے کے لئے جوکر کا روپ دھارنا بھی دلچسپی کا حامل تھا۔ بندر اور لنگوروں کی عقل مندی اور دوستی نوک جھونک کی رودادبھی سرکس دیکھنے والوں کے لئے تفریح کا بہترین سامان فراہم کر رہی تھی۔ سرکس کا سب سے اہم اور سبق آموز آئٹم وہ تھا جب ایک بگھی میں سوار تومند اور بڑا کا نوجوان ہاتھ میں ہنٹر لئے سرکس کے عین درمیان میں آ کھڑا ہوتا ہے جیسے ہی اُس کے اشارے پر طوطا توپ چلاتا ہے تمام ہاتھی، گھوڑے، شیر، ببر شیر، ریچھ وغیرہ ہم جماعت ہو کر اُس کے ایک اشارے پر پیر سے پیر ملا کر پریڈ کرتے ہوئے ایک قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جادوگر سامری طرز کا لباس پہنا ہوا شخص ہنٹر اور چھڑی کی مدد سے انہیں اس طرح ہانکنے لگتا ہے جیسے وہ شیر، ببر شیر، ہاتھی، گھوڑا، ریچھ وغیرہ نہیں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہیں۔

سرکس کی انہونی نرالی اور بے زبان دنیا دیکھنے کے بعد ہمارا رخ شہر شہر قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں کی بنی ہوئی نادر و نایاب مصنوعات کے بازار کی جانب تھا۔ یہاں بھی ہر علاقے کی مشہور و معروف اشیا کے الگ الگ بازار بڑے بڑے خوشنما عارضی خیموں اور طرح طرح کی سجاوٹوں کے ساتھ گاہکوں کو اپنی اُور کھینچنے میں مصروف تھے۔ سب سے پہلے جس بازار میں ہم داخل ہوئے وہ نقشین و سادہ، پیتل، تانبے اور سٹیل کے برتنوں کا بازار تھا جہاں شیروانی، کھڑے پاجامے، تنگ پاجامے اور رام پوری کیپ میں ملبوس خوش شکل اور خوش وضع دکاندار صحنوں میں پانوں کی ڈبی اور ہاتھوں میں تمباکو اور سپاری کا چنٹ دار گول بٹوا تھامے پاس سے گزرنے والوں کو مہذب انداز میں آواز دے کر متوجہ کر رہے تھے۔ جو شخص یا خاندان اُن کی آواز پر لبیک کہتا اُسے احترام سے بٹھا کر پان پیش کیا جاتا پھر اُس کی ضرورت کی اشیا دکھائی جاتیں۔ لوٹا، بالٹی، دیگچی، جگ، گلاس، کٹورا، پاندان، اُگالدان، گروش، حقہ، حمام اور پتیلی کے مختلف سائز اور مختلف ڈیزائن دکھا کر خریدار کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کر دی جاتی۔

برتنوں کے بازار سے ملحق ریشمی کرتوں، پاجاموں اور ترکی ٹوپیوں میں ملبوس دکاندار طرح طرح کے چھری، چاقوں، اُسترے، نہروے اور پھل کاٹنے کے دیگر آلات سجا کر گاہکوں کو رجھانے میں مصروف تھے۔ یہاں پر پیاز کاٹنے کی چھری الگ ہے تو آلو کاٹنے کے چاقو کا ڈیزائن مختلف ہے تو بوز کاٹنے کی چھری کا سائز بڑا ہے تو آم کاٹنے کی چھری الگ وضع کی ہے غرض انتقا کاٹنے کے اندر بھی ہنرمندی اور فنکاری کا ایک جہان پوشیدہ تھا۔ ایک بار آپ اُن کی دکان پر چلے جایئے پھر وہ چرب زبانی اور ہنرمندی کے سحر میں آپ کو اس طرح گرفتار کریں گے کہ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ خرید کر اُن کی دکان چھوڑیں گے۔

چاقو، چھری، اُسترے، نہرنا وغیرہ کے بازار سے ملحق ہی ٹوپیوں کا بازار تھا جہاں مخمل، جھنجھٹ، پلیلی، بروکیٹ اور ململ کی ٹوپیاں، رام پوری کیپ، جملی گڑھ کٹ کیپ، حیدرآبادی کیپ، نہرو کیپ، گاندھی کیپ، جناح کیپ، لکھنوی اور لئے آبادی و بنارسی کیپ سے لے کر ہر علاقے کے ڈیزائن، وضع، قطع کی ٹوپیاں بہت سے دکانداروں نے خود بھی پہن رکھی تھیں اور وہ گاہکوں کو بھی مختلف ڈیزائن، رنگ اور سائز کی ٹوپیاں پہنا کر شیشہ دکھاتے اور گاہک کی شخصیت میں باتوں کے چار چاند لگا دیتے۔

تھوڑے ہی فاصلے پر سجا بازار دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مہذب و شائستگی کے تمام تر دعووں کے باوجود دنیا میں چھروں، ڈاکوؤں اور رہزنوں کا راج ہے۔ اس بازار میں ہر دکان پر مختلف شکل، ڈیزائن اور سائز کے تالے اُن کی کارکردگی اور اُن کی بناوٹ میں استعمال کی گئی تکنیک کے علاوہ بنانے والوں کی تاریخ اور شجرہ بھی آویزاں کیا گیا تھا۔ یہاں چابی اور بغیر چابی کے ایک تولے سے لے کر ایک من تک کا تالا اور اُسے کھولنے توڑنے یا کاٹنے والے کو منہ مانگا انعام کے دعوے بھی درج تھے۔

ذرا سے فاصلے پر سجا بازار میں چھوٹی، بڑی، درمیانی، چوڑی، موٹی، پتلی، گھریلو اور کاروباری استعمال کی قینچیوں اور اُن کے استعمال میں ہنرمندوں کی مہارت اور خاص لوہے کے استعمال سے لے کر اس قدر خصوصیات گنوائی گئی تھیں کہ انہیں پڑھنا اور پڑھ کر یاد رکھنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ بہرحال قینچے پر چھپے اس مخصوص اس بازار کی رونق بہت سے بڑے بازاروں سے اس لئے بھی زیادہ تھی کہ لوگ باگ یہاں سے نہ صرف اپنے لئے قینچیاں خرید رہے تھے بلکہ دور دراز سے آنے والے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی فرمائش پر انہیں تحفے میں ارسال کرنے کے لئے اضافی قینچیاں بھی خرید رہے تھے۔

اس کے بعد جس بازار سے ہمارا گزر ہوا اُس میں ہر دکان پر مرزا،

نوشہ اور بانکے انگرکھا اور دوپلی ٹوپی پہنے نقشین حقہ سجائے گاہ بگاہ کش لیتے اور آنے والوں کو حقے سے شوق فرمانے کی دعوت کے ساتھ ٹھنڈا گرم کالا سفید سُرمہ کاجل چھوٹی بڑی فی شیشیوں میں سجائے آنکھوں کے جملہ امراض کالا موتیا' سفید موتیا' پانی بہنا' سُرخ جھالا دکھائی دینا' بھینگا پن اور سر درد وغیرہ کا علاج بذریعہ سُرمہ اور کاجل کرنے کے دعوے کر رہے تھے۔

اگلا بازار چادریں' پردے' شال' توشک' دوپٹے' رومال' دسترخوان' میز پوش' تکیہ پوش اور تکیے کے غلاف وغیرہ کی سوغات کے لئے مشہور تھا اُس سے اگلا چینی کے برتن کے حوالے سے خاص تھا۔ اُس سے اگلا کنگھی' کنگھا کلپ وغیرہ کے لئے مشہور تھا۔ اس کے ساتھ والے بازار میں رنگین و سادہ کھنکنے والی چوڑیوں اور کڑوں سے آراستہ تھا۔ اس کے ساتھ والے بازار میں غازہ' مسّی' کریم' پاؤڈر' مہندی سے بھار سنگھار کے دیگر سامان سے بھرا ہوا تھا۔ بازاروں کے آخری سرے کے بازار میں ہوزری کا سامان سجا ہوا تھا جس میں زنانہ انڈر گارمنٹ کی نمائش بھی سرِ عام ہو رہی تھی۔

اس کے علاوہ مشہور سوغاتوں اور مصنوعات کی ملکی اور غیر ملکی کمپنیوں کے چھوٹے بڑے اسٹال اور پنڈال اور جہازی سائز کے شوروم لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے جہاں کمپنیوں کے خوش شکل' خوش لباس اور تیز طرار سیلز مین' سیلز گرل مہارت اور خوش اخلاقی سے اپنی مصنوعات کی مانگ' سپلائی اور کوالٹی کی بابت معلومات بھی مہیا کر رہے تھے اور رعائتی نرخوں پر مصنوعات فروخت کرنے کے ساتھ کچھ کمپنیوں کے مارکیٹ نمائندے آرڈر بک کرنے اور ریکوری وصول کرنے میں زیادہ مصروف نظر آرہے تھے۔

خدا معلوم ہمارے میزبانوں کا ارادہ اور نیت کیا تھی کہ اچانک لاؤڈ سپیکر پر مشاعرے میں شریک شعراء کی طلبی کے اعلانات ہونے لگے۔ مشاعرہ پڑھنے کا ہمارا پہلا موقع تھا نہ ہم تو آسودہ شعراء میں شمار ہوتے ہیں پھر بھی دل بَلیوں اُچھل رہا تھا۔ مشاعرے کی مناسبت سے خاص تیاری کے علاوہ چند مشہور اور پِٹے ہوئے اشعار دل میں دہراتے ہوئے جیسے ہی ہم مشاعرے کے پنڈال میں پہنچے' سٹیج سیکرٹری نے ہمارے تعارف کے لئے مبالغے کی مدد بھی حاصل کرلی۔ پنڈال اور سٹیج پر بیٹھے ہوئے جونیئر سینئر شعراء نے کھڑے ہو کر ہمارا استقبال کیا۔ بہت دیر تک تالیوں کی گونج میں سیاسی لیڈروں کی مانند ہاتھ ہلا ہلا کر ہم نے تمام شعراء اور حاضرینِ محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی جگہ سنبھالی۔

سٹیج سیکرٹری نے اپنے کلام سے ابتدا کرتے ہوئے ہم وطنوں کے ایک رہنما کی خوب بھد اُڑائی اور اپنے حصے کی داد ہتھیانے کے بعد جن محترمہ کو دعوت کلام دی گئی وہ شاعرہ کم اور فلمی ہیروئن زیادہ لگتی تھیں۔ لباس بھی انہوں نے فلمی ہیروئنوں کے طرز کا زیب تن کیا ہوا تھا جس میں کپڑے سے زیادہ سینے والی کی مہارت کو دخل ہوا کرتا ہے۔ کلام پڑھنے اور سامعین کی داد سمیٹنے کے دوران گاہ بگاہ پہلو بدل کر نا سازیِ طبع کا ذکر کرکے محترمہ نے محفل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیا تھا۔ ہمارے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اُبھار رہے تھے۔ اپنی ذات کے علاوہ مشاعرے میں شریک دیگر شعراء کی بابت بھی تشویش لازمی تھی۔ خاتون مذکور جس قدر والہانہ انداز میں داد و تحسین بٹور رہی تھیں اُس کے بعد آنے والے شعراء کے لئے کچھ باقی نہ بچا تھا۔

خاتون کے بعد جن صاحب کو دعوت کلام دی گئی انہوں نے ہمارے تمام اندازے یکسر غلط ثابت کر دیئے۔ صاحب مذکور شاعر کم اور ایکٹر زیادہ تھے۔ انہوں نے تیکھے لہجے اور بھرپور ایکٹنگ سے حکمرانوں کے کچھ اس طرح پرخچے اُڑائے کہ خاتون کا سحر نہ صرف ٹوٹ گیا بلکہ سامعین کے اسٹیمنا کی بیٹری بھی چارج ہونے لگی۔

غرض ایک کے بعد دوسرے آنے والے شاعر اور شاعرات نے نئے موضوع اور نئے لہجے کے باعث ہماری توقع سے زیادہ داد سمیٹ کر ہمیں حیرت زدہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ ہم نے زبانی پڑھنے کے بجائے بیاض سامنے رکھ کر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اوائل عمر سے لے کر آج تک کہے گئے وہ اشعار جن پر ہمیں بے پناہ داد اور پسندیدگی سے نوازا جا چکا تھا نشان زد کرنا شروع کر دیئے۔ ہمارا خیال تھا کہ اپنی باری پر ہم مہمان ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چیدہ چیدہ اشعار سنا کر پہلے سامعین کو مسحور کریں گے جب لوہا گرم ہو جائے گا اُس وقت ہم وہ خاص کلام پیش کریں گے جو ہم نے خصوصی طور پر آج کے مشاعرے کی مناسبت سے کہا ہے۔

جیسے ہی سٹیج سیکرٹری نے اپنی گرجدار آواز میں ہمارا نام پکارا' پورا پنڈال سیٹیوں' تالیوں اور نعروں سے گونجنے لگا۔ پنڈال کے آخری سرے پر دو مشتاق تماشبین مستورات اپنی مخصوص اور من موہنی مسکان لئے دھیمے دھیمے تالیاں بجا کر ہمارا استقبال کر رہی تھیں۔ ایک طرف پر جوش سامعین دوسری جانب پرسکون مسند' ایک طرف بے چینی و بے قراری دوسری جانب بے انتہا صبر و اطمینان.....! دل و دماغ ایک دوسرے کو قائل و آمادہ کرتے ہوئے خود کرچی کرچی ہو گئے..... دھماکہ..... دھماکے کی ایک آواز نے..... صرف ایک آواز نے..... نہ صرف مشاعرہ بلکہ پورا میلہ ملیا میٹ کر دیا تھا.....!

رات کے پچھلے پہر اس قدر محرومی اور مایوسی کا سامنا ہونے پر اس بے نوا پر جو گزری سو گزری..... مگر..... ان لاکھوں..... کروڑوں..... لوگوں پر کیا گزرے گی.....جو.....اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے امن کا خواب سجائے بیٹھے ہیں..... کب تک..... آخر کب تک..... قتل کے داعیوں کے ہاتھ میں ہمارا اور ہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل کھلونا بنا رہے گا..... کب تک دھماکے اور پٹاخے ہمارے شعور پر غالب آتے رہیں گے..... کب تک بسے بسائے میلے اجڑتے رہیں گے..... کب تک..... آخر کب تک.....؟؟؟

معجزے کیا اب نہیں ہوتے؟

ستیہ پال آنند

نصف شب کو

چاند اپنی نرم ٹھنڈی چاندنی کو
میرے کمرے کی کھلی کھڑکی سے اندر بھیجتا ہے
اور وہ اصرار کرتی ہے کہ اس کے ساتھ چل کر
چاند کے سنگ آسماں کی سیر پر نکلوں.....
کہ سارے کارواں تاروں کے میرے منتظر ہیں.....

صبحدم پھر

میری کھڑکی کے برابر باغ کی ہر اک روش پر
ناز سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی بادِ صبا بھی
اک لحہ رک کے کھڑکی کھٹکھاتی ہے بہت آہستگی سے
اور کہتی ہے..... مجھے اندر بلا لو
اپنے گالوں سے لگا کر پیار کر لو
ان سبھی پھولوں کی خوشبو اوڑھ لو جو
میں چھپا لائی ہوں اپنی اوڑھنی میں....

دوپہر کو

آسماں پر دوڑتا، چمکیلا سورج..... نیچے جھک کر
میری کھڑکی کو ذرا سا کھینچا کر
انگلیوں سے دھوپ کی چھوتا ہوا، بس
ایک دو لمحے ہی اندر جھانکتا ہے
اور بستر پر مجھے سوئے ہوئے جب دیکھتا ہے
شرگیں سا، پیچھے ہٹ جاتا ہے، جیسے
کوئی نامحرم ہو، خلوت گاہ میں یوں دیکھنا جس کا غلط ہو...

شام کو پھر

سارے پنچھی، ایک سُر میں، ایک لے میں
چہچہاتے ہیں خوشی سے
دھند کے کمبل میں لپٹے گہرے سائے
میری کھڑکی پر ذرا رک کر بتا جاتے ہیں مجھ کو
شام ڈھلتی جا رہی ہے
میں دوا کی آخری خوراک پی لوں.....
کون کہتا ہے کہ کلجگ معجزوں کا جگ نہیں ہے
میں شفا خانے کے کمرے میں پڑا ہوں
اور یہ سب معجزے
دن رات ہوتے دیکھتا ہوں!

(”نروس بریک ڈاؤن“ کے بعد اسپتال میں دس دنوں کے دوران لکھی گئی)

O

ہائیکو (تراجم)
حمایت علی شاعر

کپڑوں کی خوشبو
موج ہوا لے کر نکلے
پھیلا دے ہر سو

موسم گل آیا
کاش میں تیرا ہر آنسو
خود ہی پی جاتا　　(باشو)

سورج ڈوبتا جائے
خاموشی کے عالم میں
پھیلے شام کے سائے

جو کرنا تھا پیار
خود اتنا شرمیلا تھا
کرتا کیا اقرار

گلشن کے اُس پار
چھپ کے بیٹھی ہے اک رات
تارے ہیں دو چار

موسم ہے یخ ریز
کیوں ہے پھسلن سے پہلے
دل کی دھڑکن تیز

(یاما گوچی سی شی)

کرشمۂ ذرات
ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

کُچھ بھی نہیں، کُچھ بھی تو نہیں
یہ رفاقتیں قُربتیں، محبتیں یہ چاہتیں.... منسوب چاہتوں سے سب
یہ ہمنشیں، یہ ہمنوا، یہ ہمسفر، یہ راہبر... ضرورتوں سے منسلک

وصال کی حکایتیں، یہ آہ وزاری فُرقتیں، گلہ شکوہ وشکایتیں، غصہ، بگاڑ، رنجشیں
تشنگیوں کے سلسلے، یہ جانکاہ مرحلے، آوارگی میں کو بہ کو، کرتے ہیں کس کی جستجو!

کاروان تعلقات، رشتوں کا تحریکیں، سمجھو جنہیں روح رواں، ہو گئے قصۂ رفتگاں
ہو جائیگا جب گُورون، آخر کو سوئے لا۔مکاں، سب منتشر ہو جائیگا، کچھ بھی نہیں یہاں جاودِاں!

کچھ بھی نہیں یاں جاوداں؟
کیوں پھر جنگ وجدل، یہ تفریق رنگ ونسل، بُغض یہ حسد فساد، یہ مذاہب کے تضاد
ذکرِ گذشتہ و مال، فکرِ فردا و مال، خیالِ عاقبت، وزُہد، فکرِ عاقبت و معاد!!

کیا ہے فنا و بقا، عجیب ذہن رسا، بست وبُو دکا فہم و فرد سے کام کیا
عُمر بھر کھویا رہا، قرن باچلتا رہا، ازل سے جادہ پیما تھا، منزل نہ راستہ ملا

ساکنِ شہرِ ابدیت، بے سود ہیں جستجو، ہجر تُو وصال بھی تو، اشکال در اشکال تُو
اشرف المخلوقات تُو، مجموعۂ ذرات تُو، نازاں ہے جس بدن پہ تُو، اس پیکرِ خاکی کا تُو
کرشمۂ ذرات ہے، بن بن کے مٹا ذات ہے!!!

عالم ہست وبُود سے، تُم عمر بھر لپٹے رہے، گُم گشتہ منزل رہے، مرکز سے اپنے ہٹ گئے
تُو توحید خاکی نہیں، تُو نور حق ہے بالیقیں، پہچان اپنے آپ کو، کچھ سوچو کہ تُم کون ہو؟

گوش بر آواز رکو، سانسوں کا سلسلہ پرکو، سب راز ہو گئے منکشف، روشن ہو گئے چودہ طبق
لب پہ ہو تیرے اللہ ہو، تعالیٰ اللہ اللہ ہو، کچھ بھی نہیں اس کے سوا، لا الہ الا اللہ!!!

کچھ بھی نہیں، کچھ بھی تو نہیں، یہ رفاقتیں، محبتیں، قُربتیں، یہ چاہتیں، یہ ہمنشیں، یہ ہمنوا، یہ ہمسفر،
یہ راہبر، منسوب چاہتوں سے سب ضرورتوں سے منسلک... تخلیا تخلیا تخلیا

رُباعیات

عبدالعزیز خالد

دے بادۂ سرنجبر گر بادہ فروش
ہم بھی کریں سوم رس سمجھ کر اسے نوش
ملتی ہو جسے صافیِ خمخانۂ نجد
کیوں دُردِ مغاں پی کے ہو بیگانۂ ہوش؟

جو چیز بھی ملتی ہے ہمیں وہ ہے ادھار
چاہو تو کرو اس کو امانت میں شمار
کرنا پڑے ہر کسی کو بیباق حساب
لوٹانی پڑیں امانتیں آخرکار!

یہ قوم نہیں قائلِ اصلاح و صلاح
ہونے دے نہ کوئی کارِ بہبود و فلاح
اربابِ کشاد و بست اس کے خود مست
ان سے عبث امّیدِ نجاح و انجاح!

جو لوگ ہوں صرف نقش گر خوابوں کے
مینڈک ہوں وہ اک طرح سے تالابوں کے
سنتا نہیں نایافت کا شکوہ کوئی
پڑھتے ہیں قصیدے سب ظفریابوں کے!

ہوں کارِ نکو بھی بعض مُنجر بہ ضرر
لازم ہے اسی لیے عواقب پہ نظر
بنتے نہیں جذبات کی رو میں زیرک
کرتے نہیں انحصار مفروضوں پر!

لذت چشِ سجدۂ سحرگاہ نہیں
ہنگامِ اجابت سے تو آگاہ نہیں
لگ جاتی ہے "لا اِلٰہ" پر کیوں تجھے چُپ؟
کیوں لاحقہ اس کا "اِلّا اللہ" نہیں؟

اخباروں میں کریں کُسی اپنے وہ بیاں
تسکیں کا ہمارے ہاں ہم بر ساماں!
طنّاز و طرحدار شگرف و شنگول
ہر ہفتہ آرائش سے مزیّن خوباں!

تم راہِ خدا میں خرچ کیوں کرتے نہیں؟
کیا اس کے مخاطب ہیں تمام اہلِ زمیں؟
ہو رزقِ کفاف بھی میسر نہ جنہیں
کیا "عفو" کی مد میں دے سکیں وہ مسکیں؟

رُباعیات

رفعت سروش

آفاتِ سماوی و زمین توبہ
مفقود سر کی خندہ جبیں توبہ
افراطِ زر و مالِ مناصب شہرت
کچھ بھی نہیں اپنا یقینی تجربہ

اس پیکرِ خاکی سے شعرتیں کیسی
بھونچال کی یہ تازہ نصیحت کیسی
افلاک تو افلاک زمیں بھی دشمن
پہلے ہی قیامت سے قیامت کیسی

کس طرح ہوئی ہے تری آخر ترتیب
دھرتی تری تعمیر میں مضمر تخریب
مانا کہ اگلتی ہے زروگوہر تو
اک پل میں الٹ دیتی ہے قصرِ تہذیب

مسمار ہوئے قلعہ و گنبدِ مینار
باقی نہ رہی ایک بھی گھر کی دیوار
اک پل میں ہوا شہرِ تمنا تاراج
بستی ہوئی اک پل میں ہلاکت کا دیار

مت پوچھ کہ ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا
مجبوریٔ انساں کا تماشا دیکھا
اک پل میں اٹھتی ہوئی دیکھی یہ زمیں
اللہ کی ہیبت کا کرشمہ دیکھا

یہ تاش کے پتے ہیں کہ بکھرے ہیں مکان
باقی کوئی کوٹھا ہے نہ کوئی دالان
ملبے میں سسکتے ہوئے بچے معصوم
انسان ابھی زندہ ہے اللہ کی شان

یہ دیکھ کے فطرت کی ہیں آنکھیں نمناک
بربادیٔ انساں کے ہیں ساماں تہ خاک
موت اگلتی ہے جس وقت زمیں کی تہہ سے
جو راہ میں آئے اسے کرتی ہے ہلاک

تاریخ کی تصویر بدل جاتی ہے
پتھر کی بھی تحریر بدل جاتی ہے
کچھ واقعے ایسے بھی تو ہوتے ہیں سروشؔ
اقوام کی تقدیر بدل جاتی ہے

DISASTER

نقاش کاظمی

دیار وادی نیلم سے تا بہ گندھارا
کہ پٹھوہار کی جنت سے بالاکوٹ تلک
خمارِ صحبتِ شب کو اتارنے کے لیے
زمین صبحِ وطن نے جو ایک کروٹ لی
تو اس کے جسم سے لپٹے ہوئے "Dragon" نے
نہ شیر خوار نہ بچے نہ مرد و زن دیکھے
بس ایک پل میں بڑپا بنا گیا سب کو
کھلی جو آنکھ تو اسکول تھے نہ بچے تھے
نہ اسپتال نہ ان میں مریض اور نہ طبیب
نہ پیڑکوں میں ہمارے بہادروں کے نشاں
نہ کہکشاں نہ ستارے نہ مرغزار نہ پھول
نہ پھول سے کوئی چہرے نہ تتلیوں کا جمال
نہ رہ گیا کوئی ہمدم نہ اب رہے دروبام

اسی کھنڈر میں پڑا اپنے دل کے ملبے سے
سوال میں نے کیا یہ ''موہن جو ڈارو'' ہے
کہ میرے ذہن پہ چھایا ہوا ہے ''ٹیکسلا''؟
ابھی میں بے کفنی کے ادھیڑ بُن میں ہی تھا
جواب آیا ''المناک'' Disaster ہے میاں!
سو اٹھ گیا ہوں کہ اب آؤ بیٹھے . . . لاؤ
کہ اس خرابے سے اک نئی جاگتی تہذیب
کمالِ جراتِ زندہ دلی سے . . . . . دکھلاؤ
ساتھ .... آؤ

(۱۸ اکتوبر کے زلزلے پر ایک نظم)

لاپتہ

علیم صبانویدی (بھارت)

بیوہ خوشی کا ہاتھ مرے ہاتھ سونپ کر
وہ جا چکا ہے آج مری ذات سے پرے
سپنوں کی کائنات کا چہرہ اجاڑ کر
اور سارے اعتماد کا حلیہ بگاڑ کر
اپنی ہتھیلیوں میں لئے اپنی جان کو
کرتا رہا وہ اپنی خوشی ہی کی جستجو
دو روزہ زندگی میں ملاقات سے پرے
وہ ہو چکا تھا کتنے ہی جسموں کا ہم سفر

چہرے پہ جس کے پاک محبت کے رنگ تھے
کل جس کی چاہتوں پہ زمانے بھی دنگ تھے
جو خود کو انبساط کا شہزادہ کہہ گیا
ان مٹ خلوص و مہر کا دلدادہ کہہ گیا

اب دور دور اس کا کوئی نقش بھی نہیں
یوں لاپتہ ہوا ہے کہ حیراں ہے خود زمیں

O

خوف نادیدہ.....قیصر نجفی

ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
نیند رات بھر مری
اور انگ انگ میں
ایک خوف نادیدہ
کروٹیں بدلتا ہے
کنجِ جاں میں درد کا
سانپ بن کے چلتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
نیند رات بھر مری

بے نشان بے چہرہ
لوگ دیس کے مرے
آس پاس پھرتے ہیں
نخلِ زیست کے یہ پھل
بے پکے ہی گرتے ہیں
ہر طرف یہ راہوں میں
گلتے سڑتے ملتے ہیں
جا بجا یہ پاؤں میں
گرتے پڑتے ملتے ہیں
کتنے بے بضاعت ہیں!
کیسے یہ سلامت ہیں؟

جب بھی سوچتا ہوں میں
ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
نیند رات بھر مری

رات بھر یہ سرگوشی
سُنتا ہوں ہواؤں کی
ہوں گرفت میں ابھی
خود نگر خداؤں کی
جن کو آج بھی مرا
خوں شراب ناب ہے
جن کی آنکھوں میں سدا
رنگ ہے شباب ہے
میری آنکھوں میں مگر
نیند ہے نہ خواب ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
نیند رات بھر مری

O

نوح کا طوفان پھر آنے کو ہے
دِل نواز دِل

بستیاں ہیں دُور جلتی
قربتیں ہیں پاس آتی
شُعلے ہیں جگمگاتے
اور دیے ہیں ٹمٹماتے
کانچ میں روشن ہیں تارے
اور مٹی، تیل باتی کی اگن سے
لَو لگا کر جل رہی ہے
بستیوں میں قہقہے ہیں
تربتوں پر سسکیاں ہیں
گولیوں کی تڑتڑاہٹ
اور بموں کے دھماکے
اور گولوں پر پٹاخے
زلزلوں پر زلزلے ہیں
گر رہی ہیں بلڈنگیں اور
مر رہے ہیں
بچے بوڑھے
اور جواں اک ساتھ سارے
دَب کے چیخیں رہ گئیں ہیں
گڑھے کے سختیں رہ گئی ہیں
دفن ہو کر رہ گئے ہیں
لوگ سارے
جو تھا کہنا کہہ گئے ہیں
ظلم جاں پر سہہ گئے ہیں
اَب مٹا تا جا رہا ہے

اِک تمدن دوسرے کو
مغربی تہذیب اب تو
مشرق کو
تہس کرتی جا رہی ہے
بستیاں مٹ جائیں گی سب
تربتیں رہ جائیں گی کب
خاک اُڑے گی پھر زمیں کی
آسماں پر
اور آدم سر پہ ڈالے
خاک دُنیا میں پھرے گا
نوح کا طوفان پھر سے
آدمِ خاکی کو آخر
آ ہی لے گا
بستیاں پھر کیا بسیں گی!
تربتیں پھر کیا رہیں گی!
قہقہے بے آب ہوں گے
سسکیاں پانی میں ہر سُو
ڈوبتی تیرتی رہیں گی
آخرش پانی ہی پانی
ساتھ مٹی کے رہے گا
مل کے مٹی میں بہے گا

O

جدید دوہے
بھگوان داس اعجاز

برہما نے سرشٹی رچی، اور کام نے چام
اس لذت کو تم نہ دو، ایسا ویسا نام

مرد کو عورت چاہیے، عورت مانگے لال
کرم کرو گیتا کہے، حل ہو جائے سوال

مجھ سے کہا فقیر نے، عورت کیا ہے بھانپ
ناف تلے سویا رہے کنڈلی مارے سانپ

اس نے برسوں کا لکھا، میں نے دیا جواب
ہو حلال دن عید کے، ہوتا بہت ثواب

اُسے نہ تم لڑکی کہو، عورت کہو جناب
لگے دیکھنے جب کوئی، ماں بننے کے خواب

چھینٹا کھٹے دہی کا، کم نہ سمجھئے صاب
بھرا پتیلا دُودھ کا پل میں کرے خراب

سجنی! دل سے دوں دُعا اب نہ کھینچ تو ہاتھ
پانی منگنی کا پلا، تو بن جائے بات

جس بچے کے دھیان میں عورت روپ سمائے
وہاں جوانی سوچئے، کس رستے سے جائے

پونا غوطہ خور کا، لاکھ جمائے دھاک
جو پانی دیکھے ڈرے وہ کیا ہو تیراک

جو بوسہ لے مفت میں مانگے مال اُدھار
کہے سکھی رکھ پرے، دور سے گولی مار!

دوہے
سجاد مرزا

پیار کا دیپ جلا کر ہم نے سارا جگ رشنایا
مرزا ہم کو جگ میں پھر بھی جینا راس نہ آیا

دھیان نگر کے جس رستے پر من کا گھوڑا بھاگے
اس رستے پر گئے دنوں کے کتنے سپنے جاگے

روپ کی مایا ہاتھ نہ آئی کیا کیا منتر سیکھے
اس نے بھری سدھ بسرائی جس کے نیناں تیکھے

اپنے گھر پر دیکھ رہا ہوں غیروں کی یلغار
میری رکھشا آپ کرے گا میرا سرجنہار!

میرا بازو توڑ کے، مجھ کو جو کہتا ہے کھیل
اس بے درد سے ہو سکتا ہے میرا کیونکر میل

لوگن کا جو مال کھسوٹے وہ کیسا بلوان؟
دکھ سکھ میں جو ساتھ نبھائے وہ انسان مہان

چاروں اور میں دیکھ رہا ہوں جنگل کا قانون
کس کی گردن پر ٹھہرے گا اس پرجا کا خون؟

کب جائے گا مالک! میرے من پاپی کا روگ
کون جنم کی کرنی کا میں کشٹ رہا ہوں بھوگ

پرجا بھوکی ننگی، راجہ عدلی موج اڑائے
جانے کس یگ نشٹ کرے گا پربھو یہ انیائے

اعتراف

خیال آفاقی

جی ہاں یہ الفاظ مرے ہیں
برسوں، صدیوں بلکہ قرنوں
میں نے ہی سوچا تھا ان کو،
شعر کی صورت نثر کی صورت
اپنے من میں جنم دیا تھا،
اِک اِک حرف کو اپنے لہو سے
رقم کیا تھا،
پھر کیوں جانے بھول گیا تھا،
اب جو تم نے پوچھا ہے تو،
یاد آیا ہے،
کیوں انکار کروں میں ان سے
جو کچھ بھی ہیں، جیسے بھی ہیں
یہ سارے الفاظ مرے ہیں۔
ان کو دیکھ کے یوں لگتا ہے
روزِ ازل ہی
میری روح کے اندر ان کو
چھپا دیا تھا
جیسے یہ الفاظ نہیں ہیں
کوئی قیمتی سرمایہ ہیں
ارض و سما کا ہم پایہ ہیں
لیکن، میں یہ سوچ رہا ہوں
اِن لفظوں کا مطلب کیا ہے
ان باتوں سے حاصل کیا ہے
کیونکہ اب تک
کوئی بھی ان کو جان نہ پایا
یہ ''سرمایہ'' میرے کچھ بھی کام نہ آیا
پھر کیوں میری روح کے اندر
موتی بن کر بسے ہوئے ہیں
من سیپی میں چھپے ہوئے ہیں
کبھی کبھی نوحہ سا بن کر
نوکِ قلم تک آجاتے ہیں
میرے لبوں کو گرماتے ہیں
چاند ستارے پھول اور پتھر سب گاتے ہیں
اور فرشتے ان گیتوں کو دہراتے ہیں
یہ سارے نغمات
یہ سب جذبات مرے ہیں
کیوں انکار کروں میں ان سے
جی ہاں یہ الفاظ مرے ہیں

O

عہد تھا ایک سو تمام ہُوا

(ملک کے ممتاز و معروف تخلیق کار و دانشور جناب احمد ندیم قاسمی کے سانحۂ ارتحال پہ)

شگفتہ نازلی

علمی اور ادبی تشنگی پیشِ نظر رہی
دریا تھے اور اُن کو دریا ہی مین چلنا تھا
برسوں تلک سیرابیٔ قلب و ذہن کے بعد
پھر ایک روز اُن کو سمندر میں ملنا تھا!

تھی شاعری رجائیت کے رنگ میں رَچی
انساں کے لئے سوچ جو اوجِ کمال ہو'
اہلِ وطن پہ چاہتے' موسم ہرا بھرا
ایسی بہار جو نہ کبھی پُرملال ہو!

طرزِ بیاں سے موضوع جُداگانہ ہو گیا
اخباری کالموں کو نئی جہت مِل گئی
اپنی روش سے عام کو بھی خاص کر دیا
پڑھتے جسے ہی گویا ذہنی کلی کِھل گئی!

تھیں خراجِ تحسیں کی یہ بھی کچھ نشانیاں
کارنامہ پی۔ٹی۔وی' مُوقلم روانیاں'
ناظریں ناواقف ہوں دیکھ کے سکرین پہ
اپنے عہد سے جُوئی' قاسمی کہانیاں!

O

محبت

کرامت بخاری

محبت کرتے رہنے سے محبت کم نہیں ہوتی
کہ اِس جلتے دیے کی لَو کبھی مدھم نہیں ہوتی
خُدا کا یہ خزانہ ختم ہونے میں نہیں آتا
کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو اگر اِس سمت آ نکلے
تو اِس میں وہ کہیں سے بھی کمی کوئی نہیں پاتا
محبت مہر و اُلفت' دلنوازی اور دلداری
یہ موسم ہیں!
یہی موسم مرے جذبِ دروں کے اندروں موسم کا حصہ ہیں
مرے دل کی کہانی ہیں مری آنکھوں کا قصہ ہیں
مجھے تو جب کوئی نفرت کہیں پہ گھیر لیتی ہے
کوئی بے رحم ساعت میری جانب بڑھنے لگتی ہے'
تو میں اہلِ محبت سے سہارا مانگ لیتا ہوں'
محبت سے محبت کو دوبارہ مانگ لیتا ہوں

O

سوال

صابرؔ عظیم آبادی

خلا کے نیچے
جوابرِ آوارہ سے رواں ہیں
نہ جانے کس جا برس پڑیں گے
مگر زمیں کے وہ خشک چہرے
جو اپنی تشنہ لبی کے شعلے
بجھانے کو پھر بہت زمانے سے مضطرب ہیں
اگر نہ برسیں تو
پیاس پھر کیسے بُجھ سکے گی
تمام کھیتوں کی فصل جل کر
تباہ ہو گی
یہ سارے خوشے یہ سارے پودے
بنیں گے کھیتوں میں راکھ اک دن
اسی طرح میں
تمہاری فرقت کی آگ میں جل گیا
راکھ بن گیا تو
مآلِ اس سانحہ کا عجیب ہو گا
مہیب ہو گا
جواب دو یہ کہ دنیا والے
تمہیں پکاریں گے
نام جو دیں گے اس سبب سے
تمہارے دامن کا داغ ہو گا

O

دوہے

کاوشؔ پرتاپگڈھی

دھرتی پر احسان کیا، تیرا ساون ماس
دو بوندوں نے میہہ کی اور بڑھا دی پیاس

ہم کو اس سے کیا گلہ، یا کیسی پرخاش
اپنی مورت کو اگر، پوجے سنگتراش

کہاں کہاں کھوے نہیں، بدل بدل کر بھیس
ہم نے اپنے آپ کو، ڈھونڈا دیس بدیس

بھول ہوئی ہم سے کہیں، غلط ہوئی کچھ بات
سنے ہوئے ہیں خون سے، حقداروں کے ہاتھ

لوٹے گی لے کر اسے، جب میری بارات
میرے گھر سے روشنی، چھوٹے گی دن رات

ضدی دل کو کیا کہیں، بالک سا اطوار
کھیل کھلونہ دیکھ کر، مچلے بارمبار

کاوشؔ صاحب شہر میں، پھیلا کیسا روگ
ننگے ہو کر رات دن، ناچ رہے ہیں لوگ

O

میں نہیں کہتا

علی آذر

میں نہیں کہتا
نگاہوں میں ہو اُس کی جادو
زُلفیں وہ جب بھی بکھیرے تو ہر اِک سُو خوشبو
باتیں جیسے کہ مچلتی ہو کہیں آبِ جُو
اور تنہائی میں سہا ہوا جیسے آہو

میں تو کہتا ہوں کہ
اُجڑا ہوا مجھ سا کوئی
جس کے چہرے پہ شب و روز کی تلخی ہو لکھی
جس کی آنکھوں میں ہر اِک وقت ہی رہتی ہو نمی
اپنی ویران نگاہوں میں بسا لے مجھ کو
اپنی زُلفوں ہی کو چہرے پہ بکھرے میرے
میرے کاندھے پہ وہ سر اپنا رکھے اور روئے
میں جو مدت سے نہیں رویا ،رُلا دے مجھ کو
بس یہی ایک تمنا
بس یہی آرزو ہے
اُسکی آنکھوں میں ہو تصویر فقط میری ہی!
اُسکی سانسوں کی ہر اِک نوک پہ ہو نام مرا
وہ مجھے چاہے فقط مجھکو ہی چاہے آذر
میں نہیں کہتا نگاہوں میں ہو اُسکی جادو!

O

قطعات

حصیر نُوری

اسیرِ فکر ہوں زندانیٔ شعور ہوں میں
جو راہ تم نے بتائی تھی اس سے دور ہوں میں
حصیرؔ مجھکو خطاوار سب سمجھتے ہیں
مگر یہ کیسے بتاؤں کہ بے قصور ہوں میں

کہوں یہ کیسے کہ انجام پہ نظر نہ رہی
کچھ احتیاط مگر شاملِ سفر نہ رہی
شدید اتنا تھا شب خون تیرگی اے دوست
کسی کی کیا مجھے خود اپنی بھی خبر نہ رہی

عرق آلود کر دیتا ہے ماتھا میری غربت کا
تلاطم آشنا جذبات کو للکار دیتا ہے
کوئی جب پوچھتا ہے مجھ سے میرا مشغلہ تو پھر
یہ لگتا ہے کوئی منہ پر طمانچہ مار دیتا ہے

نقرئی کرنوں کے گہوارے میں سوئی ہوئی رات
جانے کیا ہے کہ ہر آواز پہ چونک اٹھتی ہے
اجنبی بن کے بلاتا ہے دھڑکتا ہوا دل
زندگی اپنے ہی انداز پہ چونک اٹھتی ہے

O

میرا تیرا کتبہ

فیصل عظیم

میں بھی مردہ، تو بھی مردہ
مردے زندہ باد
میں اک قبر میں لیٹا
اپنی قبر میں تو آباد
میں بھی ہر اک شرم سے عاری
تو بھی ننگ دھڑنگ
میرا جسم بھی سڑنے لگا ہے
تو بھی بدرنگ
کیڑوں کی خوراک ہوں میں بھی
تو بھی نوچا ہوا
میں نے اپنی شکل گنوائی
تو بے چہرہ ہوا
میں نے اپنا کفن چرایا
اور تو نے اپنا
میں نے اپنا بیچ کے کھایا
اور تو نے اپنا
میں نے اپنی قبر میں کتنے مردے دفنائے
تو نے اپنی قبر میں جانے کتنے گڑوائے
رات گئے میری بدروح بھی شور مچاتی ہے
قبرستان میں تیری روح بھی دل ہولاتی ہے
میں بھی موت کا سناٹا ہوں
تو بھی سناٹا
میں بھی اک سفاک حقیقت
تو بھی ایک بلا
میں بھی قبروں کا سوداگر
اور تو مجھ جیسا
جانے کب تک اور چلے گا
یہ گورکھ دھندا.....!

داغِ دل

ڈاکٹر مدن لعل گلاٹھی (دہلی بھارت)

کس طرح تم جی رہے ہو اُلجھنوں کے درمیاں
سانس تک لینا نہیں تیرے لئے ممکن جہاں

ساتھ دینے کو نہ ہو ایک بھی جب ہم خیال
خُون کے گھونٹ پی جانے میں تم ہو باکمال

غم و غصہ پی رہے ہو مانند جام شراب
کوئی اپنا مل گیا تو کھول دی دل کی کتاب

ظاہراً خوش گپیوں میں کاٹتے ہو زندگی
دردِ دل کی غیر کو لیکن خبر ہونے نہ دی

کس کو فرصت کوئی جھانکے تیرے دل میں اے مدنؔ
ڈھالتے ہو داغِ دل تم آنسوؤں میں رات دن

O

غالب کی نعتیہ غزل

ڈاکٹر سید تقی عابدی

غالب کے فارسی دیوان میں شامل یہ (۹) شعر کی نعتیہ غزل پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود ابھی گفتگو کی گنجائش باقی ہے۔ سچ ہے کہ دریا کے قعر میں پانی کو پورے طور پر سمجھا تو نہیں جا سکتا لیکن ہر صاحبِ فکر اپنی ہمت اور قدرت کی تشنگی کے مطابق اس کو اپنے ظرف میں اتنا تو کھینچ سکتا ہے کہ اُس کی پیاس بجھ سکے۔

غالب کا نعتیہ کلام اُردو دیوان میں فارسی کلام کی نسبت اتنا کم تنگ ہے کہ اس پر بے رنگ ہونے کا گمان ہوتا ہے جب کہ فارسی دیوان میں نعتیہ مضامین کے مختلف موضوعات پر رنگ برنگ نقش نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لئے غالب نے کہا تھا

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

اُردو میں لے دے کے غالب کے پاس ایک آدھ نعتیہ شعر ملتا ہے پھر بھی اس ایک نعتیہ شعر میں جو مقطع کا شعر ہے نعتیہ موضوعات رحمت، شفاعت، معراج، بخشش کے یقین کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تعلّی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے

اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

غالب کے فارسی کلام میں نعتیہ اشعار کی تعداد تقریباً ساڑھے چھ سو اشعار ہے جو سات نعتوں، معراج ناموں اور ایک نعتیہ غزل پر مشتمل ہے۔ ہم اس تحریر میں صرف نعتیہ غزل کو ہی اپنا محورِ سخن بنائیں گے اگرچہ ہم نے غالب کے نعتیہ کلام پر تفصیلی ریویو اپنی زیرِ طبع کتاب "غالب عاشقِ محمد و آلِ محمد" میں کیا ہے۔ اس مضمون میں پہلے ہر شعر کا لفظی مفہوم اور معنوی ترجمہ ہوگا پھر ہر شعر کے ادبی محاسن کے علاوہ تخیل کی گہرائی اور گیرائی کے نادر نکات بیان کئے جائیں گے جو غالب کا خاص فن ہے۔ شعر شاعر کی علمیت، قوتِ تخیل اور قدرتِ فن کا مظہر ہوتا ہے۔ غالب کی نعتوں سے ان کی قرآن اور احادیث سے آگاہی، اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفہ سے آشنائی اور فارسی شاعری پر مہارت ظاہر ہوتی ہے۔ غالب نے بھی دوسرے عمدہ نعت گو شعرا کی طرح نعت گوئی میں "با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار" کی روش اختیار کی یعنی نہیں بلکہ تخیل کی گہرائی میں دقیق بینی اور حرمت شعاری کے ساتھ عبد و معبود کے فرق کو ہم نہیں کیا کیوں کہ عرفی شیرازی کا شعر نہ صرف ان کی نظروں کے سامنے تھا بلکہ ان کی فکری تیغ کا نقیب بھی رہا۔

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

غالب کی یہ نو (۹) شعر کی غزل مردف ہے اور اس کی ردیف "محمدؐ است" ہے۔ اگرچہ اس نورانی ردیف سے مصرع میں غضب کا اجالا پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس جالے میں عمدہ مضامین کو ٹانکنے اس لئے ہر شاعر کے بس کی بات نہیں کہ اس روشنی سے عقل اور فکر کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس غزل کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ اس میں دس (۱۰) قافیے ہیں اور کسی قافیے کی تکرار نہیں اگرچہ قافیہ پیمائی ذوق کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور غالب نے بھی اس راستے کو نہیں اپنایا اور قافیے سے شعر نہیں بنایا بلکہ ان کے شعر میں قافیے نے خود اپنی جگہ بنائی جو ان کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔ اس غزل میں آٹھ بار اللہ تعالیٰ کے ناموں میں پانچ بار حق اور ایک ایک بار کردگار، یزداں اور ذاتِ پاک استعمال ہوا جو مصرعوں اور مضمون کی رعایت سے رکھا گیا۔

شعر (۱):

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است

(ترجمہ) حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفیٰؐ کے اندازِ بیان سے۔ ہاں حق کا کلام محمدؐ کی زبان سے جاری ہوا۔ (تشریح و محاسن) خدا کی معرفت اور دینِ اسلام حضرت محمدؐ کی گفتگو ہی سے ظاہر ہوئے اور بے شک قرآن کریم اور احادیثِ قدسی کو ہم نے محمدؐ کی زبان ہی سے سنا۔ مصرعِ اول میں ترکیب "طرزِ بیان" غالب کا منفرد "طرزِ بیان" ہے اور یہی پورے شعر کی جان بھی ہے۔ مسلمانوں سے ہٹ کر قریش کے کفار اور مکہ و مدینہ کے مشرکین بھی اس بات کے قائل تھے کہ پیغمبرِ اکرمؐ امین اور صادق تھے۔ ان کی زبان سے کبھی غلط یا جھوٹا بیان ادا نہیں ہوا یہی محمدؐ کا طرزِ بیان تھا اور یہی محمدؐ کے لہجہ کا اثر بھی تھا کہ جو شخص بھی انہیں سنتا تھا دل سے ان کی صداقت کا قائل ہو جاتا اسی لئے قرآن کریم اور احادیثِ قدسی کو جب لوگوں نے آپ کی زبانِ مبارک سے سنا تو بلا کسی تامل و شک کے قبول کیا اور ان کو من و عن محفوظ کیا۔ مختصر الفاظ میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو، دینِ خدا کو اور کلامِ خدا کو محمدؐ کے ذریعے پہچانا۔ غالب نے اس شعر میں سورہ النجم کی آیت تین اور چار سے استفادہ کیا کہ وہ نہ اپنی خواہش سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ تو حکمِ خدا کہتے ہیں جو بھیجا جاتا ہے۔ اس شعر میں صنعتِ مراعات النظیر کی دو مثالیں ہیں یعنی بیان، زبان اور کلام کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔ حق، کلامِ حق اور محمدؐ کو بھی ایک ہی جگہ نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر میں صنعتِ تلمیح ہے جس میں حق سے مراد اولٰی حق تعالیٰ اور کلامِ حق سے مراد قرآن مجید ہے۔ پورا شعر صنعتِ تطبیق میں ہے صنعتِ سجع متوازی میں دونوں قافیے "بیان اور زبان" ہیں جو ہم وزن ہم عدد اور حروفِ روی میں برابر ہیں۔

شعر (۲):

آئینہ دار پرتوِ مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

(ترجمہ): جس طرح چاند سورج کی روشنی کا مظہر (آئینہ دار) ہے اسی طرح خدا کی شان بھی محمدؐ کی شان سے ظاہر ہوتی ہے۔ (تشریح و خلاصہ) جیسا ہم سب جانتے ہیں چاند کا اُجالا سورج کی روشنی کی بدولت ہے یعنی رات کے وقت ہم جو روشن چاند کو دیکھتے ہیں اُس کی روشنی اُسی چھپے ہوئے سورج کی بدولت ہے جسے ہم نہیں دیکھ پاتے۔ چاند سورج کی روشنی کا آئینہ ہے اسی طرح سے حضرت محمد مصطفیٰؐ خدا کی شان و شوکت کے مظہر ہیں۔ ہم نے محمد مصطفیٰؐ کی شان اور عظمت میں اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کی جھلک دیکھی ہے یعنی بالفاظ دیگر یہ محمد مصطفیٰؐ کی شان اور منزلت ہے جس کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کو محسوس کر سکے۔ اس شعر کی اولین خوبی یہ ہے کہ اس میں خوب صورت تشبیہ کی بنیاد پر پورا شعر تعمیر کیا گیا ہے۔ ذات قدس کو سورج جس کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے اور ذات نبیؐ کی مرتبت کو چاند جس کی روشنی اکتسابی ہے پیش کیا گیا ہے۔ اس شعر میں غالب نے کم از کم تین قرآنی آیات جو آنحضرت کی شان میں نازل ہوئی ہیں اس کی روشنی کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں روشنی نور و رسالت آپ سے منسوب ہیں۔ سورہ احزاب آیت 45 اور 46 جس کا ترجمہ ہے اے نبیؐ ہم نے آپ کو گواہ اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا آپ خدا کے حکم سے خدا کی طرف بلانے والے اور چمکتے چراغ ہو۔ سورہ المائدہ کی پندرہویں آیت (۱۵) میں ارشاد ہوتا ہے۔ بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آئی۔ سورہ النساء کی آیت (174) میں ارشاد ہوتا ہے اے لوگو بے شک اللہ کی جانب سے تمہاری طرف روشن دلیل اور روشن نور آیا۔ صنعت مراعات النظیر میں مہر (سورج) ماہتاب (چودھویں کا چاند) پرتو (عکس) آئینہ شامل ہیں۔ صنعت لف و نشر مرتب بھی اس شعر میں موجود ہیں۔ مہر اور ماہتاب مصرعہ اول اور اسی ترتیب سے ہیں جس طرح سے حق تعالیٰ اور محمدؐ مصرعہ ثانی ہیں۔ صنعت تکرار میں شان کی تکرار نے شعر کی خوبصورتی و دلکشی کے علاوہ اس کے معیار کو بلند کر دیا ہے۔ یہ شعر بھی صنعت تعلیل میں ہے جس میں پہلے مصرعہ کی تعلیم و دلیل نے دوسرے مصرعہ کو معتبر بنایا یعنی حضرت محمد مصطفیٰؐ کی شان بھی بلند اور ارفع اس لئے رہی کہ اللہ جل شانہ ہے۔ یہ شعر بھی نعتیہ مضمون کا اعلیٰ شعر ہے جو بہت سادہ ہوتے ہوئے بھی گہرے مطالب کا ترجمان ہے۔

شعر (۳):

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق ست
لیکن کشاد آں ز کمان محمدؐ ست

(ترجمہ): تقدیر کا تیر بے شک حق تعالیٰ کے ترکش میں ہے لیکن وہ محمدؐ کی کمان ہی سے چھوٹتا ہے۔ (تشریح و خلاصہ) بے شک کاتب تقدیر حق تعالیٰ ہی ہے لیکن تقدیر پر عمل حضرت محمد مصطفیٰؐ کے وسیلے سے ہوتا ہے یعنی بگڑی ہوئی تقدیریں حضورؐ کے دستِ مبارک ہی سے بن جاتی ہیں یعنی حضورؐ کی رضامندی حق تعالیٰ کی رضامندی ہے۔ اس شعر میں بھی غالب نے دو قرآنی آیات کے مطالب نظم کئے ہیں۔ "جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے (سورہ الفتح آیت ۱۰) جو خاک آپ نے پھینکی وہ آپ نے نہ پھینکی وہ اللہ نے پھینکی (سورہ الانفال آیت ۱۷) یہ شعر مطلب اور بیان کے لحاظ سے عمدہ ترین شعر ہے اور یہ سہل ممتنع میں شمار ہو سکتا ہے۔ تیر قضا ترکش حق اور کمان محمدؐ عمدہ اور نادر تشبیہیں ہیں۔ یہ شعر بلاغت کے لحاظ سے کم ترین الفاظ میں کثیر معنی کا قریب ہے چنانچہ اس طرز بیان سے غالب کے مصرعہ کی تصدیق بھی ہوتی ہے:

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اس شعر میں صنعت مراعات النظیر کے تحت تیر ترکش اور کمان آ سکتے ہیں۔

شعر (۴):

دانی اگر بہ معنی لولاک وا رسی
خود ہر چہ حق ست ازان محمدؐ ست

(ترجمہ): اگر تو لولاک کے معنی سمجھ لے تو تجھے معلوم ہوگا جو کچھ خدا کا ہے وہ سب محمدؐ ہی کا ہے۔ (تشریح و خلاصہ) اگر تو حدیث قدسی "لولاک لما خلقت الافلاک" کے معنی جان لے (اے محمدؐ اگر تم نہ ہوتے تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا) یعنی یہ کائنات کے باعث تخلیق محمدؐ ہیں۔ پھر تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کی اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب محمدؐ ہی کے طفیل سے ہے۔ مصرعہ اول میں صنعت تلمیح اور تضمین ہے۔ لولاک سے مراد حدیث قدسی لولاک ہے اس میں صنعت تعلیل ہے یعنی حضورؐ کے صدقے میں کائنات بنی ہے تو جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب محمدؐ کی وجہ سے ہے۔ یہ شعر بھی نعت کے کلیدی موضوعاتی مضامین میں شامل ہے۔

شعر (۵):

ہر کس قسم بہ آنچہ عزیز ست می خورد
سوگند کردگار بجان محمدؐ ست

(ترجمہ): ہر کوئی اُس کی قسم کھاتا ہے جو اُسے پیارا ہوتا ہے اسی لئے خدا تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی جان کی قسم کھائی ہے۔

(تشریح و خلاصہ) غالب نے ایک عقلی اور منطقی معروضہ اور تجزیہ پیش کیا ہے کہ ہر شخص اپنی بات مستحکم ثابت کرنے کے لئے اپنی پسندیدہ چیز کی قسم کھاتا ہے اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے زیادہ محبوب بندے حضرت محمدؐ کی جان کی قسم کھائی ہے۔ غالب کے اس شعر کا مرکزی خیال محبت اور عشق ہے جو نعت کے موضوعات کا بھی مرکزی نکتہ ہے۔ یہاں غالب سورہ الحجر کی آیت (۷۲) کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ (ترجمہ) آپ کی جان کی قسم بے شک یہ لوگ اپنے نشے میں بہک رہے ہیں۔ اس شعر میں محاورہ "قسم می خوردن" کے استعمال نے شعریت میں اضافہ کیا ہے۔ یہ شعر صنعت تضمین میں بھی ہے۔

شعر (۶):

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار
کاین جا سخن ز سرو روان محمدؐ ست

(ترجمہ): اے واعظ طوبیٰ کے سایہ کی بات چھوڑ دے کیوں کہ اب یہاں حضرت محمدؐ

کے سروروں کا ذکر ہوا ہے۔
(تشریح و محاسن) طوبیٰ جنت کا وہ بلند درخت ہے جس کے سایہ میں جنتی رہیں گے۔ غالب نے اس مضمون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ اے واعظ یہ طوبیٰ کی لمبی تان ہی کو چھوڑ دے اب ہمیں طوبیٰ کے سایہ کی ضرورت اس لئے نہیں کہ اب ہمارے درمیان سروِ محمد مصطفیٰ کی بلند قامت موجود ہے جس کا سایہ قامت طوبیٰ سے زیادہ آرام بخش ہے اب ہم رحمت اللعالمین کے سایہ میں رہیں گے۔ یہاں یہ بھی ابہام ہے کہ حضور کی ذات اقدس اور بلند مرتبت شخصیت کا سایہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ ہے۔ غالب نے اس شعر میں صنعت تلمیح یعنی سایۂ طوبیٰ سے شعر میں رنگ بھرا ہے اس میں صنعت تقابل اور صنعت استعارہ بھی موجود ہیں۔ طوبیٰ چونکہ بلند ترین جنتی درخت ہے اس کی نسبت سرو قد حضور سے دی گئی ہے جس میں صنعت رجوع کا پہلو ہے۔ صنعت مراعات النظیر میں طوبیٰ، سایہ، سرو کے ساتھ واعظ، حدیث اور تن نظر آتے ہیں۔ ان صنعتوں کے علاوہ اس میں صنعت مبالغہ کا عنصر بھی موجود ہے۔ اگرچہ غالب صنعت گر نہیں لیکن لاشعوری طور پر یہ صنعتیں ان کے کلام میں اس قدر زیادہ تعداد میں نظر آتی ہیں جس کی وجہ غالب کی زبان پر مہارت اور صنائع اور بدائع سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔
شعر (۷):

بنگر دو نیم گشتن ماہ تمام را
کان نیم جنبشی ز بنان محمد است

(ترجمہ) تو ذرا بدر کامل کو دو ٹکڑے ہوا دیکھ جو حضور کی انگلیوں کے ایک معمولی اشارے کا نتیجہ ہے۔
(تشریح و محاسن) غالب نے معجزۂ شق القمر کو بیان کرنے میں صناعی سے کام لیا ہے یعنی یہاں قدرت مصطفیٰ کا دکھانا مقصود ہے جن کی انگلی کی معمولی حرکت سے چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ غالب ایک عظیم شاعر ہے اور ان کا فن ہر لفظ کی مصرع میں نشست سے ظاہر ہے۔ مشہور ہے کہ بڑا شاعر چھوٹے لفظ کو بھی بڑے اہتمام سے اپنے مخصوص مقام پر جڑ دیتا ہے جیسے جوہری نگینے کو۔ اس شعر میں چاند کی نسبت سے لفظ "بنگر" (دیکھ) دکھایا گیا ہے اس کے علاوہ اس شعر میں ماہ اور انچھوتا قافیہ "بنان" بھی عظمتِ فن کی دلیل ہے۔ یہ شعر صنعت تلمیح میں ہے جہاں معجزۂ شق القمر کا ذکر ہے صنعت اشتقاق میں دو نیم اور نیم جنبش شامل ہیں۔
شعر (۸):

ور خود ز نقش مہر نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشان محمد است

(ترجمہ) اگر مہر نبوت (جو حضور کی پشت پر پیدائشی نشان تھا) کی بات ہو تو یہ جاننا چاہیے کہ وہ حضور کی نسبت سے ارفع اور معتبر ہوئی۔
(تشریح و محاسن) مہر نبوت کا اعتبار اور اس کی قدر حضور کے جسم اقدس کی نسبت سے ہی ہے۔ یہ شعر صنعت تلمیح میں ہے۔ اس شعر کی اصل خوبصورتی صنعت ایہام ہے یہاں مہر کے معنی وہ دفتری مہر بھی لی جا سکتی ہے جو منصب دار یا عہدہ دار استعمال کرتے ہیں چنانچہ منصب نبوت کی مہر یا نبوت کو حضور کی ذات سے نسبت ملی نہ کہ نبوت سے حضور کو یعنی انبیاؤں میں حضور سا عظیم المرتبت نبی پیدا نہ ہوا۔ اس شعر میں نقش، نشان، مہر صنعت مراعات النظیر میں ہے۔
شعر (۹):

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

(ترجمہ) غالب نے حضرت محمد مصطفیٰ کی ثنا کو حق تعالیٰ پر چھوڑ دیا اس لئے کہ وہ صرف محمد کے مقام اور مرتبے سے واقف ہے۔ یہ غالب کے معروف مقطعوں میں شمار ہوتا ہے اس شعر میں شاعر کے عجز و انکسار کے ساتھ حضور کی بلند قامت کا ذکر بھی ہے جس کا احاطہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ بقول جامی:

لا یمکن الثنا کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(بعض لوگوں نے غلطی سے اس شعر کو مولوی عبدالعزیز بن محمد دہلوی کا شعر لکھا ہے یہ شعر ان کی بیاض کے منتخب اشعار میں شامل ہے لیکن ان کا نہیں) غالب کے مقطع کی طرح عجز و انکساری کے مضمون کو اردو اور فارسی کے شعراء نے مختلف طریقوں سے باندھا ہے جیسا کہ فخر الدین عراقی نے لکھا کہ میں اس لئے نعت کہہ سکا کہ اس میں میری مدد حق تعالیٰ نے کی۔

کنون گویم ثنا ہائے پیمبر
کہ مارا سوئے یزداں ست رہبر

یا نظیری کہتا ہے:

نعتِ مصطفیٰ ماست تمام
کز لب حق بہ یزداں ہم کلام

غالب کے اس مضمون کو تین سو سال قبل سعد اللہ پانی پتی نے یوں باندھا:

خدا نعت محمد داند و بس
نیاید کار یزداں از دگر کس

آخر میں ہم یہ کہتے ہیں کہ غالب کی نعت کی ایک انفرادی کیفیت یہ بھی ہے کہ اس کے تمام تر اشعار نعت کے کلیدی موضوعات اور مرکزی اہمیت کے مضامین رکھتے ہیں۔ یہاں ثانوی مضامین یعنی سراپا، فراق مدینہ، مطالب دنیوی کا ذکر نہیں۔ تمام تر قصیدہ غزل میں حضور کی تجلیل اور تعریف کرکے بڑے ہی خوبصورت انداز میں اس وظیفہ عشق کو حق تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کہ حضور کی مدح اور ثنا تو صرف وہی کر سکتا ہے جو ان کے مرتبہ اور مقام سے آگاہ ہے۔
خواجہ حافظ شیرازی نے سچ کہا ہے:

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو بردن کمال بے ادبی ست

مجھے نہ کرو وداع

پروفیسر قیصر نجفی

جیسے کوئی جھرنا پیچ در پیچ پہاڑی روشوں میں اپنا راستہ خود بناتا ہے، اسی طرح علم و فن بھی اپنی اظہاریت میں خودکار ہیں اور غزل، نظم، نثر، نظم، صوت و آہنگ یا تیشہ و سنگ کے کسی بھی تخلیقی و فنی اظہار میں از خود ظہور پاتے ہیں۔ البتہ اعماق و وسعتِ علم و فن کا مدار تخلیق کار کی بضاعتِ علمی و استطاعتِ فنی پر ہے۔ اس حقیقت کا ہمیں اس وقت بھرپور احساس ہوا، جب ہم نے ستیہ پال آنند کے مجموعہ کلام "مجھے نہ کرو وداع" کا مطالعہ کیا۔ اس مجموعے کو شعر و دانش کا سنگم کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اس مجموعہ کلام میں ان کے بے پناہ وہبی و اکتسابی علم کے سوتے پھوٹتے اور فکر و فن کی بھول بھلیوں میں خود بخود راستہ بناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

"مجھے نہ کرو وداع" بظاہر ایک شعری مجموعہ ہے، جس میں رنگا رنگ طویل و مختصر نظموں کی بزم سجی ہے مگر در حقیقت اس میں متنوع علوم مثلاً نفسیات، سیاسیات، عمرانیات، تاریخ، تمدن اور ثقافت کی قوسِ قزح واضح ہوتی ہے۔ ہم نے ایسے مجموعے خال خال دیکھے ہیں، جو بیک وقت شعری دانش اور علمی فراست کے مظہر ہوں.... ستیہ پال آنند نے علمی و فنی اظہار کے لئے کسی اور صنفِ سخن خاص کر غزل کے بجائے نظم اور وہ بھی آزاد نظم کی فارم (Form) کا انتخاب کیا ہے۔ بلاشبہ ان کے تبحرِ علمی کی یہی شعری صنف اور یہی نئی ہیئت متحمل ہو سکتی تھی۔

کسی بھی زبان کی بڑی شاعری کی اساس تین موضوعات، انسان، زندگی اور کائنات پر رکھی ہے۔ ان موضوعات میں سے کسی ایک موضوع یا اس کے متعلقات سے صرفِ نظر اظہار و بیان کو تشنۂ تکمیل کر دینے کے مترادف ہے۔ ستیہ پال آنند کے ہاں ان تینوں موضوعات پر مع متعلقات عمیق نظر سے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ انہوں نے انسان کو اپنی ذات، زندگی کو اپنی حیات اور کائنات کو اپنے درون بمعہ جہات کے حوالے سے دیکھا ہے۔ گویا ان کی شاعری کو ان کی ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی ذات ہی وہ قوی ٹرانسمیٹر (Transmitter) ہے، جس کے ذریعے اجتماعی مسائل و معاملات کی تفہیم ہوتی ہے۔ فرد کو اجتماع اور سرگزشت کو ماجرائے انفس و آفاق کا استعارہ بنانا ایک مشکل فن ہے۔ پال صاحب اس فن میں یکتا ہیں۔

الفاظ سے ماورا احساسات کو زبان دینا ستیہ پال آنند کا منفرد فنی اختصاص ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے ان کی حسیات ہی نہیں لفظیات بھی بصیرت و بینائی کی حامل ہیں۔ وہ جب بھی کسی واحد کیفیت، مکانی اور صورتِ زمانی کا انکشاف و اعلان کرتے ہیں تو اس پر کشف کا گمان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں توازن و اعتدالِ زبان و بیان اور بلاغت، فکر و نظر کے جوہر نے لئے ہیں، ان پر الہام و القاء کے الفاظ کا اطلاق ہی ادبی دیانت داری ہے۔ وہ اعجازی قلم اور فطری اسلوبِ نگارش کے قائل ہیں اور حرف و صوت و صدا کے تصنع کو مکر و ریا سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسجع و مقفیٰ عبارت آرائی تماشا ہے، بازیگری ہے۔ نظم "الفاظ۔ ایک استغاثہ" کی یہ لائنیں ملاحظہ کیجئے۔

مجھے کیا پڑی ہے کہ لفظوں کی جادوگری کے کرشمے / ہوا میں اڑاؤں / مسجع عبارت / صدائے مقفیٰ تو کاریگری ہے / تماشا ہے، سرکس کا بازیگری ہے / ...
مگر حرف و صوت و صدا کا تصنع بھی کر رہا ہے

ستیہ پال آنند مجتہد و ہنرمند سخن ور ہیں۔ وہ فکر و خیال میں ہی نہیں گفتار و بیان میں بھی جدت آفرینی کے رسیا ہیں۔ وہ شعر و سخن کو وقت کی تقویمِ نو کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ ہر چند انہوں نے غزل کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے مگر ہمارے خیال میں انہوں نے غزل کو شاید ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے مسترد نہیں کیا ہے بلکہ غزل کی تنگ دامنی، روایتی لفظیات، دقیانوسی تلازمات اور فرسودہ استعارات و تشبیہات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ یہ صدا اس آواز کی بھی بازگشت معلوم کی جا سکتی ہے، جو غالب جیسے تغزل کے بادشاہ کے کلام میں سنائی دیتی ہے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

ستیہ پال آنند نے اپنا احتجاج "نظم" "میں خوابوں، خیالوں کا دریوزہ گر" میں ان الفاظ میں ریکارڈ کرایا ہے

میں اردو کا شاعر / خیالوں کا، خوابوں کا دریوزہ گر اب / اجازت کا طالب ہوں / ملائے رومی سے، درویشِ شیراز سے، اے بزرگو! مجھے اب مرے حال پر چھوڑ دو / میں نئے دور کی اس صدی میں تمہاری / "غزل گفتنی" کے بھی استعاروں / سبو، جام، ساغر، لبِ لعل، ابروئے خمدار، یارِ طرحدار جیسے / اشاروں کنایوں کی اس بزم سے رخصتی چاہتا ہوں

ستیہ پال آنند کی شعری دانش کو قوت و وسعت فراہم کرنے والے ماخذوں میں گوتم بدھ کا فکر و فلسفہ، روایات و اساطیر، سیکولر نظریات، قدیم و جدید تہذیبی و ثقافتی اقدار، وسیع و عمیق تجربات و مشاہدات اور عصری آگہی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ تتھا گت سیریز کی نظمیں مہاتما بدھ سے ان کی محبت و عقیدت کی بھی مظہر ہیں اور ان کے فلسفۂ حیات اور تعلیمات کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ خصوصاً خدا کے بارے میں گوتم بدھ کے تصور کو سامنے لاتی ہیں۔ "نیا دین کیوں" از ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق:

"برہمنیت (ہندومت) ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر وہ خدا کے مظاہر کی بھی پوجا کرتے ہیں...... برہمنوں کے مطابق دیوتاؤں کی تعداد چالیس کروڑ ہے...... مہاتما بدھ خدا کے بارے میں خاموش ہے"

لیکن پال صاحب کی نظم "بہت وحشت" میں کوتم بدھ کو خدا کی ہستی کی نفی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے بھکشو آنند کے استفسار پر تتھا گت کہتے ہیں۔

چپ رہا کچھ دیر بھکشو/ پھر یکا یک بول اٹھا/ جب وجود روح نہیں
ہیں تو تتھا گت / کیا خدا بھی کوئی ہستی نہیں ہے؟
ہاں خدا بھی کوئی ہستی نہیں ہے/ بدھ کی آواز میں نرمی تھی لیکن/
کوئی کوئی کیفیت نہیں تھی

لیکن آگے چل کر وہ عجب استدلال پیش کرتے ہیں۔ جس میں نفی سے اثبات کا پہلو نکلتا ہے۔ منطق کی رو سے کسی وجود کا انکار ہی اس وجود کا اقرار ہے۔ یعنی اگر کوئی وجود سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو اس صورت میں نہ تو اس کے انکار کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی اقرار کا۔

اد ہوں کم ہوں سوجوں کی/ اد ہوں کم ہوں دھرتیوں کی/ ہستکا
سید ھا تعلق نیست سے ہے/ لفظ اگر "ہست" ہے تو "نیست" بھی ہے/ اس
لئے میں نے کہا تھا/ لفظ ہستی نہیں ہے

ستیہ پال آنند کی شعری لفظیات میں کا ذکر یا انتا عمر میں روایات و اساطیر کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے کوئی مابہ الامتیاز رویہ نہیں اختیار کیا ہے۔ بلکہ شعور و تحت الشعور میں موجود روایات و اساطیر کو چاہے ان کا تعلق کسی بھی تہذیب، مذہب اور معاشرت سے ہو، اپنی نظموں کی شعریات کا جزو لاینفک بنا دیا ہے۔ اسطوری جہات کا عصری منظرنامے سے استنباط ان کی ایک ایسی خوبی ہے، جس کی مثال ن م راشد کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پال صاحب اپنے پیش رو ن م راشد سے متاثر ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے ان کے تمام تر افکار و خیالات پر صاد نہیں کیا ہے۔ بلکہ جہاں کہیں بھی انہیں فکری و نظری تضاد محسوس ہوا ہے انہوں نے اپنی ذہنی اپج سے کام لے کر اس کا الٹ اور بہتر متبادل پیش کر کے اسے واضح کر دیا ہے کہ علم و دانش کے نئے نئے در وا ہو گئے ہیں۔ اس تناظر میں ان کی دو نظمیں "مجھے نہ کرو وداع" اور "انتقام" کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

ہمارے نزدیک ستیہ پال آنند بحیثیت ستیہ پال آنند کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کا نظریہ حیات "جیو اور جینے دو" کے انسان دوست جذبے سے عبارت ہے۔ وہ مذہب، تہذیب، ثقافت، رنگ، نسل، وطن غرض کسی بھی حوالے سے انسانوں میں حدود معاشرت کے روادار نہیں ہیں۔ ان کا دھرم انسانیت ہے۔ وہ تمام ادیان عالم کو خدا تک پہنچنے کے راستے تصور کرتے ہیں۔ وہ "ایشور" کا نام بھی لیتے ہیں اور "اللہ" کا بھی۔ رام و شیام کو بھی پکارتے ہیں اور محمد و عیسیٰ کو بھی۔ مسیح کے زخموں سے رستا ہوا خون بھی انہیں بے چین کر دیتا ہے اور کربلا میں بہتا ہوا لہو بھی۔ ان کی ہمہ گیر فکر کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے پیش نظر کتاب "مجھے نہ کرو وداع" کا آغاز نعت سرکار دو عالمؐ سے کیا ہے۔ ہم جب بھی اس نعت کو پڑھتے ہیں تو آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

تھوڑی سی عمر رہ گئی ہے حضورؐ/ اگلے خوں ابھار سر جھکائے ہوئے/
اور دست طلب بڑھائے ہوئے/ منتظر آپ کی شفاعت کا / ارض طیبہ پہ میں تن
تنہا / دھیان میں گم کھڑا ہوا ہوں حضورؐ / بندۂ عاجز و گنہگار

ستیہ پال آنند کے ذہن کی ہمہ گیری کا اندازہ ان نظموں سے نسبتاً آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ جنہیں انہوں نے اپنے شخصی تجربات و مشاہدات کی روشنی سے عزیزوں اور سوانحی اشاروں سے آراستہ کیا ہے۔ ان نظموں میں وہ اپنے اساسی تشخص سے بھی دست بردار نہیں ہوتے ہیں اور جغرافیائی حد بندیاں بھی قبول نہیں کرتے ہیں۔ یہ نظمیں انہیں ایک ایسے ورلڈ ڈومیسائل (world domicile) شخص کی حیثیت سے متعارف کراتی ہیں، جس کے تمام تر تجربات و مشاہدات آفاقی صداقتوں پر منتج ہوتے ہیں۔ یہاں ان کا فکری کینوس کائنات کی طرح وسیع ہے۔ اس نوع کی نظموں میں "فنا ڈھلک گیا ہے"، "سترہ برس اور ستر برس"، "آخری شو"، "صد فر اموش" دسے ذو و ور "مارچ اور دسمبر" اپنی مثال آپ ہیں۔ ان نظموں کا علامتی اسلوب قابل رشک ہے۔

عصری شعور و جدید حسیت کے حوالے سے بھی ستیہ پال آنند کی نظمیہ شاعری کو اختصاص حاصل ہے۔ وہ عمومی شاعرانہ روش کے علی الرغم اپنے عہد سے کٹ کر شاعری نہیں کرتے۔ ان کی اکثر و بیشتر نظموں کا دور حاضر کا آشوب نہایت دردمندانہ انداز میں بیان ہوا ہے۔ بالخصوص انہوں نے انسان کی روز افزوں ناقدری، بے چارگی اور کسمپرسی کو ایک لمحۂ فکریہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں مشینوں کی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی ہوئی حاکمیت اور سامراجی قوتوں کے جابرانہ اور استحصالی رویوں پر بھی اظہار تشویش کیا ہے۔ "آخر جیت ہوئی تو کس کی"، "کل کا شتلیق بچہ" اور "پچاس تیر شمارہ ایک ساتھ بارہ" ایسی نظمیں ہیں، جو ستیہ پال آنند کی حسیہ سوچ کی غمازی کرتی ہیں۔

ہم نے پہلے بھی دو ایک تبصروں میں ستیہ پال آنند کی نظموں میں صوفیانہ فکر کی نشان دہی کی ہے۔ "مجھے نہ کرو وداع" کی بعض نظموں میں تصوف کے اسرار و رموز کھولنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظم "ولا میری کھولی مت کر" ایک عمدہ مثال ہے۔ صوفیانہ شاعری کے تاجدار خواجہ میر درد نے کہا تھا:

باغ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں
گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں

پال جی کی یہ نظم بھی خیر و شر کے صوفیانہ تصور کی تشریح و تعبیر کرتی ہے۔

ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اس مضمون میں "مجھے نہ کرو وداع" میں شامل پال جی کی نظمیہ شاعری کی تمام تر فکری و فنی جہات کا احاطہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ لیکن امید کرتے ہیں کہ اہل نظر وہ اضافہ ضرور کریں گے، جو ہم نہیں کر سکے ہیں۔

کیول دھیر کی کہانیاں

منشا یاد

گزشتہ ایک ماہ سے میرے پاس کیول دھیر نے شہر سے بھیجا گیا ایک سو ساٹھ ستر صفحات پر مشتمل افسانوں کا ایک مسودہ، دیباچہ لکھنے کے لئے پڑا ہے جسے میں نے دو دو کر کے قسطوں میں پڑھا اور سب کچھ لکھ لکھ کر بھی نوٹ لگا کر روزانہ چند سطریں گھسیٹتا ہوں۔ اس پر مجھے پھر اسی پرانے خیال نے گھیر لیا ہے کہ افسانہ نگار کو محض اپنی علمیت، اسلوبیاتی کرتب اور کوتگی دعووں سے کام لے کر اپنا ہی الو سیدھا نہیں کرنا چاہیے، بے چارے قاری کا بھی کچھ خیال رکھنا چاہیے۔ کیونکہ جب تک کتاب میں پڑھوانے کی خوبی نہ ہوگی جس کو کوئی مجبوری نہ ہو، انہیں کتاب پڑھنے اور اس پر رائے دینے کی اجرت نہ مل رہی ہو وہ کیوں کر پڑھیں گے۔ آپ اس میں کہانی پن، تخلیقی و رچاؤ بیانی، سسپنس یا زبان و بیان کے حوالے سے دلچسپی کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور ڈالیں کہ عام پڑھنے والے اسے پڑھ سکیں۔ آخر حکیم لوگ بھی تو کڑوی دوائیں کھلانے کے لئے ان میں شہد ملاتے اور معجون کی صورت کھلاتے ہی ہیں حالانکہ اگر وہ شہد نہ بھی ملائیں تو دوا کھانا مریض کی مجبوری ہے۔ اس کے مقابلے میں میں نے کل رات دس بجے کتاب "کیول دھیر کی کہانیاں" پڑھنا شروع کیں اور رات دو بجے تک بیس کہانیوں کی لگ بھگ ایک سو ستر صفحات پر مشتمل پوری کتاب پڑھ ڈالی اور وہ بھی کسی مجبوری کے بغیر۔ اور اب میں کسی فرمائش اور مجبوری کے بغیر اس پر مضمون بھی لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ کتاب نے خود کو پڑھوایا اور اس پر مضمون بھی خود ہی لکھوا رہی ہے۔ اس سے زیادہ کسی کتاب کی کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لے اور خود کو پڑھوا کر دم لے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم پاک و ہند کے لوگ اپنے اپنے شعبے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کے عادی ہیں۔ افسانوں کے موضوعات اور فکشن کے اعتبار سے کیول دھیر صاحب کا مقابلہ بنتا تو تھا دین لئی سے تھا مگر میں نے اس خیال سے کہ کہیں ان دونوں میں سے کوئی ایک برا نہ مان جائے، کیول دھیر سے اپنا تقابلی جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اور جیسے جیسے سوچتا ہوں بہت سی دلچسپ باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیول دھیر تقریباً میرے ہم عمر ہیں۔ صرف ایک برس چھوٹے۔ اس کے علاوہ بھی ہم دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً پنجابیت اور دیہی سنسکرتی اور اردو روزمرہ کو پنجاب کے کھیتوں میں رولنے کی کوشش والا بھی سانجھا تجربہ ہے جنہوں نے ہمارے بعض معروف افسانہ نگاروں کی طرح کہیں "گالیاں نکالنے" استعمال نہیں کیا۔ دوسرے ہم دونوں کا فنی سفر بھی تقریباً ایک ساتھ ہی شروع ہوا۔ پھر وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں، جنہیں ہمارے ہاں حکیم کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے طب یونانی میں ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ تو پدرم حکیم بود۔ یوں میرا پیشہ سول انجینئرنگ سہی مگر میں نے بھی ہومیو پیتھی اور حکمت کے امتحانات پاس کئے ہوئے ہیں۔ کیول دھیر صاحب بھی میری طرح ایک ناول کے مصنف ہیں اور ہم دونوں کی سوانح عمریاں زیر تحریر ہیں۔ ہم دونوں نے ریڈیو ٹی وی کے سیریلز اور ڈرامے بھی لکھے اور دونوں بیسویں صدی میں چھپتے رہے ہیں۔ انہیں اگر بیسویں صدی کی طرف سے ۱۹۸۱ء میں ایوارڈ ملا تو مجھے بھی کچھ ضرور ملا تھا۔ افسوس وہ ہی پرچہ راستے میں گم ہو گیا جس میں میرے کسی افسانے پر انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے دوسرے لوگوں اور ڈاکٹر سلیم اختر کے ذریعے ملی تھی۔ باقی رہا انعام تو اس کا اعلان ہی کافی ہوتا ہے وہ ملے نہ ملے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یوں بھی دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی فضا ایسی ہی ہے کہ کچھ لینا دینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے افسانوں کے معاوضے کے کئی ایک چیک شکریے کے ساتھ واپس کئے ہیں۔ ہاں جب تک خوشتر گرامی زندہ رہے بیسویں صدی باقاعدگی سے ملتا رہا۔ رحمٰن نیر بھی کچھ عرصہ بھجواتے رہے پھر میں نے افسانہ اور انہوں نے پرچہ بھجوانا چھوڑ دیا مگر کیول دھیر صاحب ڈٹے رہے۔ بس ہم دونوں میں یہی فرق ہے کہ مجھے بیسویں صدی نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً کسی دوسری صدی میں جانا پڑا مگر وہ بیسویں صدی سے چمٹے رہے۔ اس لیے آپ مجھے لدھیانے کا منشا یاد اور انہیں شیخوپورے یا اسلام آباد کا کیول دھیر تو شمار نہ کر سکیں گے۔ ان کی کتابیں اور انعامات کی تعداد مجھ سے پانچ گنا زیادہ ہے لیکن ایک بات میں البتہ میں ہی نہیں بلکہ پاکستان بازی لے گیا۔ انہیں ۱۹۹۲ء میں پنجاب سرکار کا سب سے بڑا ایوارڈ "شرومنی اردو ساہتیہ کار ایوارڈ" ملا تھا جس کی مالیت ایک لاکھ روپے تھی۔ اس کے مقابلے میں مجھے جو تمغہ حسن کارکردگی ملا اس کی مالیت تین لاکھ تھی ٹھیک ہے ہمارا روپیہ قیمت نسبتاً کم ہے مگر اتنی بھی کم نہیں۔

جہاں تک کیول دھیر کے اسلوب کا تعلق ہے یہ سیدھا سادا اور سمجھ میں آنے والا ہے کہیں کوئی پیچیدگی نہیں کوئی بات پہیلی نہیں بنتی۔ پانی پر بہتے چلے جانے کی مثال پڑھتے چلے جائیں کہیں رکنا نہیں پڑے گا۔ ان کی کہانیاں ناک کی سیدھ چلتی ہیں۔ برے کو اس کی برائی کی سزا مل جاتی ہے۔ اچھے کو اچھائی کا بدلہ۔ مگر لسی لنگ اور اپنے سٹاف کے ذریعے معصوم لڑکیوں کو بدچلنی کے جھوٹے الزام میں پکڑ کر لانے اور دہشت سے ڈرا کر چھوڑنے کا دھندہ شروع کرتا ہے تو ایک روز اس کے آدمی اس کی اپنی بیٹی کو پکڑ کر لے آتے ہیں۔ اسی طرح ایک بدقماش وزیر کا "ٹیک" پی اے ایک غریب اور بے سہارا لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی سزا دینے کے لئے وزیر موصوف کی سگی بیٹی کو نشے کی حالت میں باپ کے کمرے میں دھکیل دیتا ہے۔ واقعات میں اتفاقات بلکہ حسن اتفاق کا استعمال بھی خوب کیا گیا ہے۔ بچھڑی ہوئی محبت کہیں نہ کہیں مل جاتی ہے۔ بیٹے کو جس لڑکی سے محبت ہوتی ہے وہ باپ کی سابقہ محبوبہ یا چھوڑی ہوئی بیوی ہوتی ہے۔

ان کے پسندیدہ موضوعات میں محبت، ازدواجی زندگیوں اور تعلقات کی بحالی، فرقہ وارانہ فسادات اور جنگ کے خلاف نفرت کا اظہار، بڑی کرپشن اور سیاست کی بد اعمالیوں کے خلاف احتجاج اہم ترین ہیں۔ ان کے موضوعات کا تنوع بہت ہے۔ جب میں ۱۹۹۸ء میں ایک کہانی سیمینار میں شرکت کے لئے دہلی گیا تھا تو بلونت نارنگ نے اپنے خطبہ صدارت میں ایک دلچسپ بات کہی تھی کہ بھارتی افسانے میں علاقائی اور ثقافتی رنگا رنگی کی طرح موضوعات کا تنوع بہت ہے جب کہ پاکستان کا افسانہ اپنے فنی اور تکنیکی پہلوؤں اور زبان و بیان کے حوالے سے ارفع ہے۔ میرا خیال ہے یہ بات آج بھی صحیح ہے اور کرم دھیر کے موضوعات کی رنگا رنگی اور کیا کہوں یہی لگتا ہے۔ یہ کتاب جو میں نے پڑھی ہے ان کے افسانوں کا انتخاب ہے اور بیشتر زیادہ تر شہری معاشرت کی کہانیں ہیں۔ خالص دیہات کی فضا شاید ہی کسی کہانی میں پائی جاتی ہو۔ میرے اور ان کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں ڈاکٹروں اور لڑکیوں کے کردار بہت ہیں۔ ڈاکٹروں سے بعد میں نمٹیں گے، پہلے لڑکیوں کی بات ہو جائے۔ جن کی کثرت سے متعلق مجھے یوسفی کا وہ بیان یاد آیا جس میں انہوں نے کرنل محمد خان کو کہا تھا کہ بجنگ آمد میں عورتیں کچھ زیادہ ہیں۔ اس پر کرنل صاحب نے جواب میں کہا تھا کہ مجھے بھی اس کا احساس ہے اور میں نے دوسرے ایڈیشن میں کچھ عورتیں کم کرنے کی کوشش بھی کی مگر مسئلہ یہ ہے کہ جسے نکالتا ہوں وہ روتی بہت ہے۔

کیول دھیر کی کہانیوں میں رونے والی بھی بہت ہیں اور رلانے والی بھی۔ پیارے پیارے سے ناموں والی وانتی، نیلم، رتنا دیپا عرف بینو، سنگیتا، آرتی، ونتی، کلپنا، ساجدہ، رضیہ، نشی، گیتا، انجلی، شوبھنا، سپنا، کملا، مدھو، پونم، شالنی، اندرا، انجلیکا، روپا، پریتی، گنگا، روحملا وغیرہ (ان کے پسندیدہ بعض نام بار بار استعمال ہوئے ہیں جیسے مدھو، نیلم، بینو وغیرہ)۔ ان میں کالج کی لڑکیاں زیادہ ہیں اور وہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک کافر ادا۔ چھوٹتے ہی آپ کی ملاقات وانتی سے ہوتی ہے:

"حسن و عشق کے سانچے میں ڈھلی وہ ایک قیامت تھی۔ سرو جیسا قد، بل کھاتی کالی کالی زلفیں، لبوں پر شگفتہ مسکراہٹیں، گلاب سے گلابی رخسار، جھکی جھکی پلکوں میں نئی مخمور آنکھیں، بھرے بھرے جسم میں انگڑائیاں بھرتا ہوا الہڑ شباب، حسن و جمال کا دلکش ہیولا تو وہ پیکر تھی وانتی۔ کالج کے وسیع آنگن میں وہ قدم رکھتی تو جیسے بہار آجاتی، خاموش لمحوں کا سحر ٹوٹ جاتا، شوخیاں مچل مچل اٹھتیں، دھڑکتے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں، جذبے بہکنے لگتے اور یوں محسوس ہوتا کہ جیسے شباب جلوہ ریز ہو"

پہلے تو لدھیانہ یا دہلی کی اس حسینہ کے بارے میں پڑھتے ہوئے میں نے سوچا مانوں کہ یہ تحریر بجنت دیپا عرف بینو کی جوانی ہو کر رہ گئی ہو گی:

"وینو کا قد سرو جیسا بڑھ گیا تھا۔ بھرے بھرے جسم میں جوبن انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ شریر و شوخ آنکھیں اور بھی بڑی بڑی نظر آنے لگی تھیں۔ گھنی سیاہ زلفوں کی لمبائی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لبوں کی لالی مزید لال ہو گئی تھی۔ ابھرے ابھرے رخساروں کی گلابی رنگت دہک اٹھی تھی" میں نے تب بھی صبر کیا اور برداشت کیا مگر اس کے بعد ایک اور حسینہ سے ملاقات ہو گئی:

"بے پناہ حسن، خوبصورت ترین جسم، نہایت شیریں و لطیف آواز، جیالی جذبات، شوخ تبسم، سلیقہ، نزاکت، اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ سماجی حیثیت، فرماں بردار، بیباک و آزاد خیالی اس کی دلآویز شخصیت کے کچھ وصف ہیں"

اب کوئی کہاں تک اور کس کس کو نظر انداز کرے۔ مجھے لکھنا ہی پڑی مگر آگے چل کر ان میں سے اکثر بڑی دار اور ٹھیک ٹھاک بیبیاں ثابت ہوئیں۔ برائی کو مٹانے کی خاطر اپنی جان تک کو ہلاک کرسکنے کی جرأت رکھنے والی، اپنی انا کے خول سے باہر نکل کر ٹوٹے ہوئے گھر کو دوبارہ جوڑنے والی، اپنے ڈاکٹر شوہر کی نیکی اور اچھائی کا احساس کر کے اپنی غلطی پر نادم ہونے والی، فرقہ وارانہ فسادات میں زخمی ہونے والوں کو کسی تعصب کے بغیر انسانیت کے ناطے خون دینے اور مدد کرنے والی، برسوں گزر جانے کے بعد بھی اپنی پرانی اور پہلی محبت کو فراموش نہ کرنے اور زندگی بھر یادوں کے گلابوں، تصویروں اور پسندیدہ شعروں کو زندہ اور تازہ رکھنے والی۔

لیکن ان کی کچھ کہانیاں رلانے کی بجائے ہنسانے والی بھی ہیں۔ جیسے شانتی کا رشتہ، اس میں ادیبوں، شاعروں اور فنون لطیفہ سے وابستہ دوسرے فنکاروں کے بارے میں دلچسپ حقائق بیان کئے گئے ہیں اور ساتھ ہی ترقی پذیر ممالک کی حکومتوں کی غلطیوں کا دلچسپ نقشہ بھی کھینچا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹروں کا تعلق ہے۔ بے شک ان کے بہت سے روپ پیش کئے گئے ہیں کہ وہ خود بھی ڈاکٹر ہیں۔ لیکن اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ کیول دھیر نے ان کی مدد سے انسانی خدمت کے سلسلے میں بہت سے قابل قدر نتائج اخذ کئے اور ان کرداروں کی وساطت سے نیکی، اچھائی اور امن و سلامتی کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ آرٹسٹ اور ادیب بھی ان کے پسندیدہ کردار ہیں چنانچہ ان کے افسانوں میں اس قسم کے جملے اور پیرا گراف کثرت سے مل جاتے ہیں:

☆ ڈاکٹر کی ایک زندگی اپنی ہوتی ہے اور ایک ان انسانوں کی جن کے لئے انسان ڈاکٹر بنتا ہے۔

☆ اور ان کی رگوں میں بہنے والا خون نہ ہندو تھا نہ سکھ، یہ لہو انسانوں کا تھا جس کا رنگ سرخ تھا۔

☆ قلم کار کا مذہب تو اس کا قلم ہوتا ہے جو انسانوں کو جینے کا درس دیتا ہے۔

☆ میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ خلوص اور محبت کے آنسوؤں کے

باقی: صفحہ آخر پر ملاحظہ کریں

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی

شہادت

پہلے سمجھو ذرا خدا کیا ہے — پھر سمجھنا کہ کربلا کیا ہے
غم کا درماں ہے خود غمِ شبیر — غمِ شبیر کی دوا کیا ہے
چل رہا ہوں رہِ حسینی پر — کیا خبر مرضیٔ خدا کیا ہے

کچھ ہستیاں، کچھ تخلیق کار اور کچھ فنکار دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی حوالے اور تعارف کے قطعی طلب گار نہیں ہوا کرتے۔ جناب محمد امیر المعروف صبا اکبر آبادی صاحب کی بابت بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ خوشبو، ہوا اور بہار کی طرح خود اپنا تعارف آپ ہیں۔ بہتر سالہ سخن زندگی میں جس قدر بھی کہا بامعنی اور با اعتبار کہا اور ان بہتر سالوں میں کم و بیش اتنے ہی مرثیے سید الشہداء کی شان میں تحریر فرما کر تو تصنیفِ مرثیوں کی بنیاد رکھنے میں گراں قدر خدمات انجام دے کر منفرد و معتبر مقام پر متمکن ہوئے۔ پروفیسر ممتاز حسین صاحب، صبا صاحب کے مرثیوں کے حوالے سے فرماتے ہیں۔ "صبا اکبر آبادی نے جو مرثیے کہے ہیں ان میں دورِ حاضر کی شعری حسیات نے بھی جگہ پائی ہے ہر چند کہ میر انیس کے سائے سے باہر قدم رکھنا کسی بھی مرثیہ گو کے لئے مشکل ہے مگر صبا صاحب نے اپنی آواز کی انفرادیت کو محسوس کرایا ہے۔" جناب انتظار حسین صبا صاحب کے مرثیوں کی بابت یوں رقم طراز ہیں۔ "صبا صاحب کے مرثیوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ مرثیے کو اپنے بکھر جانے کی وجہ کا پتہ چل گیا ہے۔ کم از کم اتنا ضرور پتہ چل گیا ہے کہ کوئی شاعری اپنے عہد کے افکار و تصورات سے الگ تھلگ رہ کر پنپ نہیں سکتی اور صبا صاحب کے مرثیے اس سلسلے کو دوبارہ قائم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔" پروفیسر کرار حسین صاحب کی رائے کے مطابق "ایک عرصے سے یہ بحث جاری ہے کہ میر انیس کے بعد مرثیے میں کوئی وسعت ہوئی ہے یا نہیں۔ کسی ادبی صنف میں وسعت نئے مضامین سے نہیں بلکہ زندگی کے کسی نئے پہلو کو روشن کرنے سے ہوتی ہے اور یوں دیکھا جائے تو صبا صاحب نے مرثیہ میں نئے رخ اور نئے حوالے شامل کئے ہیں۔" ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے بقول "حضرت صبا اکبر آبادی مرثی شہادت میں تلسی داس کی رامائن، فردوسی کا شاہنامہ، نظامی گنجوی کا خمسہ، گوئٹے کا فاؤسٹ، محسن کاکوروی کا قصیدہ لامیہ، حالی کا مدوجزرِ اسلام، انیس کا مرثیہ اور اقبال کا مسجدِ قرطبہ کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔" حضرت مجنوں گورکھپوری صبا صاحب کے کلام کو لاکھوں شاعروں کے کلام سے بہتر گردانتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ صبا اکبر آبادی بیسویں صدی کے ایسے بلند مرتبہ شاعر ہیں جنہوں نے نہ صرف اردو غزل، سلام، منقبت کو سنوارا نکھارا اور نئے معنی اور مفہوم سے آشنا کیا ہے بلکہ مرثیے کے باب میں بھی گراں قدر خدمات انجام دے کر اس معتبر صنف کو مزید عزت و وقار بخشا ہے۔ "شہادت" کم و بیش تین صد صفحات پر محیط ہے اور اسے جناب مشفق خواجہ مرحوم و مغفور نے نہایت توجہ، لگن اور محنت سے ترتیب دیا ہے۔ اس موقع پر محترم صبا اکبر آبادی کے لائق فرزندان جناب سلطان جمیل نسیم اور جناب تاجدار عادل کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بھی ناانصافی کے زمرے میں آئے گا۔ صبا صاحب کے یہ دونوں لائق فرزندان جس عقیدت، محبت اور جاں نثاری سے صبا صاحب کے مشعلِ علم کو تھامے ہوئے ہیں وہ قابلِ مبارکباد بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ "شہادت" کی یہ اشاعت تانی بختیار اکیڈمی، 49-A، بلاک 3، گلشنِ اقبال سے فقط تین صد روپے میں دستیاب ہے۔

خواب سرائے

"اقتدار اور دولت جب آتی ہے تو بہت سی چیزیں مفت میں ساتھ آجاتی ہیں جیسے مشورے دینے والے، چاپلوسی کرنے والے اور ہاں میں ہاں ملانے والے اور زکاتوں، عطیوں اور چندوں سے کچھ فلاحی جماعتوں والی لکی بندے مار تنظیمیں جو نوجوانوں کی کھوپڑیوں سے دماغ کی جھلی نکال کر اس کی جگہ بھس بھر دیتی ہیں اور وہ علم اور ٹیکنالوجی کے بجائے پرانے زمانے کے ہتھیاروں اور جذبوں سے گائیڈڈ میزائلوں کا مقابلہ کرنے نکلتے اور ان کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چور اچکے، اٹھائی گیرے، پولیس اور ٹیکس کے مختلف محکمے بھی الرٹ ہو گئے تھے۔ میراثی، کنجر، ڈوم، بھانڈ اور اس قسم کی دوسری برادریوں کے حاسدین اور ناقدین اس کے علاوہ تھے۔ جہاں گڑ وہاں مکھیاں، جہاں دولت وہاں ٹھگ۔ استاد کو اپنی اور اپنی دولت کی حفاظت کی خاطر ضرورت محسوس ہوتی کہ پولیس، ٹیکسوں کے محکمے اور انتظامیہ سے تعلقات استوار کئے جائیں۔ حکومت اور اقتدار پسند سیاسی پارٹیاں خود ایسے دولت مندوں کی تلاش میں رہتی تھیں جو گھوڑوں اور گدھوں کی خریداری میں خود کفیل ہوں۔ چنانچہ استاد نفاست علی خان نے درجہ بہ درجہ اوپر تک رسائی حاصل کر لی اور حکومتی حلقوں میں اوپر تک بار پا گئے۔"

افسانہ "تیاری" سے اقتباس

نشاط صاحب اردو افسانے کے رموز و اسرار اور فنی یکتائی میں اب اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں جسے ایک ادارہ، انجمن یا محفل و مجلس سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس سے نوجوان لکھاریوں اور ادب کے شائقین کو رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ "خواب سرائے" نشاط صاحب کے بائیس زندہ اور متحرک افسانوں کا مجموعہ ہے جس کی بابت آپ کو اطلاع بھی دی جا سکتی ہے، نوید بھی سنائی جا سکتی ہے، ترغیب دلانا بھی نامناسب نہ ہو گا مگر ان کے افسانے کی تعریف و

توصیف میں اب کوئی لفظ اردو لغت میں بچا ہی نہیں ہے جو جناب منشا یاد کے فن اور اس کی جہات کے بارے ضابطہ تحریر میں لایا جا سکے۔ ایک روایت چند منفرد اور منتخب تخلیقات کی نشان دہی کا بھی منشا یاد پر صادق نہیں ہوتا۔ منشا صاحب کا قلم کہانی تحریر نہیں کرتا بلکہ دلوں اور دماغوں پر نقش کرتا ہے۔ اپنے چہار جانب جہاں جہاں بدصورتی بال پھیلائے کھڑی ہے وہاں وہاں منشا یاد کا قلم مانندِ عقاب پر سنائے موجود ہوتا ہے جو فطرت کے مظاہر اور قدرت کی منشا کو غلط رنگ اور غلط معنی و مفہوم دینے والوں کی گرفت اس طرح کرتا ہے کہ پڑھنے والے کو ہیرو کے بجائے ولن کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی ولن جو قاری کے رگ و پے میں اتر کر معاشرے کے چہرے کی تمام بدصورتیوں کو دور کرنے پر اکساتی ہے اور ہر قسم کی ناانصافی اور بداخلاقی کو انجام تک پہنچانے پر مجبور کرتی ہے۔ ہمت والے منشا یاد کی کہانی سے جرأت، دل والے منشا کی تحریر سے عظمت اور درد والے اُمید پاتے ہیں۔ منشا کی "سیپی" کی اور بجز مستقبل کی۔ وقت ضائع کرنا سراسر اپنا اور اپنی نقصان ہے لہٰذا جس قدر جلد بلکہ فوری "خواب سرائے" کو اپنی دسترس میں لے آیئے اور ایک نئی دنیا، نئے جہان اور نئے سنسار سے آشنا ہو جایئے۔ "خواب سرائے" کی قیمت فقط ایک سو نوے روپے اور دستیابی کا پتہ: دوست پبلی کیشنز A-8 خیابان سہروردی پوسٹ بکس 2958 اسلام آباد سے ممکن ہے۔

دنیا کہیں جسے

"اگر آپ سیاحت کا شوق رکھتے ہیں تو سفر شرط ہے بنا کل کیجئے"

لیکن سفرنامے ضرور پڑھیئے اور دیکھئے کیا لطف ہے جو سیاحت کے شوق میں اور کیا ملتا ہے آپ کو اس دربدری میں..... کبھی انتہائی دلچسپ اور کبھی اس کے برعکس..... لیکن تمھارے شوق سفر اپنا ضروری ہے ویسے بھی یہ ساری زندگی ایک سفر ہی ہے..... کیا خیال ہے ذرا پلٹ کر دیکھئے آپ پالنے میں لیٹے ہوئے ایک شیر خوار تھے مجبور تھے کہ کوئی آپ کو گود میں اٹھائے، دودھ پلائے، پیار کرے..... اب دیکھیں تو آپ سفر کی کس منزل پر ہیں اور سفر ہے کہ جاری ہے..... زندگی حرکت سے عبارت ہے اور اسی حرکت میں سارا حسن ساری رنگینی بلکہ ایک رومانس ہے ورنہ کہاں کولمبس اپنے گھر سے نکلا اور کہاں آج ہم امریکہ دیکھنے آتے۔ آج تسخیر کائنات نے انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے سفر اب کوئی معنی نہیں رکھتے کہ مستقبل کا انسان نظر آنے والے ستاروں سے کہیں دور دیکھ رہا ہے۔"

یہ طویل اور بامعنی اقتباس باسو، شاعر، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار اور مترجم ڈاکٹر انور زاہدی کے سفرنامہ امریکہ، کناڈا، برطانیہ اور دبئی سے لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انور زاہدی صاحب کا پورا نام سید انور مقصود زاہدی ہے۔ بفضل تعالیٰ آپ زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکی اور بیت چکے ہیں۔ افسانے، شاعری اور تراجم پر مشتمل ڈاکٹر صاحب کی تیرہ کتابیں منظر عام پر آ کر اعتبار قائم کر چکی ہیں اور اردو ادب میں اپنی انفرادیت کے ساتھ جانی پہچانی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کم و بیش دس کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر جلد قلمی ادب کو ایک نئی تازگی اور بہار سے آشنا کرنے والی ہیں۔ قارئین ادب نے ڈاکٹر انور زاہدی صاحب سے جو توقعات وابستہ کی ہیں ڈاکٹر صاحب حرف بہ حرف اُن پر نہ صرف پورا اتر رہے ہیں بلکہ بہت سے احباب کو حیرت و استعجاب میں بھی مبتلا کر رہے ہیں۔ چار سو باسٹھ صفحات پر مشتمل "دنیا کہیں جسے" ایک نئے ذائقے اور نئی لذت کا سفرنامہ ہے جس میں زیب داستان سے گریز میں ڈاکٹر انور زاہدی نے دوربینی اور دور اندیشی کو دلچسپی اور سلاست کے جامے میں یوں مقید کیا ہے کہ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک دلچسپی کے ساتھ معلومات کا خزانہ بھی قاری کے ہمرکاب رہتا ہے۔ ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"آج کے اس عظیم شہر نیویارک کی بنا ایک ولندیزی افسر پیٹر مینوئٹ نے 1646 میں اس علاقے کے لینا پی انڈین سے چوبیس ڈالر کے عوض "مین ہٹن" کا علاقہ خرید کے رکھی تھی۔ اس وقت یہ قطعۂ زمین زرخیز پہاڑیوں کی جنت تھی۔ دولت، فن تعمیر اور انجینئرنگ کے کمال نے اس زمین کو گھنی آبادی کے جنگل میں تبدیل کر دیا ہے۔"

الغرض یہ کہ ڈاکٹر انور زاہدی کا سفرنامہ "دنیا کہیں جسے" ایک ایسی دستاویز ہے جس کے ذریعے آپ فقط تین سو پچاس روپے کے عوض امریکہ، کناڈا، برطانیہ اور دبئی کی سیر معہ تمام اہم اور دلچسپ معلومات کے بآسانی دیکھ بھی سکتے ہیں، سن بھی سکتے ہیں اور محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ کتاب کی دستیابی دوست پبلی کیشنز A-8 خیابان سہروردی پوسٹ بکس 2958 اسلام آباد سے ممکن ہے۔

ناکام محبت

بے قرار روح، مضطرب دماغ، بے چین دل اور فنائیت کا بے حساب درد رکھنے والے ساحر لدھیانوی نے محروم طبقات کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے ایام شباب میں شہرت و ناموری کے اس مقام کو پا لیا تھا جس کے لئے لوگ عمریں گنوا کر بھی ناکام و نامراد رہا کرتے ہیں۔ جس طرح ساحر کی ہر دلعزیزی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اسی طرح ساحر کی شخصیت کو متنازعہ بنانے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ بلاشبہ ساحر کی زندگی اور بعد از زندگی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھنے کو باقی ہے۔ باسو، شاعر، ادیب اور مدیر "تخلیق" جناب اظہر جاوید نے ساحر لدھیانوی کی شخصیت و فن پر "ناکام محبت" کے عنوان سے ایک سو چھپن صفحات کی ایسی کتاب تحریر کی ہے جو ساحر شناسوں کے لئے اضافی سوغات، ساحر کے چاہنے والوں کے لئے دلچسپ تحفہ اور ساحر کی بابت جستجو کے حامل افراد کے لئے گراں قدر دستاویز ہے۔ "ناکام محبت" نہ تو ساحر کا تنقیدی

جائزہ ہے۔ حالاتِ زندگی اور نذرانِ ساحر ہے۔ یہ ایک ہلکی پھلکی کتاب ہے جس میں ساحر کی زندگی کے ایسے تمام حالات درج ہیں جو ساحر کی زندگی اور ساحر کے فن کو سمجھنے میں بہت معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہر چند ساحر لدھیانوی کی شخصیت کے ساتھ حاشیہ آرائی کی جتنی گنجائش ہے اُتنی کم کم تخلیق کاروں کی شخصیت میں ہوا کرتی ہے۔ جناب اطہر جاوید نے ہر طرح کی جذباتی اور ڈرامائی کیفیت سے پہلو بچاتے ہوئے برصغیر کم از کم پاکستان کے عاشقانِ ساحر کے لئے ساحر لدھیانوی کی بابت ایک دستاویز تحریر کی ہے جو ساحر کی شخصیت و فن کو جانچنے اور ساحر کی زندگی کے نشیب و فراز سے باخبر ہونے کی قابلِ اعتبار کاوش ہے۔ جناب اطہر جاوید نے ساحر کی بابت جس قدر دلچسپ معلومات مہیا کی ہیں اُن سے چند موتی آپ بھی چُن لیجئے:

☆ ساحر لدھیانوی کو اپنے کالج سے بے پناہ وابستگی تھی۔ جب بھی انہیں لدھیانہ بلایا جاتا وہ سو مصروفیات چھوڑ کر کالج کی تقریب میں دوڑے چلے آتے۔

☆ ساحر کی زندگی میں ہی لدھیانہ کی ایک سڑک کا نام ساحر لدھیانوی کے نام سے منسوب کر دیا گیا تھا۔

☆ جس کالج سے ساحر لدھیانوی معتوب ہو کر نکالا گیا تھا آج اُس کالج میں بطور اعزاز ساحر لدھیانوی کی تصویر لگی ہوئی ہے۔

☆ ساحر جب تک رائٹرز ایسوسی ایشن اور فلم فیڈریشن کے صدر رہے انہوں نے فلم کے سنسر سرٹیفکیٹ پر ہندی فلم کی جگہ اردو فلم ہی لکھوایا۔

☆ ساحر لدھیانوی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اداکار سنیل دت نے جس خونخوار اور وحشی ڈاکو کی زندگی پر فلم بنائی وہ ڈاکو بھی ساحر کے لکھے گیتوں سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

☆ مشہور فلمی شاعر اندیور، حسن رضوی اور آنند بخشی کے بقول ساحر لدھیانوی گیت لکھوانے کے لئے آنے والے اکثر پروڈیوسروں کو اُن کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیا کرتے تھے کہ وہ مجھ سے بہتر گیت لکھ سکتے ہیں۔

☆ ساحر کو کالج کے لڑکے لڑکیوں کا شاعر کہنے والوں کو جناب علی سردار جعفری نے جواب دیا کہ طلباء نے تو سو پچاس سال بعد بھی موجود ہونا ہے لہٰذا ساحر تب بھی اُن کے دل کی دھڑکنوں میں رہے گا۔ یہ تو بڑے اعزاز کی بات ہے۔

☆ فراق صاحب کا مشہور جملہ 'بھائی مشاعرے میں جسے چاہو بلاؤ ٹکٹ تو ساحر کے نام پر ہی بکتے ہیں' ساحر کی مقبولیت کا کتنا بڑا سرٹیفکیٹ بلکہ ڈگری ہے۔

الغرض جہاں اطہر جاوید صاحب نے ساحر کی بہت سی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے وہاں بہت سے اختلافی پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی ہے مگر اُن اختلافات کو تشنہ چھوڑنے کے بجائے مدلّل طریقے سے اُن کی تردید کرکے ساحر کا دفاع بھی کیا ہے جس سے نہ صرف ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور فکر سنوری ہے بلکہ جناب اطہر جاوید کے قلم اور اُن کے قد میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ دیا نظر کے خوبصورت سرورق کی یہ مجلد خوبصورت اور خوب سیرت کتاب صرف ایک سو پچاس روپے کے عوض الحمد پبلی کیشنز پرانی انارکلی لاہور سے بآسانی دستیاب ہے۔

قصہ تمام نہیں ہوا

"لکھنا میری مجبوری ہے پڑھنا آپ کا ضروری نہیں"۔ شمشاد احمد کس قدر خود اعتمادی اور قلم کی قوت پر یقین ہے جناب شمشاد احمد کو کہ ان دو جملوں کے جلو میں دو سو بارہ صفحات پر مشتمل پچیس افسانے سپردِ قلم کرکے قاری کو امتحان سے دو چار کر دیا ہے۔ یہ کل پرسوں کی بات نہیں کئی دہائیوں پر مشتمل افسانوی سفر میں شمشاد احمد نے ہمیشہ اپنے لفظوں کی کاٹ اور تیکھے جملوں سے قاری کو محظوظ بھی کیا ہے اور پڑھنے پر مجبور بھی۔ لفظ مجبور ہم اس لئے استعمال کر رہے ہیں کہ جو قاری ایک بار جناب شمشاد احمد کے افسانے کا ذائقہ چکھ لیتا ہے پھر وہ "شمشادی ٹریکولائزر" کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ اُسے دوسرے لکھاری اور افسانہ نگار کم کم ہی بھاتے ہیں۔

"وہ چونک گیا..... اُس کے گرد جتنے انسان تھے ..... سب کے چہروں پر جعلیاں چڑھی تھیں۔ کسی کا چہرہ اصلی نہ تھا۔ وہ جعلی کو اُتار پھینکنا چاہتا..... لیکن باپ اُس سے بڑا اکڑا تھا..... اُس کا ہاتھ اُس کے کندھے کو نچوڑ رہا تھا..... افسانہ "کچے خواب"۔

نزاکت علی نے مُردہ مرد کے گلے پر چھری رکھ کر فیصلہ کر لیا کہ ..... وہ شرلی کی مسلی رسی میں گردن ڈالنے کو تیار تھا..... اُس کی گردن پھندے میں فٹ ہو رہی تھی..... شرلی مجھ سے شادی کرو گی؟..... پھر پیار کے اُبلتے جھونکے نے شرلی کے زخموں پر انگوروں کے پھاہے رکھ دیئے..... وہ نئی آنکھوں سے نزاکت علی کو جذب کرنے لگی..... افسانہ "مرد"

"تم ہم بچے ضد کر رہے ہیں کہ..... بچے تو پیدا ہی ضد کرنے کے لئے ہوتے ہیں..... کون سی نئی بات ہے..... ثمینہ ہمیشہ کی مانند چپ ہو گئی بچے بھی چپ چاپ ٹرک میں بیٹھ گئے..... ممی ہر شے سے بے نیاز اپنے بالوں کی لٹ کو بار بار انگلیوں پر لپیٹ کھول رہی تھی..... افسانہ "گالی"

"اس نے ویگن اسٹینڈ پر اُتر کر گنے کے رس کا بڑا گلاس چڑھایا..... کڑواہٹ پر مٹھاس غالب آنے لگی تھی..... ٹرین ابھی تک جی کھڑی تھی..... عبدالحق اندر ہی اندر بلبلا رہا تھا..... ایک پلیٹ فارم پر گرم ملک کا بے رحم سورج پورے جاہ و جلال سے چمک رہا تھا..... افسانہ "قصہ"

تمام ہوا"

ہمارے کوٹ کردہ چند جملے ہرچند جناب شمشاد احمد کی افسانہ نگاری کا احاطہ ہرگز نہیں کرتے البتہ اُن کے ہاں موجود معاشرتی کرواہٹ کا بخوبی اندازہ لگانے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ ہمارے کوٹ ہوا اُن کوٹ جملوں کے علاوہ شمشاد احمد کے تازہ افسانوی مجموعے "قصہ تمام نہیں ہوا" میں آپ کے لئے بہت سے "نئے ذائقے" نئے تجربات اور نئے انکشافات آپ کی توجہ کے منتظر ہیں لہٰذا طلب اور تڑپ کا یہ سفر فقط ایک سو پچاس روپے کی ادائیگی کے ذریعے سویرا اپیل کیشنز 56-ای بلاک نارتھ ناظم آباد کراچی پر تمام ہوسکتا ہے۔

دل در یچے

جدید اردو افسانے کی بابت مثبت اور منفی رائے کے حامل افراد اپنی اپنی جگہ معقول دلائل دیا کرتے ہیں۔ "دل دریچے" اردو ادب کے افق پر نمودار ہونے والا ایسا افسانوی مجموعہ ہے جو جدید اردو افسانے کی بابت مثبت رائے رکھنے والے احباب کی رائے کو تقویت بھی دے گا اور اپنے مندرجات کے حوالے سے باوزن بھی کرے گا۔ ملاحظہ فرمایئے محترم احمد ندیم قاسمی کا ارشاد:

"انوار احمد زئی کے افسانے حقیقت پسندی کی اس عظیم روایت کی کڑی ہیں جس کا آغاز منشی پریم چند سے ہوا تھا اور جسے بعد میں راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور غلام عباس وغیرہ نے سنوارا اور نکھارا۔ انوار احمد زئی اپنے افسانوں کے کرداروں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر رہتے ہیں اور ان کرداروں کو ان کی نفسیاتی شاہراہوں پر تنہا چھوڑ دیتے ہیں یوں وہ ایک ایسے افسانہ نگار کا فرض ادا کرتے ہیں جو نہ جھوٹ بولتا ہے نہ تبلیغ کرتا ہے۔ وہ حقیقت کی پینٹنگ میں اپنی فنکارانہ مہارت کے چند خاکے کھینچ کر اور چند رنگ بکھیر کر الگ جا کھڑے ہوتے ہیں جیسے اپنے قاری سے کہہ رہے ہوں کہ اپنا کام ختم ہوا اب افسانے کی تفہیم اور اس کی منظر کشی کے تم وارث ہو۔"

"انوار احمد زئی بڑے ذہین، گہری سوچ کے حامل اور عمیق مشاہدے کے ادیب ہیں۔ انہوں نے افسانے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے اور جس صنف کو اختیار کیا ہے اس میں اپنی فکر اور مہارت بڑی خوبی سے عیاں کی ہے مگر میرے خیال میں وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ کہانی سنانے کے فنی سلیقے پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے آج کی زندگی کا بحران کی منظرنامہ ہیں۔" ڈاکٹر اسلم فرخی:

"مجھے انوار احمد زئی کے افسانوں میں وہ وسعت بیان نظر آتی ہے جو حسن کہلاتی ہے۔ ان کی نظر وسیع مشاہدہ گہرا ہے اور قلم کی روانی قابل دید ہے۔ ان دونوں خوبیوں سے جو افسانہ تخلیق ہوتا ہے اس سے اردو افسانے کا قدم مزید ترقی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔" ڈاکٹر سید معین الرحمٰن:

"پروفیسر انوار احمد زئی ادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے تخلیق کار ہیں اور کیوں نہ ہوں وہ "دردکا رشتہ" جیسے افسانوں کے خالق ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی جھلکیاں پرزندہ اسلوب اور زندہ انداز تحریر معاصر افسانوی ادب کو بالیقین متاثر کرتا رہا ہے۔" ڈاکٹر سلیم اختر:

مبصر کے محدود ذخیرۂ الفاظ کی نسبت ادب کے چار عظیم جغادروں کا خراجِ تحسین اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم اور آپ سب کے لئے "دل دریچے" کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جس قدر زندگی کی دیگر ضروریات لہٰذا تاخیر کیا گمراں قیمت کرنے سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ کیوں نہ اوّلین فرصت میں ادارہ انوار ادب 371-C یونٹ ون لطیف آباد نمبر 8، حیدرآباد سے رجوع کیا جائے جہاں بیس مختلف ذائقوں، جہات اور تجربات پر مبنی افسانے اور اُن کے ان گنت کردو صرف ایک سو پچانویں روپے میں آپ کی دسترس میں آنے کو بے قرار ہیں۔

روشن چہرے

بھارت کے صوبہ تامل ناڈو کے شہر چنئی میں اردو زبان و ادب کا علم جس قدر مضبوطی اور مستقل مزاجی سے جناب علیم صبا نویدی نے تھاما ہوا ہے اس کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ جس قدر بھی سراہا جائے وہ بھی اُن کی پامردی، ہمت اور بلند حوصلگی کے آگے کمتری تصور کیا جائے گا۔ اردو ادب کا قاری، ناقد اور طالب علم جناب علیم صبا نویدی کی شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، تحقیق اور انتھک جستجو اور اس کے فوائد سے نہ صرف باخبر ہے بلکہ اُن کے توسط سے بہت سے نئے گوشوں، نئے مضامین اور نئے خیالات سے مستفید ہونے کا اقرار کرکے جناب علیم صبا نویدی کو خراجِ تحسین پیش کررہا ہے۔ یوں تو جناب علیم صبا نویدی کم و بیش پچاس کتابوں کے مصنف ہونے کا شرف حاصل کرچکے ہیں۔ ہر کتاب اپنے مضمون اور پیشکش کے لحاظ سے قابل قدر اور قابل احترام ٹھہری ہے۔ "روشن چہرے" تامل ناڈو کے منور اور گم شدہ مگر بلند قامت قلم کاروں کی ایسی خوبصورت البم ہے جس میں مولانا مولوی ابوالحسن تقربی ویلوری، سید سیف الدین لطیف آرکاٹی، نواب غوث خان اعظم بہادر، علامہ غضنفر حسین شاہ کرنا ٹکی، علامہ عبدالسلام کمالی ویلوری، مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد، حضرت دانش فرازی آمبوری، مولانا محی الدین صدیقی، مولانا نثار احمد عدوی باقوی جیسے قد آور لوگ "روشن چہرے" کے عنوان سے تمام تر کمالات اور فتوحات کے قلم بند کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ "روشن نام" کے عنوان سے جناب عزیز تمنائی، جناب کاوش بدری، محترمہ فرحت کیفی، جناب راز امتیاز، جناب کاظم نائطی، جناب نثار بدر، حبیب اللہ شاہ صاحب اور شعیب احمد کا فصاحب جیسے سچائیوں کے مناسب تمام تر آب و تاب کے ساتھ محفوظ قلم ہیں۔ "روشن آئینے" کے تحت محترمہ اختر آرکاٹی، محترمہ

ماجد مجیب چاپلوی ٹولپ بیگم بشیر النساء حیا، محترم جناب امتیاز علی ڈاکٹر ذاکرہ غوث، محترمہ مہر طلعت آمبوری، محترمہ امیر النساء، محترمہ خورشید شمسی اور شخصیات کی بابت تمام تر معلومات اس قدر تفصیل اور وضاحت سے جناب علیم صبا نویدی ضابطۂ تحریر میں لائے ہیں کہ ان بلند مرتبت ہستیوں سے پہلے سے ناواقف لوگ نہال اور "روشن چہرے" کے ذریعہ متعارف ہونے والے شناور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

لائق مبارک ڈاکٹر جاوید حبیب بھی ہیں جنہوں نے اس نادر و نایاب کتاب کی نہ صرف ترتیب و تدوین میں جناب علیم صبا نویدی کی معاونت کی ہے بلکہ قدم بہ قدم ڈاکٹر صاحب نے جناب علیم صبا نویدی کی قلمی فتوحات کے لئے توانائی اور سازگار ماحول کی فراہمی میں پرجوش اور بے لوث تعاون مہیا کیا ہے۔ دو سو آٹھ صفحات کی اس تاریخ ساز مجلد دستاویز کی قیمت صرف چار صد روپے ہندوستانی اور دستیابی کا پتہ: 26، امیر النسا بیگم اسٹریٹ، چنئی 600002 بھارت ہے۔

انجمن آرزو

"اس کتاب کا متن واقعی انجمن آرزو میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے اس میں کردار نگاری بھی آ جاتی ہے سفرنامے بھی اور مختصر سطروں میں فلسفیانہ مباحث بھی۔ یہ بہت وقیع مطالعوں، مشاہدوں اور تجربوں کے بہت ہی خوبصورت اظہار پر ہمارے موجودہ ادب میں ایک بڑا اضافہ کرنے والی کتاب ہے"..... جمیل الدین عالی

ڈاکٹر انیس الرحمن نے نثر میں شعری معنویت پیدا کی ہے وہ ناگفتنی کو بھی ایسے سلیقے اور احتیاط سے بیان کرتے ہیں کہ ناہمواری کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ انہوں نے جابجا اسلامی اصولوں کی روشنی میں آج کے پیچیدہ اور روز افزوں مسائل کا جائزہ لیا ہے آج سے پچاس برس پہلے لکھا جانے والا سعادت حسن منٹو کے بارے میں مضمون آج بھی تازہ اور دلکش ہے"..... ڈاکٹر اسلم فرخی

"ڈاکٹر انیس بڑی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے ایک منفرد نکتۂ نظر کے ساتھ قاری کو شریک سفر کیا ہے۔ ڈاکٹر انیس الرحمن صاحب کی تحریر کسی شہر، واقعہ یا منظر کو آپ کے سامنے پیش نہیں کرتی بلکہ پیش منظر سے پس منظر تک پہنچا کر مسائل کی نشاندہی بھی کرتی ہے"..... بانو قدسیہ

"یہ نہ تو کوئی مسلسل سفرنامہ ہے نہ آپ بیتی، رپورتاژ نہ سرگزشت۔ مختلف مضامین کے مختلف ذائقے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ بھی اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی غزل کے اشعار کی طرح۔ ڈاکٹر انیس الرحمن کا قلم ماضی کی جھلک بھی دکھاتا ہے اور آگے بڑھنے کے لئے بھی اکساتا ہے۔ وہ چند فقروں میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جس پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں"..... مجیب الرحمن شامی

"ڈاکٹر انیس الرحمن صاحب طرز ادیب اور دردمند قلم کار ہیں۔ ان کی تحریر میں روانی، بے ساختگی اور ادبی چاشنی سے معمور ہے"..... ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی

درج بالا اقتباسات ڈاکٹر انیس الرحمن کی تازہ تخلیق "انجمن آرزو" سے منسوب ہیں جو ملک کے نامور ادیب، دانشور اور تخلیق کاروں سے مزین ہیں۔ مزید تبصرے، تنقید یا تنقیص کی قطعاً گنجائش نہ ہے البتہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے آپ کا تعارف آپ کے اشتیاق کو مہمیز ضرور دے سکتا ہے۔

"انجمن آرزو" کے مصنف ڈاکٹر انیس الرحمن صاحب پاکستان، امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ اور سعودی عرب کی تعلیمی درسگاہوں سے تدریس کے سلسلے میں منسلک رہے ہیں۔ جامعہ الملک عبدالعزیز جدہ نے ڈاکٹر انیس الرحمن صاحب کو بحیثیت پروفیسر کے تقرر سے سرفراز کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو لاہور شہر کا پہلا ماسٹر پلان بنانے کا شرف بھی حاصل ہے جو امریکہ کی ہر بڑی یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہے۔ ڈاکٹر انیس الرحمن صاحب کو سعودی عرب کے شہر مدینہ کا ماسٹر پلان بنانے کا شرف بھی حاصل ہے ۱۹۹۹ء میں (WHO's WHO IN THE WORLD) کے لئے بھی ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انیس الرحمن صاحب آج کل اپنے علمی، ادبی اور فنی تجربات کو ضابطۂ تحریر میں لا رہے ہیں جس کی ایک صورت ہمارے روبرو "انجمن آرزو" کی شکل میں دستیاب ہے۔ "انجمن آرزو" کی قیمت دو سو پچاس روپے اور ملنے کا پتہ: ماورا پبلی کیشنز، 60 دی مال لاہور ہے۔

پیار بھرے پھولوں کا تاج

ٹی وی، ٹیپ، کتابیں، البم اور ریڈیو کمرے میں
پھر بھی دل کہتا ہے کوئی اور ہو کمرے میں

ایک اور جس سے تنہائی یوں گھل مل کر بات کرے
وہ جیسے نس میں گھوں ہیں کب سے ہم دو کمرے میں

یہ تھے غزل کے دو اشعار جس سے جناب تاج قائم خانی کے شعری وجدان کا اندازہ لگانا دشوار نہ ہونا چاہیے۔ اب ایک سوشیا دوہا ملاحظہ فرمایئے:

روپ روپ ہے ادب میں کن بانی کا دور
اکثر تخلیقات ہیں جیسے ادبی مور
جیسے ادبی مور سندر گلتی اور کچھ
جب پیروں کی اور دیکھو تو ڈکھ او بچے

اب دو غزل کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

جس پل تیری شام ہے اُس پل میری بھور
تو پل کے اُس اور ہے میں پل کے اِس اور
جانے کیوں چت چور کو کہے نہ کوئی چور
لُٹنے والا دے اُٹھے اپنا دل میں ٹھور

کربلا کا حادثہ کے عنوان سے کہی گئی نظم کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے:

کیا ہمیں دے کر گیا ہے کربلا کا حادثہ
اور کیا کیا لے گیا ہے کربلا کا حادثہ
قتلِ عثمان و علی کے بعد یہ قتلِ حسین
ظلم کی اک انتہا ہے یہ کربلا کا حادثہ

اب تاج قائم خانی کے والد محترم کا نیاز احمد خان احمد کی یاد میں کہا گیا قطعۂ تاریخ آپ کی نذر ہے:

آتا ہے کوئی، کوئی ہے جاتا، ہر لحظہ راہِ فنا ہے جاری
فرقت سے جناب احمد خان کی، ہے ظلمتِ غم دلوں پہ طاری
وہ حامیِ حق پناہ مجبور، جس کا شعار بے کسوں کی یاری
مجھ کو جو ہوئی تلاشِ تاریخ مصرعہ یہ ہوا زباں پہ جاری
اسالِ ادب احمد خاں رفت، در خلدِ بریں بحکمِ باری

کسی بھی مختصر تبصرے میں اس قدر مفصل تعارف تخلیق کم کم ہی ہوا کرتا ہے۔ اب آپ پر یہ ذمہ داری آن پڑی ہے کہ جناب تاج قائم خانی کی منفرد شعری جہات سے لطف بھی اٹھایئے اور اُن کے فکر و فن کی بابت قطعیت کے ساتھ کوئی رائے بھی قائم کیجئے۔

کتاب کی ضخامت تین سو چھبیس صفحات پر محیط ہے، قیمت صرف ایک سو پچاس روپے اور دستیابی کی پتہ: 10 سی بلاک 2 سٹلائیٹ ٹاؤن میر پور خاص (سندھ) ہے۔

میری آنکھوں سے دیکھو

اردو ادب و شاعری میں تازہ خون اور تازہ افکار و خیالات کی آمد اس رفتار سے نہیں ہو رہی جس رفتار سے ہونا چاہیئے یا جس رفتار سے دیگر علوم و فنون میں پیش رفت ہو رہی ہے۔ جب ہوا کا کوئی تازہ جھونکا نظر سے گزر کر دل و دماغ کو مسحور کرتا ہے تو اُمید کی کرن پہلے سے زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔ فیصل عظیم ایک ایسی تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہیں جن کے لہجے کی تازگی، خیالات کی ندرت اور مضامین کی اُٹھان دیکھ کر نہایت اطمینان سے اردو شاعری کے مستقبل کی بابت ہر طرح کی خوش اُمیدی میں گرفتار ہوا جا سکتا ہے۔ دعوی کے ثبوت میں ہم اپنے عصر کے بلند قامت شاعر، نقاد اور ماہرِ تعلیم پروفیسر سحر انصاری سے مدد کے طالب ہیں۔

"فیصل عظیم کے کلام میں موضوعات کا تنوع ہے، انہوں نے خود کو دہرانے اور کسی قسم کی یکسانیت پیدا کرنے سے گریز کیا ہے۔ یہ بھی ایک وصف ہے جس کی خاطر ان کی شاعری توجہ سے پڑھی جائے گی۔ میں دانستہ فیصل عظیم کی نظموں، غزلوں سے حوالے پیش نہیں کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری رائے کچھ ایسا اثر دکھائے کہ آپ اسے اپنے ذوقِ ادب اور سخن فہمی کے ساتھ جوڑ کر فیصل عظیم کی تخلیقی باطن تک خود پہنچنے کی کوشش کریں۔ مشک اور خوشبو کے درمیان عطار کا کیا کام؟"

پروفیسر سحر انصاری صاحب بے شک فیصل عظیم کے کلام سے آپ کا دستہ دستہ تعارف نہ کرا کر "میری آنکھوں سے دیکھو" کے مصنف کی صناعی اور ندرت کو خراج پیش کر رہے ہیں مگر ہم ضرور ایسے چند موتی آپ کی نذر کرنا چاہیں گے جن کو پڑھ کر ہمارے گرد و پیش مشک اور خوشبو کا ایسا ہالہ کھنچ گیا ہے جس میں کچھ عرصہ کے لیے مقید ہو کر ہم خود کو پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش، چاق و چوبند، مستعد اور پُر اُمید محسوس کر رہے ہیں:

کبھی قطرہ، کبھی دریا، کبھی گرداب ہوتا ہوں
کبھی اپنے لئے بھی کس قدر نایاب ہوتا ہوں
میں صحرا ہوں مگر تو تو سمندر ہو کے پیاسا ہے
میں اپنے ہی سرابوں سے بہت سیراب ہوتا ہوں

یہ آئینہ کیوں اتنا سوالی ہے؟
شاید اس کو ٹوٹنے کی بے تابی ہے
صحراؤں میں پیاس بجھانے آیا ہوں
تپتی ریت میں بھی کیا سیرابی ہے

فیصل عظیم کی غزل میں جس قدر امکانات نظر آتے ہیں اسی قدر توانائی اور تازگی اُن کی نظم میں بھی ہے۔ ثبوت میں "آخری پَل" کے عنوان سے نہایت عمدہ نثری نظم ملاحظہ کیجئے:

زمیں شاید ادھوری ہے / کسی کی جستجو میں / جو صدیوں سے / خلا میں رقص کرتی ہے / کبھی سورج کی کرنوں سے نہاتی ہے / کبھی یہ چاندنی کے ناز اٹھاتی ہے / ادھورا چاند بھی تو ہے / زمیں کے گرد وہ کیوں طواف کرتا ہے / ادھورے پن سے کیوں اپنا سفر آغاز کرتا ہے..... نظم ابھی جاری ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک فیصل عظیم کا اشتیاق اور اضطراب آپ کے روبرو ہو کر اس کی تکمیل نہیں کرتا۔ درمیان میں حائل زمینی فاصلے ہیں جو ذرا سی جستجو سے فقط ایک سو پچاس روپے کے عوض 207 گلزار بلڈنگ، کراچی سے رابطے کے بعد دور ہو سکتے ہیں۔

ارمغانِ حمد

ارمغانِ حمد اللہ رب کریم کے حضور چھیاسٹھ حمد اور نگلش کردہ چھیاسٹھ حمدیں ودعائیں مناجات پر کہے گئے ہیں یا انگلش کا ترجمہ ہے جسے اہلِ علم پسندیدگی سے دیکھ بھی رہے ہیں، پڑھ بھی رہے ہیں اور سراہ بھی رہے ہیں۔ جناب شاعر علی شاعر بھی نامور اور نوجوان تخلیق کار ہیں ان کے ہاں اساتذہ والی پختگی یا صفائی تلاش کرنا ایک طرح سے زیادتی ہوگی وہ شعر کہہ رہے ہیں اور جذبے و لگن کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔

ہر شخص کہہ رہا ہے سب سے بڑا خدا ہے
یہ تو بھی مانتا ہے سب سے بڑا خدا ہے
مالک وہی ہمارا خالق وہی ہمارا
ہم سب کا آسرا ہے سب سے بڑا خدا ہے

میرے مالک مجھے عظمت عطا کر
شعور و علم کی دولت عطا کر
ہمارا بن گیا دشمن زمانہ
خداوند ہمیں نصرت عطا کر

چند انگلش نظما حظہ فرمایئے:

تجھ پہ واروں جان اپنا کیا ہے یہ تو کام تیرا احسان
کرتی ہے تقدیر اس کو بتانے کی شاعر آگے میری تقدیر
تجھ کو لکھوں میں پہ ہاں تو ہی سلامت رکھنا ہے میرا دین ایمان

"ارمغانِ حمد" کے تعارف کو ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کی رائے زیادہ اعتبار بخش رہی ہے۔

"مجموعی طور پر شاعر علی شاعر کا حمدیہ کلام ان کے عقیدے اور ایمان و احساسات کا مظہر ہے ان کی شاعری روحانیت کی پاسدار ہے۔ امید ہے کہ روز بروز ان کے کلام میں اور نکھار پیدا ہوگا۔" "ارمغانِ حمد" قریب دو صد صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت بھی دو صد روپیہ ہی مقرر کی گئی ہے۔ دستیابی کا پتہ حسبِ ذیل ہے: 75/PWD اسٹاف کوارٹرز نمبر H/31 نرسری روڈ زرین ہوٹل نجیب لائٹ کراچی۔

دوھر فرشتہ

جس وقت ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اردو ادب ماضی کی نسبت روبہ زوال ہے یا گئے وقتوں کی مانند شاہکار تخلیق پا رہے یا تو تخلیق ہی نہیں ہو رہے یا نہایت کم تعداد میں سچا اور نمائندہ ادب تخلیق ہو رہا ہے تو ہمیں اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ زندگی کے دیگر شعبوں میں صورت حال کس قسم کی ہے۔ جب معاشرہ بلکہ کل عالم مادی دوڑ میں اندھا ہو کر تمام اخلاقی حدوں کو پھلانگ رہا ہو ایسے وقت میں فنونِ لطیفہ بالخصوص اردو ادب سے کسی طرح کے معجزے یا کرشمے کی امید قائم کرنا زیادتی تصور ہوگی یا خوش فہمی گردانی جائے گی۔ حوصلہ افزائیات کسی بھی شعبے میں نئے خون، نئے خیالات اور نئے تصورات کی شمولیت ہی گردانا جاتا ہے۔ اردو ادب اس باب میں کسی بھی شعبے سے پیچھے نہیں کسی طرح کے احساس کمتری میں گرفتار ہے نئے لوگ آ رہے ہیں اور نئے احساس، نئی سوچ اور نئی امید کی کرنیں بھی اپنے ساتھ لا رہے ہیں۔ عابدہ تقی نوجوان نسل کی ایسی نمائندہ تخلیق کار ہیں جن کے پاس نازک، تازہ افکار اور تازہ عزم کی دولت بے پناہ اور بے حساب ہے۔ ابھی عابدہ تقی کا فن ارتقا کے اس مرحلے میں ہے جہاں حوصلہ افزائی اور ذرا سی داد ہی ان کو مہمیز لگانے کا کام دے سکتی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم عابدہ تقی سے کسی طرح کی فنی باز پرس اور احتساب سے گریز کریں یا ان کی فنی کوتاہیوں پر گرفت نہ کریں۔ تقاضائے وقت یہ ہے کہ ہم اپنے دیگر نامور تخلیق کاروں کی طرح عابدہ تقی کو بھی بھرپور توجہ اور اشتیاق سے پڑھیں اور ان کی راہیں کشادہ کرنے کے لئے گراں قدر رائے اور فنی رہنمائی سے بھی نوازیں۔

"دھر فرشتہ" عابدہ تقی کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے غالباً ان کے نثری فن کے اظہار کا بھی یہ پہلا وسیلہ ہے جس میں شامل اکیس افسانے ہیں جن میں زندگی کے بہت سے رنگ، نئے رنگوں کی آمیزش سے کچھ اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ ان میں نسائیت اور رومانیت کے ساتھ ایک طرح کا انوکھا تاثر اور پن بھی ہے جھجک ہے، ہچکچاہٹ ہے، سادگی ہے، بھولپن ہے تو تقاضا مشرقی خاتون ہونے کا خطرہ نہ ان کے افسانوں میں زندگی کے بہت اہم اور نازک مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے بقول جناب افتخار عارف "گزشتہ چند برسوں میں نئی نسل کی جن خواتین تخلیق کاروں نے نثر و نظم دونوں اصناف میں اپنی شناخت قائم کی ہے عابدہ تقی ان میں بہت معتبر افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئی ہیں۔" معتبر اور نامور افسانہ نگار جناب حمید شاہد کا خیال ہے: "اب یہاں لکھتے ہوئے میں کیا بتاؤں کہ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے میں بہت جلد بھول گیا کہ یہ ایک شاعرہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ غالباً بیات بیدی نے کہی تھی کہ ایک لکھنے والے کے اندر ایک سے زیادہ تخلیقی وجود ہو سکتے ہیں۔ عابدہ کا یہ دوسرا تخلیقی وجود سادہ زروں کھل کے ہوئے ہے جس میں جذبات بہت اہم ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ اس میدان میں بہت آگے تک جائے گی۔" لیجئے حضور ہماری ناچیز آواز میں دو معتبر اور توانا آوازیں شامل ہو کر آپ کو "دھر فرشتہ" کے مطالعے پر مائل کر رہی ہیں جس کے بعد آپ کو کوئی بھی رائے قائم کرنے اور مستقبل سے ہم کلام "دھر فرشتہ" کی مصنفہ کے مستقبل کی بابت کوئی بھی فیصلہ صادر کرنے کا کلی اختیار ہے۔ ایک سو صفحات کی مجلد یہ کتاب ایک صد پچاس روپے کے عوض شرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی سے دستیاب ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان: حالات اور علمی و ادبی خدمات کے عنوان سے تحریر کردہ ڈاکٹر سرور احمد ذکی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ضخیم کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اس پہلے مقالے کے ممتحن ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر محمد علی

صدیقی صاحبان ہیں۔ 21 مئی 2005 کو وزیراعظم پاکستان جناب شوکت عزیز نے ڈاکٹر سرور احمد زئی کو بہ تحسین پی ایچ ڈی کی ڈگری سے سرفراز فرما کر ایک روشن باب کا اجرا اور کھلی کاوش میں عملی طور پر حصہ لیا۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کے خاندانی پس منظر سے ابتدا کرتے ہوئے ڈاکٹر سرور احمد زئی نے آپ کے ددھیالی شجرۂ نسب، ننھیالی شجرۂ نسب اور سوانح کے حوالے سے مستند اور بھرپور معلومات ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب کی بابت پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کے معتقدین اور نیازمندان کے علاوہ علم و ادب اور روحانیت سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جو عصرِ حاضر کے علاوہ آنے والے وقتوں میں بھی رہنمائی کا فریضہ بہ حسن و خوبی انجام دے گا۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب کی علمی، ادبی اور روحانی خدمات کے حوالے سے چند در گنجے آپ کی توجہ کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں:

☆ 1956ء میں ڈاکٹر صاحب محترم سندھ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے آئے اور آپ کے دور میں تدریسی، علمی، ادبی اور تحقیقی کام کا شاندار آغاز ہوا۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں بنتی ہے۔ آپ کے تیس سالہ دور میں بے شمار طلبا نے ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی میں نمایاں مقام حاصل کیا اور زندگی کی دوڑ میں بھی نامور لوگوں میں شامل رہے۔

☆ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب جب کسی کو مرید کیا کرتے تھے تو جملہ عام سے کہتے تھے "مرید ہونے کا مطلب ہے خود کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں دے دینا، اُن کی سنت کی پیروی اور شریعت کی پابندی کرنا۔"

☆ فارسی پر اردو کا اثر، حالی کا ذہنی ارتقا، علمی نقوش، اقبال اور قرآن، اردو ادب کی تاریخ کے علاوہ سلسلۂ نقشبندیہ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کی کئی درجن کتب علم [illegible] کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

☆ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان زندگی بھر ہر طرح کی گروہ بندی، مناقشے اور مناظرے سے دور رہ کر علم و ادب کی اس طرح خدمت کرتے رہے کہ اُن کے تبحرِ علمی اور استدلال سے بڑے بڑے صاحبِ علم لوگوں کے لئے اختلاف کرنا دشوار تھا۔

☆ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کے مطبوعہ مضامین کا اشاریہ اس قدر طویل اور پُرکار ہے کہ جن رسائل اور اخبارات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

آخر میں ہم آپ کی توجہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے تحریر کردہ دیباچے سے ایک اقتباس کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے "مجھے خوشی ہے کہ میں سرور دیباں کے اس علمی کارنامے میں نگران کی حیثیت سے شریک رہا۔ تحقیقی مقالے بہت لکھے جاتے ہیں مگر اس مقالے میں جو گہرائی، متانت اور علمی وقار ہے وہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کے روحانی اثرات کا نتیجہ ہے۔"

مجلد اور مبسوط کتاب کی ضخامت نو سو چھتیس صفحات پر محیط ہے جس کی قیمت فقط پانچ سو روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ دستیابی کا پتہ مندرجہ ذیل ہے: ادارہ فروغ ادب 371/C-1 یونٹ نمبر 8 لطیف آباد، حیدرآباد (سندھ)۔

شہرزاد

راقم الحروف کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اردو کی نئی بستیوں سے زیادہ توقعات اور خوش فہمی پالنے کا سبب گردانتے ہیں مگر جب جب جہاں جہاں سنجیدہ اور ٹھوس کام ہوتا ہے سر اٹھاتا ہوں اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے جو کچھ بس میں ہوتا ہے کر گزرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہوا کا پہلا جھونکا اور خوشبو کی پہلی بہار کی آمد کی نوید دے رہے ہیں۔ "شہرزاد" کا چھٹا شمارہ زیرِ بحث ہے جس پر گفتگو کرنا اور اس کے حسن و خوبی کو آپ سے متعارف کرانا ہمارے لئے فخر ہوا کہ پہلے جھونکے اور خوشبو کی پہلی بہار کی مانند ہے۔ تیس، چھتیس انچ کے سائز پر عمدہ کاغذ، روشن کمپوزنگ، دیدہ زیب چھپائی کے علاوہ "شہرزاد" کے مندرجات بھی اعلیٰ ادبی جریدے کے شایانِ شان ہیں۔ نعت تسنیم فاروقی، منقبت اور اداریہ محمد تسنیم فاروقی، سلام اکبر حیدری اور شفیق خوجہ کے حوالے سے جناب حیدر طباطبائی کے مضمون کے بعد خصوصی گوشہ تحریر ہے جناب حسین شہر علی جس کے قلم کار جناب حیدر طباطبائی، محترمہ نور جہاں نوری، جناب عبدالغفار عزم، محترمہ ثروت اقبال، جناب اعجاز احمد اعجاز اور شفیق فریدی صاحب ہیں۔ حصہ نظم بھی جناب برج کول، جناب ندا فاضلی، ڈاکٹر وحید اختر، جناب باقر مہدی، محترمہ ساجدہ زیدی اور محترمہ طلعت زیدی کی شرکت سے اعتبار کا حامل ہے۔ خصوصی گوشہ ہمارے عصر کے بلند قامت اور صاحبِ اسلوب افسانہ و ناول نگار جناب جتیندر بلو سے منسوب کیا گیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شری رتن سنگھ، شری برج کول، جناب حیدر طباطبائی، پروفیسر قیصر نجفی اور جناب قمر کے تاثرات کے علاوہ جتیندر بلو کی تخلیقات نے اس خصوصی گوشے کی اہمیت اور افادیت کو خوب خوب اجاگر کیا ہے۔ بزمِ مقالات میں جناب شان الحق حقی، جناب ندا فاضلی، جناب قیصر تمکین، جناب آغا سہیل، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر اسد اریب، ڈاکٹر غوث انصاری اور دیگر محترمین کے مضامین بہت سی نئی دنیاؤں کی سیر کرا رہے ہیں۔ حصہ غزلیات میں جناب خلیق ابراہیم خلیق، جناب کرشن کمار طور، جناب جعفر عسکری، جناب سوہن راہی، جناب باقی انصاری، محترمہ نور جہاں نوری اور بے شمار دیگر معروف غزل گو جلوہ افروز ہیں۔ باب داستان کے عنوان سے افسانوی حصے میں محترمہ آصفہ نشاط، جناب عزیز احمد، جناب طاہر نقوی، محترمہ آمنہ مفتی، محترمہ صفیہ صدیقی، جناب شمس جیلانی اور شوکت حیات صاحب کی تخلیقات، مختصر اور مختصر ترین تحریرات کے ساتھ موجود ہیں۔ رنگین اور دلکش سرورق کے اس خوبصورت جریدے کی ضخامت دو سو چھیاسی صفحات پر مشتمل ہے جس کے مدیرِ اعلیٰ جناب حیدر طباطبائی، مدیرِ منتظم سید عاشر، مدیران جناب تسنیم فاروقی اور احسان شاہد صاحبان ہیں۔ قیمت فی پرچہ برطانیہ کے لئے پانچ سٹرلنگ پاؤنڈ ہے اور برطانیہ سے باہر کے قارئین کے لئے سالانہ چندہ بیس سٹرلنگ پاؤنڈ ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے لئے ایک پرچے کی قیمت ایک سو پچاس روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ دستیابی کا پتہ مندرجہ ذیل ہے:

15-Dalkeith Road, Ilford, Essex IGI-IJD London

رس رابطے ..... جستجو ترتیب و تدوین ..... اعجاز کھوکھر

محترم گلزار جاوید صاحب۔

"چہار سُو" کا تازہ شمارہ ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ صاحب کی وساطت سے موصول ہو گیا ہے۔ یہ شمارہ بہت ہی لگن، محنت اور محبت سے مرتب کیا ہے۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ مبارکباد قبول ہو۔ (دیویندر اِسر)

برادرِ عزیز گلزار جاوید! سلام مسنون۔

میں پہلے بھی کسی خط میں اپنے "بکھر جانے کا" اظہار کر چکا ہوں، بچوں کی خاطر اِدھر اُدھر جانا ہی پڑتا ہے۔ جب سے آپ کی بھابی کی تدفین بکرنگ (ٹورنٹو... کینیڈا) میں ہوئی میرا بھی دل یہاں نہیں لگتا۔

میری غیر موجودگی میں جو ڈاک آتی ہے اکثر مہینوں بعد دیکھ پاتا ہوں، اس بار چھ ماہ بعد پڑھنا نصیب ہوا تازہ "چہار سُو" کے پچھلے صفحے پر اندر کی طرف آپ کا دوسطری خط بھی پڑھا۔ آپ کی شکایت درست ہے شرمندہ ہوں کہ عرصے سے آپ کو کچھ نہ بھیج سکا۔

"چہار سُو" (شمارہ) نومبر دسمبر ۲۰۰۹ء سے "اولین صفحہ" کا نقشہ بدلا ہوا نظر آیا۔ آپ ہر شمارہ کسی اہم واقعہ یا کسی خاص کیفیت سے منسوب کرنے لگے ہیں۔ پچھلے برس جو ہولناک سانحہ ہوا اُسے کون بھول سکتا ہے۔ آفاتِ سماوی وارضی ہمارا مقدر بنے۔ بہت سے شعراء نے بھی اس دکھ کا اظہار کیا۔ کسی نے انسان کی بے بسی سے تعبیر کیا کسی نے اعمال کی سزا سے..... کسی نے خدا کا قہر کہا تو کسی نے قیامت سے تعبیر کیا.... لیکن دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جو زلزلوں کی زد میں رہ کر بھی تحفظ کی تدابیر میں مصروف رہتے ہیں اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ سب سے بڑی مثال جاپان کی ہے۔ ہمیں بھی کچھ سوچنا پڑے گا اور کوئی مثبت سوچ اپنانی پڑے گی۔ "چہار سُو" بھی ایک مثبت سوچ کا علم بردار رہا ہے۔

ہاں بھئی۔ ان شماروں میں آپ کے کچھ رفیق نظر نہیں آئے.... سبب؟ آخر انہوں نے آپ کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا؟ کیا اب آپ کو "مجلس مشاورت" کی ضرورت نہیں رہی؟ آپ نے اُن سے بچھڑنے کا افسوس بھی نہیں کیا؟ یہ حضرات .....بالخصوص محترمہ بیگم ناقد رحیم الدین تو وہیں راولپنڈی یا اسلام آباد ہی میں ہیں۔ اُن کے مشورے تو آپ کو حاصل رہے ہوں گے۔ وہ صاحبِ علم خاتون ہیں، کئی کتابوں کی مصنف ہیں اور پھر ڈاکٹر محمود حسین صاحب کی صاحبزادی ہیں جو کئی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ مزید برآں.... اُن کا خاندان تو "ہمہ خاندانِ آفتاب است" کے مصداق ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین (مصنف۔ "روحِ اقبال") ڈاکٹر ذاکر حسین (مشہور ماہر تعلیم وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی اور سابق صدر جمہوریہ ہند) ڈاکٹر عابد حسین (کئی کتابوں کے مصنف) ڈاکٹر صالحہ عابد حسین (مشہور افسانہ نگار) بیگم ناقد رحیم الدین کا نام تو "چہار سُو" کے لیے باعثِ اعزاز تھا۔ بہر حال اس مجلس کے ٹوٹ جانے کا افسوس ہوا۔ سرورق پر تصاویر دینے کی روایت تو آپ پہلے ہی ڈال چکے ہیں۔ اب آخری صفحات پر بھی تصاویر دینے لگے ہیں (تازہ شمارے میں تو ایک شاعر کی مختلف غزلیں دی گئی ہیں) اشتہار نہ ملے تو یہی مصرف بہتر ہے۔

اس بار دیویندر اسر کا گوشہ مرتب کر کے آپ نے ہم سب پر احسان کیا ہے۔ میں تذکرہ کشور و کرم کی اس بات سے تو متفق نہیں ہوں کہ "اردو دنیا انہیں فراموش کر چکی ہے" ارے بھائی، دیویندر اسر تو ہمارے عہد کا روشن ترین ستارہ ہے۔ آپ خود سوچیں، پچاس ساٹھ کتابوں کے مصنف کو کوئی بھلا سکتا ہے۔ افسانہ ہی نہیں تنقید میں بھی وہ ایک بڑا نام ہے اور پھر اردو ہی میں نہیں، انگریزی، ہندی اور پنجابی میں بھی ان کی کتابیں ہیں۔ یہ اور بات کہ وہ سستی شہرت کی طرف نہیں بھاگتے۔ بلاوجہ اپنا نام رسالوں میں دیکھنے کے شوقین نہیں۔ پھر اپنا حلقہ بنا کر ڈھنڈورا پیٹنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ کوئی بھی صاحبِ علم ادیب ایسی اوچھی حرکت نہیں کرتا۔ دیویندر اسر ایک بہت ہی بردبار، سنجیدہ اور پرکشش قسم کے انسان ہیں۔ اُن کی ہر کتاب ان کے وقار میں اضافہ کرتی ہے۔ ان کا کام اتنا زیادہ ہے کہ اُن پر "ایک نمبر" شائع کیا جا سکتا ہے اور یہ کام "ادبِ لطیف" کو کرنا چاہیے۔ ایک اور بات..... "رس رابطے" میں غالب عرفان کا ایک خط چھپا ہے جس میں انہوں نے ایک نوجوان شاعر ملک زادہ جاوید کی ایک غلطی کی نشان دہی کی ہے۔ ملک زادہ جاوید کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ مشہور شاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے فرزند ہیں۔ ہندوستان میں نئی نسل کے مقبول ترین شاعر..... اس نے بھول چوک میں "موزوں" کو "موضوع" لکھ دیا تو اس کی "شاعری" پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ہندوستان کی قومی زبان "ہندی" ہے اور ہندی اور اردو..... ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ اردو کو جب بٹے ملک کا "لباس" نہیں ملا تو اُسے "ہندی" نے اپنا لیا۔ ہم نے اپنے "درباری مزاج" کے زیر اثر فارسی رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیا۔ اور پھر... یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

ہم نے دوسری غلطی یہ کی کہ اپنی "ہندوستانی زبان" کو بہت زیادہ مفرس اور معرب کر دیا اور اس کی الگ شناخت بنالی۔ "ہندی" والوں نے جواباً دیوناگری کے ناطے سنسکرت سے رشتہ جوڑ لیا اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ ہندی کا سرمایہ بننے لگے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اردو پاکستان کی "قومی زبان" بنا دی گئی (محض نمائشی طور پر.... کیونکہ یہاں اردو سرکاری زبان ہے نہ تعلیمی) ہندوستان میں غالباً ایسا نہیں ہوا۔ وہاں ہندی بولی ہی نہیں جاتی بلکہ سرکاری اور تعلیمی زبان بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے نوجوان فارسی رسم الخط میں کبھی کبھی املے کی غلطی کر جاتے ہیں۔ فارسی اور عربی زبانوں میں "ہم صوت"

آوازیں کافی ہیں۔ ٹ س ص یا ز ذ ظ اور ض وغیرہ۔ ان کے "مخصوص مخارج" ہم ادا بھی نہیں کر سکتے (صرف عرب کر سکتے ہیں) فارسی نے چونکہ عربی کے تمام حروف اپنا لیے ہیں اس لیے شاید وہ بھی ان "مخصوص مخارج" کو اپنا چکے ہیں لیکن جس طرح سنسکرت کے مخصوص مخارج اردو والے ادا نہیں کر سکتے اسی طرح ہندی (دیوناگری) میں عربی مخارج ناقابل اظہار بن جاتے ہیں۔ اردو والے تو حیدرآبادی اور پنجابی ہونے کے ناطے ق، خ اور ک بھی درست ادا نہیں کر پاتے۔ ہندی چونکہ اردو کی "بہن" ہے بلکہ دونوں "جڑواں بہنیں" ہیں (صرف لباس ملکی اور غیر ملکی ہیں) اس لیے ہندی والوں نے سنسکرت سے ایک سمجھوتہ کر لیا ہے سنسکرت کے بعض مخارج کو شرف بار دیا ہندی کر دیا ہے مثلاً "ں" کو "ن" بنا دیا۔ "کشا" کو صرف "شا" رہنے دیا۔ "ک"... "ح" کی طرح کہیں کہیں ناقابل اظہار ہو جاتا ہے اس لیے "کشا" سے "ک" اڑا دیا۔

ہم.... عربی اور فارسی کی "اندھی تقلید" کرتے ہیں۔ اس لیے دونوں زبانیں اپنی تمام صوتی خصوصیات حتیٰ کہ تلفظ اور معنوی وحدت کے ساتھ اردو میں در آئی ہیں۔ لیکن زبانیں چونکہ اپنے اپنے ماحول میں پروان چڑھتی ہیں اس لیے اردو میں اکثر فارسی اور عربی الفاظ کے نہ صرف تلفظ بلکہ معنی بھی بدل گئے ہیں۔ خود فارسی میں بڑا تغیر آ گیا ہے جدید فارسی قدیم فارسی سے بہت آگے نکل گئی ہے عربی سے بیشتر الفاظ لینے کے باوجود فارسی عربی کی تابع نہیں ہے یہ "تابعداری" صرف اردو کا نصیب ہے۔

حیدرآباد دکن میں کئی برس پہلے ایک تحریک چلی تھی.... "جیسا بولو ویسا لکھو" اس کے نتیجے میں بعض الفاظ کا نہ صرف تلفظ بلکہ "املا" بھی بدل گیا تھا۔ مثلاً وہاں کچھ لوگ "خواب" کو "خاب" اور "مثانہ" کو "مثانا" بھی لکھنے لگے تھے۔ اس طرح بعض "ہم صوت حروف" بھی اپنے روایتی املے سے باہر نکل آئے تھے۔

میرا خیال ہے ملک زادہ جاوید سے بھی شعوری یا لاشعوری طور پر اس روش کا اظہار ہو گیا ہے۔ (ظاہر ہے اہلِ زبان کے نزدیک یہ غلطی کے مترادف ہے) مگر اس غلطی کی نشاندہی ایک پاکستانی شاعر نے کی ہے.... اسی شمارے کے صفحہ نمبر ۱۵۱ پر ایک "پاکستانی شاعر" منظر زیدی نے "صحیح" کو "سہی" لکھا ہے۔ اس کے بارے میں غالب عرفان کیا کہیں گے... اردو تو فارسی اور عربی لوازمات کے ساتھ پاکستان کی "قومی زبان" ہے.... میرے خیال میں ایسی غلطیوں کو "معیار" بنا کر کسی شاعر کی "شاعری" کو ناپنا نہیں چاہیے بلکہ "غلط فہمی" کو قرینے سے دور کر دینا چاہیے تا کہ۔

انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

غالباً غالب عرفان کا تعلق بھی حیدرآباد دکن سے ہے۔ میں بھی اسی دیار سے نسبت رکھتا ہوں۔ ہمارے لیے ملک زادہ جاوید بھی کہہ سکتا ہے کہ۔

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

غالب عرفان نے محض اس "بھول چوک" کی بنا پر خود کو ملک زادہ جاوید سے "بہتر شاعر" ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ "بہتر اور کمتر" کے فیصلے زندگی میں نہیں ہوتے۔ یہ فیصلہ وقت کرتا ہے۔ غلطیاں غالب اور اقبال سے بھی ہوئی ہیں۔ اور وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ علامہ اقبال تو اپنی کتابوں میں "قطعات" کو بھی "رباعیات" لکھ گئے ہیں۔ کیا وہ ان اصناف کا فرق نہیں جانتے تھے؟ اردو میں تو اُن کے صرف ساڑھے تین مجموعے ہیں۔ زیادہ شاعری اور بڑی تو انہوں نے فارسی میں کی ہے۔ اس چھوٹی سی "غلط فہمی یا غلطی" کے پس منظر کو سمجھے بغیر ہم اُن پر کوئی الزام رکھ سکتے ہیں؟ تو بھائی.... نوجوان تو نوجوان ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ تو نہ دیجیے۔ علامہ اقبال نے ایسے ہی موقعے کے لیے کہا تھا۔

تو ابھی رہگذر میں ہے "قیدِ مقام" سے گزر

امید کہ غالب عرفان میری بات سمجھ گئے ہوں گے اور انہیں میری بات ناگوار بھی محسوس نہیں ہوئی گی۔ میں ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہوں۔

(حمایت علی شاعر)

اچھے بھائی جان! آداب۔

شکریہ اور نوازش ای میل کا۔ میں کینیڈا ایک ماہ رہنے کے بعد لوٹ آیا ہوں لیکن اگلے ہفتے کے آخر میں مجھے ایک بار پھر جانا پڑے گا۔ نروس بریک ڈاؤن کے بعد جو ادویات وہاں کے اسپیشلسٹ نے تجویز کی تھیں ان میں سے ایک غلط اثر کر رہی ہے۔ اعصاب مضمحل ہو گئے ہیں۔ فون پر بات کرنے سے قضیہ نہیں نپٹا۔ جانا پڑے گا۔ لیکن جلدی لوٹ آؤں گا۔ کینیڈا میں علالت کے باوجود دوستوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پہنچتے ہی دوسرے دن ایک کتاب کی رونمائی کے بعد بطور مہمان خصوصی ایک مشاعرے میں شرکت کی۔ محترمہ نسیم سید، اشفاق حسین، تسلیم الٰہی زلفی وغیرہ دوستوں نے گھیر لیا۔ پھر معروف سفرنامہ نگار اطہر رضوی صاحب نے غالب اکادمی کی طرف سے عشائیہ دیا۔ یہ دیر رات گئے تک چلا کیونکہ مجھے اپنی بیس نظمیں پڑھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ دوسرے ہفتے تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے اپنے ٹی وی پروگرام "سحر ساگر" میں میرا انٹرویو اور کلام آدھا آدھ گھنٹے کی دو مختلف نشستوں کے لیے ریکارڈ کیا..... غرضیکہ احباب کی محبت نے آرام نہیں کرنے دیا۔ بزرگ ناول نگار اکرام بریلوی، اشفاق حسین اور "نیوز ایشیا" کے ایڈیٹر لطافت صدیقی صاحب میرے بیٹے کے گھر جہاں میرا قیام تھا تشریف لائے۔

"چہارسُو" کا شمارہ پہنچ گیا۔ دویندر اسر صاحب کو قرطاسِ اعزاز دینے کے لیے ہم سب آپ کے ممنون ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں میری دہلی آمد پر غالب اکادمی میں دیے گئے ایک استقبالیے میں ان سے کوئی پچاس برس کے بعد

ملاقات ہوئی۔ (آپ بھی شمس مغیرہ وہاں پہنچے تھے۔ مجھے یاد ہے بڈو دادا بھی تشریف لائے تھے!) میری پہلی ملاقات دیویندر اسر صاحب سے ۱۹۸۵ء میں ہوئی تھی۔ مرحوم سریندر پرکاش مجھے ان کے دولت کدے پر لے کر گئے تھے اور بعد میں ہم لوگ ہندی لکھاریوں کی ایک "گوشٹھی" (نشست) میں بھی شرکت کے لیے اکٹھے گئے تھے۔ اردو، معاف کیجیے گا! ایک نہایت احسان فراموش زبان ہے۔ کتنے گوہر جن کی چمک دمک آب و تاب آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی، مٹی میں رل گئے اور کسی نے نہ پوچھا۔ دیویندر اسر کے کوائف کو دیکھیں تو دل دہل جاتا ہے۔ بے اختیاری یہ کہتے بن پڑتی ہے ہائے! اس شخص نے اتنا کام کیا اور صرف 'پبلک ریلیشننگ' میں وشواس نہ رکھنے کے کارن اپنا جائز مقام بھی حاصل نہ کر سکا۔ پچاس کی دہائی میں میں نے بھی اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں خوب خوب لکھا۔ کئی افسانے پہلے ہندی میں چھپتے تھے اور بعد میں اردو میں۔ ایک بار کرشن بلدیو وید نے یا دویندر ستیارتھی نے مجھ سے کہا، "آنند تم اردو یا ہندی دونوں میں سے ایک چن لو۔ اور پھر اسی کے ہو رہو۔ دو کشتیوں کا سوار منجدھار میں گر جاتا ہے۔" یہی ہم میں سے بہتوں کا ہوا ہے۔ کشتی پر ہم چند تو خیر بہت بڑے ملاح تھے، لیکن وہ لوگ جن میں میرے علاوہ وید، اسر، ہنس راج رہبر وغیرہ شامل تھے، بھی اس منجدھار میں گر کر پار نہ اتر سکے۔ میں نے تو ۱۹۸۰ء کے بعد ہندی کو بالکل طلاق دے دی، لیکن اسر لکھتے رہے اور شاید اب تک لکھ رہے ہیں۔ نند کشور وکرم کا مضمون "دیویندر جسے لوگ بھول گئے" بہت انہماک سے پڑھا۔ یہ فقرہ پڑھ کر دیر تک سوچتا رہا "اب کچھ برسوں سے اسر صاحب گھر میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بغیر ضرورت کے گھر سے نہیں نکلتے"۔ ۲۰۰۰ء میں جب میں نے انہیں فون کیا کہ میری فلائیٹ اگلے دن ہے اور مجھے ملنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ غالب اکادمی کے فنکشن میں آ جائیں، تو انہوں نے حامی بھری اور جب واقعی نند کشور وکرم انہیں لے کر آ گئے تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی!

نئے شمارے میں مجھے مشمولات کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا ہے۔ صرف برادر عزیز قیصر نجفی صاحب کے مکتوب کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ یہ ان کی محبت ہے کہ وہ مجھے اتنا "مان" دیتے ہیں۔ جی نہیں، میں سنت، سادھو، صوفی کچھ بھی نہیں ہوں۔ صرف تین فارسی شعرا، مولانا روم، شمس تبریز اور سرمد کی شاعری میرے دل میں رچی بسی ہوئی ہے۔ جب بہت غمگین ہوتا ہوں تو ان کے کلام میں ڈوب جاتا ہوں۔ زیرِ نظر نظم جس پر قیصر نجفی صاحب نے اتنی خوبصورتی سے تبصرہ کیا ہے، سرمد کے ایک شعر سے معرضِ وجود میں آئی۔ لکھ رہا ہوں:

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ، غنودیم

منشا یاد صاحب کا مضمون 'اعجاز راہی کی یاد میں' پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ابھی سات آٹھ ماہ پہلے کی ہی بات تو ہے کہ مرحوم نے اپنے کسی عزیز کی معرفت اپنی تین کتابیں مجھے بھجوائیں۔ یہ تھیں "نئیں اظہار"، "اردو افسانے میں علامت نگاری" اور "اردو افسانے میں اسلوب کا رنگ"۔ خطوط کا تبادلہ ہوا تو میں نے علامت نگاری کے بارے میں کتاب پر تبصرہ لکھنے کی حامی بھری۔ پھر میری اہلیہ سخت بیمار ہو گئیں اور میں شرمندہ ہوں کہ لکھنا تو کجا میں ابھی تک کتاب پڑھ بھی نہیں سکا۔

بڑے بھائی جوگندر پال صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے طویل مختصر افسانے "سانپ اور سانپ" کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا۔ سٹائن بک کی ایک کہانی ہے 'The Canary Row' جسے میں نے کوئی چالیس برس پہلے پڑھا تھا۔ اس کا ایک خاکہ سا ذہن میں تھا، شاید وہی خاکہ یہ کہانی لکھنے کا محرک رہا ہو۔ راولپنڈی کی سڑکوں، گلی کوچوں اور لوگوں کو سلام۔

(ستیہ پال آنند)

برادرِ عزیز گلزار جاوید!

"چہارسُو" کے شمارہ ماہ جون کے بارے میں مختصراً عرض ہے۔ دیویندر اسر کی تصاویر اور نسخے کے عکس سے مزین سرورق جاذب نظر ہے۔ لوح کی setting نئی نئی بلکہ آپ کی جدت طرازِ طبیعت کی مظہر ہے۔ دیویندر اسر جامع الکمال ادیب ہیں۔ ادب میں ان کا کام (Work) اس کا متقاضی تھا کہ اس کی تفصیل یک جا طور پر پیش کی جائے اور یہ کام "چہارسُو" نے ادبی دستاویز کی شکل میں انجام دیا ہے۔ حصہ نظم و غزل ہمیشہ کی طرح بھرپور ہے۔ محسن احسان نے بڑی جسارت کے ساتھ یہ شعر کہا ہے:

خدا انس جن کے سب کو دیکھتا ہے
خدائی نے غضب مچایا ہوا ہے

اس شعر پر مجھے ایک ادبی تاریخی واقعہ یاد آ گیا جو میں نے "سرخ سویرا" کے دیباچے میں پڑھا تھا (جو کچھ اس طرح تھا) حیدرآباد دکن کے ایک مشاعرے میں مخدوم محی الدین نظم پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے جب یہ مصرع پڑھا

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

تو قاضی عبدالغفار صاحب کے برابر بیٹھے ہوئے صاحب نے قاضی صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ آج کل کے نوجوانوں میں محبت کا کیسا پاکیزہ جذبہ پروان چڑھ رہا ہے۔ قاضی صاحب نے کہا جیسے وہ ہیں ویسا ہی ان کا خدا بھی ہوگا۔ منظور حسین یاد صاحب نے نئی زمین تراشی ضرور ہے لیکن ردیف "پیچ و خم" کو نبھا نہ سکے۔ مثال کے لیے ان کی غزل کے دو شعر درج ذیل ہیں:

اچھا ہوا انہیں ترے آنچل نے لے لیا
دریا کہاں سنبھالتا تھا آنسو کے پیچ و خم

آخر کو مشکِ نافہ ہی آئی ہے بروئے کار
نکلے نہ شاخِ آہو سے آہو کے پیچ و خم

خوشبو کے پیچ و خم' آہو کے پیچ و خم وغیرہ کی وضاحت ان مصرعوں سے نہیں ہوتی۔ مشکِ نافہ مذکر ہے اس لئے "مشکِ نافہ" کا محل تھا۔ اسی طرح پہلے مصرعے میں "آئے" ہونا چاہئے اس لئے کہ مصرعۂ ثانی میں آنسو (واحد) ہے۔ پیا صاحب ماشاءاللہ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اور غزل میں وہ نئی زمینیں تراشتے رہتے ہیں۔ جاوید شاہین' شاہد واسطی' شبنم شکیل' قیصر نجفی' غالب عرفان' سہیل غازی پوری' پرویز ساحر کی غزلیں اور نظموں میں مناظر عاشق کی "بے نام خلش" خیال آفاقی کی "زلزلے کے بعد پہلی عید" اور حنیف ترین کی طویل نظم اس شمارے کی جان ہیں۔ "رس رابطے" میں حمیدہ معین رضوی کا خط (جو مضمون بھی بن سکتا تھا) حوالوں کے ساتھ نہایت مدلل انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ ادب میں سند میرے نزدیک اس بادر روزگار شخصیت یا سربرآوردہ ادیب کی ہی مستند کہی جاتی ہے جو خود درجۂ استناد پر فائز ہو۔
(محسن بھوپالی)

مدیرِ محترم تسلیم!

"چہارسُو" کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ قرطاسِ اعزاز دیویندر اِسر کے نام دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ دیویندر اِسر ایک فلسفی اور ادبی مفکر کی حیثیت سے قابلِ احترام شخصیت کے مالک ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ تین چار سال کانپور میں بھی مقیم رہے ہیں۔ یہاں میری ان سے کافی قربت رہی ہے۔ اس وقت ان کی عمر بائیس تیئس سال کی رہی ہوگی' لیکن ان کے افسانوں کا طرزِ تخیل اور مفکرانہ زبان سے اچھے اچھے لوگ متاثر ہو جاتے تھے۔ اس وقت یعنی ۱۹۵۰ء کے آس پاس یہاں کانپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار جلسے پابندی سے منعقد ہوتے تھے۔ اِسر صاحب اس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ بعد میں وہ دہلی منتقل ہو گئے۔ اور پھر انجمن سے بھی کنارہ کش ہو گئے۔ چونتیس سال قبل میں نے ان سے دہلی میں ان کے مکان پر ملاقات کی تھی۔ کافی بجھے بجھے سے لگ رہے تھے مگر ادبی سطح پر وہ اب بھی فعال ہیں۔ آپ نے قرطاسِ اعزاز ان کے نام شائع کر کے گویا ایک طرح سے قرض کا بوجھ ادا کیا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔
(نامی انصاری)

محبی گلزار جاوید! تسلیمات۔

آپ کا بہت ہی باوقار رسالہ چہارسُو (مئی۔ جون 2006) ڈاکٹر تشنہ ٹی دہلی کی معرفت ملا۔ میں جلد جواب نہ دے سکا اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میری آنکھوں کی بینائی ساتھ نہیں دے رہی۔ عمر کا تقاضہ ہے کیا کروں۔ Spondalolsis اور ریڑھ کا درد بھی ہے۔ لکھنے پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ دیویندر اِسر کے ساتھ آپ کا انٹرویو اور نند کشور وکرم کا مضمون ہی پڑھ پایا ہوں اور آپ کا بہت ہی اچھا افسانہ "تحریفِ ثانی" بھی پڑھ لیا ہے۔ خوب لکھا ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ کلکتہ کے رسالہ "انشا" نے میرا ایک گوشہ نکالا ہے۔ اعجاز صاحب آپ کو اس کی کاپی بھیج رہے ہیں۔ میں نے اپنے پبلشر ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کو بھی لکھ دیا ہے کہ ان کے پاس میری تصنیفات کی جو جو جلدیں موجود ہیں ان کی ایک ایک کاپی جلد آپ کو ارسال کر دے۔ میں آنکھوں کی تکلیف کے باعث چہارسُو جیسے باوقار ادبی رسالے کے لئے بھی کچھ لکھ نہیں سکا ورنہ اس میں میری کوئی تحریر شائع ہو جاتی تو میں اسے باعثِ فخر سمجھتا۔
(مانک ٹالا)

برادرم گلزار جاوید صاحب! آداب۔

تازہ "چہارسُو" میں محترم دیویندر اِسر کا گوشہ نہایت علمی مرتبے کا ہے۔ آپ کا سوالنامہ بھی بہت علمی تھا اور جوابات بھی بہت علمی۔ لطف آیا۔ اس گوشے کا ایک اور روشن حصہ میرے محترم دوست نند کشور وکرم صاحب کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے اِسر صاحب کے لئے لکھا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا مضمون ہے جو اِسر صاحب کی زندگی' شخصیت' نظریاتی جدوجہد پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک مضمون اتنے اعلیٰ پائے کا اور جامع تھا کہ اِسر صاحب کو نہ جاننے والے پاکستانی قارئین بھی ان سے خوب متعارف ہو جاتے ہیں۔ اِسر صاحب نے اپنی کچھ تصانیف مجھے عنایت کی تھیں۔ میں ان کے ترقی پسندانہ نظریات اور علمی وجاہت کا معترف ہوں۔ وکرم صاحب کا مضمون بھی ان کے ایسے ہی نظریات اور علمی وجاہت کی قابلِ ستائش تفصیلات بیان کرتا ہے۔

غزلوں کا حصہ بہت بہتر ہے۔ اس معیار کی غزلیں بہت کم رسائل میں نظر آتی ہیں۔ مبارک باد۔
(اکبر حمیدی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب!

مجھے چہارسُو کا بنڈل کل موصول ہوا۔ چہارسُو کا یہ شمارہ بھی اپنے سابقہ شماروں کی طرح صفِ اول سے تعلق رکھتا ہے اور پڑھنے اور یادگاری طور پر محفوظ رکھنے کی چیز ہے۔ آپ اسے جس محنت سے ترتیب دیتے ہیں اس کے لئے آپ روایتی داد کے مستحق ہیں۔ تازہ شمارے کی سب سے بہترین تخلیق تقی عابدی اور خلیل داد کے مختصر مگر جامع مقالے ہیں۔ ان دونوں کو اتنا اچھا مضمون لکھنے پر میری دلی مبارک باد۔ سخنِ تازہ کے تحت غزلوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو بہت سی غزلیں محض خانہ پری کے ضمن میں آتی ہیں۔ ایک دو تو سرے سے بحر و وزن سے بھی خارج دکھتی ہیں۔ آپ کا انتخاب ذرا سا سخت ہو جائے تو آپ اس صنف کے ساتھ بہتر سلوک کر سکیں گے۔ افسانے سارے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ بھائی دیویندر اِسر کا گوشہ سر آنکھوں کی ذیل میں آتا ہے۔ اتنا اچھا گوشہ ترتیب دینے پر میری تمام تر خوشیاں آپ کی نذر۔
(کرشن کمار طور)

محترمی گلزار جاوید صاحب!

سلام مسنون... ہائے مجھ جیسوں کا چھپیاں ہوا...

آپ کی ذرہ نوازی، کرم گستری، نظرِ کرم اور توجہ کا معترف و ممنون، سیاحِ چیز بندہ اپنی طویل خاموشی پر آپ سے معذرت خواہ ہے۔ میں پانچ دن تنہا تعلیمی بستی میں رہتا ہوں۔ جمعہ کی سہ پہر کو سکول سے فارغ ہو کر ہنٹنگٹن (Huntington) جاتا ہوں۔ یوں بھاگ دوڑ میں پورا ویک اینڈ گزر جاتا ہے اور پھر اتوار کی شام کو تعلیمی بستی واپس آ کر پورے ہفتے کی تدریس کے لیے اسباق تیار کرتا ہوں.... روزانہ شام کو طلبا کے کاموں کی اصلاح کرتا ہوں... یوں وقت خاموشی سے گزر جاتا ہے.... خط و کتابت کے لیے بھی وقت نہیں ملتا (شعر گوئی کے لیے خاص طور پر وقت فراہم نہیں کرنا پڑتا)

ہر سال یہی سوچتا ہوں کہ اگلے سال جون میں ریٹائرمنٹ لے لوں گا... اور جب وہ جون آتا ہے تو میرا "نوجوان جسم" مجھے اس کام سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے... "میاں! کوئی نوجوانی میں ریٹائر ہوتا ہے؟ ریٹائر ہو کر کیا کرو گے؟".... اس سال بھی یہی سوچا ہے کہ جون ۲۰۰۷ء میں "واقعی" ریٹائر ہو جاؤں.... ارادہ باندھتا ہوں، سوچتا ہوں......

چہارسُو باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ بعض اوقات تو اسے پڑھنے کے لیے بھی یک سوئی نہیں ملتی۔

نئے شمارے میں اسّر صاحب کے فن پر سیر حاصل باتیں ہوئی ہیں۔ ان باتوں میں ادبی رجحانات اور تحریکوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان سے میری معلومات میں اضافہ ہوا.... اس دنیا میں وقت کے جھونکے لیے "خوداکی" رہے ہیں.... ذرا یہ دیکھیے کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے دیوندر اسّر اور اسّر صاحب الٰہ آباد سے منسوب ہیں... اور الٰہ آباد والا ایک ناچیز قلم کار مامون ایمن نیو یارک شہر میں رہتا ہے۔ وہ مامون ایمن اپنے بچپن کے شہر لاہور میں بھی دفن ہونے کا متمنی نہیں رہا کہ اس کی زندگی کے تین حصوں میں سے دو حصے نیو یارک شہر میں گزرے ہیں۔ اس نے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا تھا..... "مجھے یہیں دفن کر دیجیے گا"

ایک بار پھر میں آپ سے اپنی غیر حاضری کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

(مامون ایمن)

میرے مکرم!

آپ کا ارسال کردہ تازہ شمارہ جو کچھ میں نے یہاں آنے سے پیشتر پڑھ لیا تھا وہ یہاں پہنچ کر مکمل کر سکا ہوں اور آج آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ دیوندر اسّر چونکہ میرے ہم عصر ہیں اس لئے چہارسُو کا یہ شمارہ اور بھی دلچسپ لگا کیونکہ پرانے وقتوں کی یادیں از سر نو تازہ ہو گئیں۔ "ایک زمانہ بیت گیا" اس لیے بھی پسند آیا شاید میری ہی باتیں، میری ہی زبان میں، میرے ہی زمانے کی روداد کہہ رہا ہو۔ "آگہی بند اور آدمی افسانہ ہو جائے گا" بڑا اور راست میں آپ کا انٹرویو بے حد دلچسپ رہا اور دیوندر جی اپنی بات بھی کھل کر کہہ گئے ویسے بھی وہ سادہ و صاف اوصاف کی شخصیت ہیں۔ sleeping with the enemy اور Daneing on the Hyphen ان کے مضامین کا اقتباس اچھا لگا اور ایک مسلسل اور نقد اور سے جنگ آزادی اور اس کے بعد کی یاد تازہ کر دی۔ تذکرہ کشور ناہید کا "دوپٹے لوگ بھول گئے" پسند آیا۔ جمندی جعفر اور شمیم حنفی کے مضامین بھی اچھے لگے۔ دیوندر اسّر کے ناول سے ایک باب "خوشبو بن کر لوٹیں گے" اور "آخر ہم ادب کیوں پڑھیں" اچھے ہیں۔ شمشاد احمد کا "ایک دن" اچھی خاصی تصویر کشی ہے۔ دیپک بدکی، ارشاد احمد صدیقی اور رینو بہل کے افسانے اچھے ہیں۔ ڈاکٹر عمران مشتاق کی نظمیں کے رنگ رنگ اور لمحوں کی گرفت انجم جاوید کی دلچسپ ہیں۔ اور قریبی تالی میں قاری صاحب کا کریکٹر سکیچ اور ان کا کہنا آپ کوئی موزوں آدمی کی تلاش کریں اور ہم بھی کوئی مناسب شخص ڈھونڈتے ہیں۔ اور آخر میں حال میزبان کی مہد شکنی، بے مروتی اور بے ایمانی پر جس قدر کھل رہا تھا، اس سے زیادہ اُسے کشور کی بے وفائی، بدمہری اور بدتمیزی کھل رہی تھی۔ کشور کی آواز کا ناسور ٹھہراؤ اور پُرسکون لہجہ بھی حال کی اندرونی کیفیتوں کو بے بسی کے زہر میں تبدیل کر رہا تھا۔ میرے بھائی آپ نے کس چابک دستی سے کہانی کا The end کیا ہے، چھا گئے۔

یوں ماہر کی نظم ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے لئے نے متاثر کیا صفوت علی صفوت کی نظم "سنو!" اچھی لگی عجب بھی لگی اور کہا تو یہ سب کچھ ہر جگہ ہو رہا ہے صرف Nevada(USA) میں ہی نہیں۔ کوئی تر دامن نہیں، کون زانی نہیں۔ کون سود خور نہیں۔ میرے بھائی یہ چھینک ہے، آپ کیوں بھول رہے ہیں۔ کون اس صف سے باہر ہے۔ دل نواز دل کی رنگ دے بستی، اے سالِ رواں جا کے پچاشور کہیں اور تم بھی جنگ کا جائی، ماجد سرحدی کی نظم اور مناظر عاشق کی بے نام خلش، قیصر تجمّی کی عید کم و بیش حمد نظم اس مرتبہ زیادہ جاندار ہے۔ خیال آفاقی کا زلزلہ، زاہد پروین کا اور اک اس شعر نے متاثر کیا "کہکشاں کے سب تارے رات میں اتر تے ہیں یا ہونے پن میں یوں اکثر رونقیں بھی ہوتی ہیں۔ حنیف ترین کی نظم کچھ زیادہ ہی طویل ہے۔ سیدہ تقی عابدہ کا مضمون شاید اسی کا محبت ہے۔ اچھا لگا اور شاہد کا مضمون "اعجاز رہی کی یادیں" پسند آیا۔ قیصر تجمّی کی غزل اور سخی سرور کی غزل بھی پسند آئی۔ "منہ پھیر کے جاتا ہے ابھی بھائی سے بھائی۔ اخلاص ابھی اور زمیں پر سے اُٹھے گا / ہر موڑ پر اس نے مجھے شہرت سے نوازا / پھر میرا یقین کیسے خدا پر سے اُٹھے گا" اور خیال آفاقی کا یہ شعر: "آخری منزل میں ہمارا دل کو رضا کا راس رہ میں انسان نہ مجبور بنتا" غزل اچھی لگی۔ اور مقطع "رہنے دے خیال اپنی خبر لے تو کہاں اور وہ کا پتہ پوچھتا پھرتا ہے بھر دار" اور آپ نے ربطِ سخن میں ڈاکٹر خالد حمید شیدا کے کلام کے لئے بہت اچھی جگہ تلاش کی ہے۔ مبادا کوئی غلطی سے بھی اس سے محروم نہ رہ جائے۔

کیونکہ ہر شعر اپنے اندر ایک خاص تاثر رکھتا ہے ایک ایک شعر بے حد خوبصورت ہے اور مزہ دے جاتا ہے۔ چہارسُو میں اس سے اچھی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ "سخت ہوتی جا رہی تھیں دل کی رگیں، زوغنی ہوئی ہے لیکن بہت کوا یاری ہوئی" میری جانب سے چہارسُو کے اس شمارے کے لئے مبارکباد قبول کریں۔

(یوگیندر بہل تشنہ)

محترم گلزار جاوید۔

پچھلا "چہارسُو" مجھے اپریل کے اواخر میں ہی آپ کی دوسطری تحریر کے ساتھ مل چکا ہے اور میں اس کے مطالعے سے فیض یاب بھی ہو چکا ہوں بلی مطالعے کے دوران صاحبِ اعزاز ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا "بہ اہوامت" یوں لگا کر انہوں نے آپ کے ایک مختصر سوال "... تو آپ کس علاقے اور مصنف کو اولیت دینا پسند کریں گے؟" کے جواب میں آپ کو وہ "الٹا اُولیٰ" سنا دی جس کی نہ تو ضرورت تھی اور نہ جس کا موقع میں یہاں تذکرہ صرف غزل اور نظم پر اُن کی "تھوپا ریک ہیں" کا کر رہا ہوں جس کے تحت انہوں نے جتنے نام گنوائے ہیں اُس میں سے صرف پچاس فی صد نام ہی آج کی شاعری کے نمائندہ نام کہلائے جا سکتے ہیں اور یہ نام بھی انہوں نے لاہور اور کراچی کے علاقوں تک محدود رکھے ہیں اُن کو شاید معلوم نہیں کہ فیصل آباد، ملتان، کوئٹہ، حیدرآباد، رحیم یار خان اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں کیسی دل آویز اور منفرد شاعری ہو رہی ہے ہمارے یہاں تم یکی ہے کہ اپنی پی آر درست رکھنے کے لئے ادب کا بڑے سے بڑا آدمی بھی بیان بازی میں حقیقت سے بہت دور چلا جاتا ہے اور پھر نتیجہ "دوجواب آں غزل" کے طور پر چلتا رہتا ہے ابھی گزشتہ ماہ کے "شاعر" بمبئی (بھارت) میں جبیں بانو، اورنگ آباد (بھارت) کا ایک خط شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ کس طرح حتیٰ کہ مصنف نے اپنا ایک ہی افسانہ "دستک" "دوبار" "شاعر" میں اور ایک بار "شب خون" (الہ آباد) میں شائع کروایا تھا آپ ایسی صورتِ حال کو کیا کہیں گے؟

(غالب عرفان)

گلزار جی۔ سلام + نمسکار۔

سابق شمارے میں آپ نے بھارت کے بلند پایہ اردو اور ہندی کے ادیب جناب دیویندر اِسّر کا گوشہ شائع کر کے اپنا ذوقِ انتخاب اور اپنے سیکولر مزاج کا ٹھوس ثبوت دیا ہے۔ زندہ باد۔ اِسّر صاحب کا وسیع علم، تاثر مطالعہ، تجزیاتی ذہن، تخلیقی صلاحیتیں، دنیاوی معلومات، وژن اور فن اُن کے غیر معمولی ناول "خوشبو بن کے لوٹیں گے"، سنجیدہ کہانیوں اور فکر انگیز مضامین میں جگہ جگہ ہیراِن کر چکا ہے اُردو ادب کو یہ پیرا تقسیمِ ہند کے فوراً بعد ہی نصیب ہو گیا تھا مگر افسوس کہ ترقی پسندوں نے اِسّر صاحب کو وہ رتبہ، وہ مقام نہ دیا جس کے وہ حق دار تھے۔ شاید تحریک کے لیڈران کو ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ یہ بیدار مغز روشن خیال سچا مارکسٹ اُن کی راہ میں حائل نہ ہو؟ اِسّر صاحب خاموش طبع آدمی ہیں۔ ادبی جوڑ توڑ اور سیاست سے کوسوں دور۔ تعلقاتِ عامہ کے ہتھکنڈوں سے بھی نابلد۔ گو کہ خود ماس کمیونی کیشن کے ڈگری یافتہ ہیں لیکن ضمیر سے جڑا ہوا شخص اپنے اصولوں کی خلاف ورزی کیسے کر سکتا ہے؟؟

اِس خط کو یہیں ختم کرنے کا ارادہ تھا لیکن اسے مزید بڑھانے کی ضرورت یوں آن پڑی ہے کہ سابق شمارے میں محترمہ حمیدہ معین رضوی (ساکن لندن) کا ایک طویل خط شائع ہوا ہے موصوفہ نے اپنے خط میں خاکسار کا ذکر بھی بار بار کیا ہے وہ کئی دہائیوں سے لکھ رہی ہیں۔ پہلا افسانہ سن 1962-63 میں شائع ہوا تھا۔ تب سے بلا تکان قلم چلائے جا رہی ہیں۔ کئی توپ خادان کے فن کی مدح سرائی بھی کر چکے ہیں۔ سید محمد عقیل صاحب تو یہاں تک رقم طراز ہیں کہ حمیدہ کا ایک افسانہ "بڑے بھیا" ایک Unique افسانہ ہے۔ بیسیا پیروز بھی اُن کی تعریف کرنے میں پیچھے نہیں رہیں۔ پھر "چہارسُو" جیسے معیاری رسالے میں محترمہ کا گوشہ بھی شائع ہوا ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ اتنا کچھ ادب میں پا کر بھی وہ مرزا حامد بیگ سے سند پانے کی طلب گار ہیں؟ وہ اپنے خط میں بار بار شکایت کرتی دکھائی دیتی ہیں کہ انہیں سند سے کیوں محروم رکھا گیا؟ میرے نزدیک ایک سینئر ادیبہ کا بیدویہ شہرت کے فراق کی دلیل ہے میں گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی فن کار ایک معمولی سی سند کی خاطر اتنا بے قرار ہو سکتا ہے اگر مرزا حامد بیگ نے انگلستان کے قیصر تمکین، جتیندر بلو اور شعر امیں ساقی فاروقی، یاسر کاظمی کو اُن کے فن کے حوالے سے سند دی بھی ہے تو یہ اُن کا اپنا زاویۂ نظر ہے اگر موصوف نے میرا نام نہ بھی لیا ہوتا تو مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی کہ میں تو بے نیاز شخص ہوں۔ یہی سمجھتا کہ میرا فن مرزا جی کے معیار پر پورا نہیں اُترا۔ لہٰذا مجھے سند سے محروم رکھا گیا ہے لیکن حمیدہ معین رضوی کا مسلسل تقاضا تو دعوتِ فکر دیتا ہے محترمہ پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اپنے ہر مضمون میں مغربی نقادوں اور دانشوروں کے حوالے بہم دیا کرتی ہیں۔ ضرور علم رکھتی ہوں گی کہ مصنف کی پہچان سند اور روایتی حوالوں سے نہیں بنا کرتی۔ اُس کی اصلی پہچان اور شناخت تو اُس کے جاندار تخلیقی کام سے دیکھی جاتی ہے یوں بھی ناقدین کے توصیفی کلمات، تعریفی مضامین اور فضا میں ہوا کرام فن کار کے تابوت میں کیل پہ کیل گاڑے چلے جاتے ہیں اور وہ محض شکایات کے واسطے ہی بچ رہتا ہے۔

(جتیندر بلو)

برادرم محترم گلزار جاوید صاحب۔

"چہارسُو" متواتر نظر نواز ہو رہا ہے جس کے لئے انتہائی ممنون ہوں۔ آپ اِس کساد بازاری اور دور کشاکش میں جس تواتر سے علم و ادب کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کر رہے ہیں وہ آپ کی علم دوستی اور زبان و بیان کی بے لوث خدمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بڑی پتہ ماری کا کام

ہے جو آپ بڑی استقامت اور توجہ سے سرانجام دے رہے ہیں۔ دورِ حاضر میں کوئی اس کا اعتراف کرے نہ کرے لیکن تاریخ اور آنے والا ادبی مورخ آپ کی سعیِ مشکور کو کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جو خدمت آپ سرانجام دے رہے ہیں وہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ یہ آپ ہی کا کام ہے۔ یہ جو صلے ہیں جن کے نیاز مند آپ کے خلوص و مہر کے جلائے ہوئے چراغوں کو وقت کی آندھیاں گل نہ کر سکیں گی بلکہ یہ ننھے ننھے چراغ ادب کی راہوں میں آنے والے قافلوں کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں گے۔ (سرور انبالوی)

محترم جاوید صاحب۔ مزاجِ گرامی!

"چہار سُو" جون ۲۰۰۶ء کا شمارہ موصول ہوا۔ آپ نے اس شمارے کو دیویندر اسر سے منسوب کر کے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ ادب لکھنے پڑھنے والوں کو مذہب، ملک اور ذات کے حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ مذہبی، ملکی اور لسانی تعصب کے اس دور میں آپ کا یہ اقدام مثالی ہے۔ دوسرے رسائل کو بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔

دیو صاحب ہمارے دور کے بالغ نظر، باشعور، دانشمند ناقد ادیب ہیں۔ تخلیقی ادب سے بھی ان کا رشتہ ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف ضروری تھا خوشی اس بات کی ہے کہ یہ اعتراف پاکستان کی سرزمین سے ہوا۔ اس شمارے میں آپ نے دیو صاحب کی جو تحریریں شامل کی ہیں ان میں "آخر ہم ادب کیوں پڑھیں" مضمون بطورِ خاص پسند آیا۔ مادیت کے اس دور میں اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں۔ خود میرے بچے اکثر مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ پاپا یہ سب کچھ جو آپ پڑھتے لکھتے رہتے ہیں۔ کتب و رسائل کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں اس کا حاصل کیا ہے۔ میں اس کا تشفی بخش جواب آج تک انہیں نہیں دے سکا ہاں جواب کے طور پر میں نے یہ ضرور کیا کہ انگریزی ادب کی چند کتابیں لائبریری سے جاری کرا کر اُن کو پڑھنے کو دیں اور ادب پڑھنے کا چسکا انہیں بھی لگ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ وقت کے بعد وہ خود یہ محسوس کر لیں گے کہ وہ ادب کیوں پڑھتے ہیں۔ اسر صاحب نے اگرچہ اپنے مضمون میں بڑی حد تک ادب پڑھنے کی صورت کو واضح کر دیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ادب سے انسان کی ذہنی وابستگی کو بڑی سے بڑی دلیل سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ یہ ایک تہذیبی عمل ہے معاشرہ اس کا محور و مرکز ہے۔ ہماری خاندانی اقدار اور روایتیں اس عمل کو بروئے کار لانے میں معاون ثابت ہیں اور ادبی طور پر نہ کوئی ادب کو ادب کی طرح پڑھ سکتا ہے اور نہ اس کو کچھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بڑے تعلیم یافتہ بین الاقوامی شہرت کے حامل حضرات بھی ادب سے نابلد محض ہوتے ہیں۔

(شمس بدایونی)

عزیز تر ین گلزار جاوید، سلام، پیار اور دعائیں۔

بلاشبہ آپ ان سب باتوں کے مستحق ہیں عزیز! اس لئے کہ ہم قلم، سلام یوں کہ آپ کے ہاتھوں اس دورِ پر آشوب میں بھی ادبی جریدہ طلوع ہو رہا ہے۔ پیار آپ کی ان سب باتوں پر جو آپ اس پرچے کو چلانے کے لئے کرتے ہیں اور دعائیں اس سلسلے کو جاری و ساری رکھنے کے لئے۔ زیرِ نظر شمارے میں بھی نظم و نثر دونوں حوالے سے بہت اچھی چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ خود اپنی غزل اور "نظم" کا مشاہدہ کیا۔ دراصل "فکری تخلیقات" لکھنے والوں کا اندرونی رونا یہ ہوتا ہے کہ جس وقت وہ کوئی چیز سوچ رہا ہوتا ہے اور پھر اس کو مناسب الفاظ کے پیرائے میں کاغذ پر رقم کر رہا ہوتا ہے تو بظاہر اسے شاعری یا نثر نگاری سمجھا جاتا ہے دراصل یہ اس کی کیفیت اندروں کا "حال" ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ ماضی بنتا چلا جاتا ہے تو پھر جب کبھی وہ ایک وقفے کے بعد اپنے ہی مخطوطات کو کھنگال رہا ہوتا ہے یا چھپنے کے بعد اس کی نظر گزر رہا ہوتا ہے تو حال و ماضی کی کیفیات کا ایک عجیب اور لطیف ترین تصادم کی صورت اس کے لئے فکر یہ بن جاتا ہے۔ کچھ یہی صورت حال اس وقت میرے سامنے آئی جب میں نے اپنی غزل (کیفیت گذشتہ) کو چہار سُو کی آغوش میں پایا، جو کسی اذیت عظیم سے ہیں واقف۔ وہ لوگ نہ بے زر ہیں، نہ بے زور، نہ بے زار تو اس وقت جس تکلیف دہ لمحات سے گزر رہا تھا وہ گویا راحت میں بدل گئے۔ بیمار کو آرام آ گیا۔ بے زری، بے زوری اور بے زاری کی جو کیفیت بلکہ شدید تر کیفیت ذہن و دل پر غالب آ چکی تھی یہ ابتدائی شعر پڑھ کر مطلوب ہو گئی۔ برادرِ عزیز! یہ بات چہار سُو کے توسط سے ان لوگوں کے لئے آ گئی ہے جو شعر کی طاقت اور اثر آفرینی کے قائل نہیں ہیں۔

(خیال آفاقی)

محبِ گرامی گلزار جاوید صاحب، سلام خلوص

"چہار سُو" کا شمارہ مئی و جون کا شمارہ اپنی روایتی آن بان کے ساتھ منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے۔ مندرجات کے انتخاب میں ہمیشہ کی طرح مزاج و معیار اور تنوع کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ براہِ راست میں گلزار جاوید صاحب کے بلیغ استفسارات سے جناب دیویندر اسر کی شخصیت اور کارناموں کے کئی اہم پہلو اُجاگر ہوئے ہیں۔ ایک زمانہ بیت گیا میں اسر صاحب کی "آتم کتھا" میں کہانیوں کی چاشنی موجود ہی ہے

حقیقت کو میں بھی منظر میں رکھتا ہوں
کہ دلچسپی ہے دنیا کو کہانی سے

(راقم)

منظومات میں صفوت علی صفوت صاحب کی نظم "سنو!" بیحد اثر انگیز تخلیق ہے۔ امریکہ کے مسلمان شہریوں میں موجودہ ناساعد حالات میں صفوت جیسا مردِ مومن شہری ہی ایسی جری (Bold) نظم تخلیق کر سکتا ہے۔ نظم کیا ہے، امریکہ کے ظلم و استبداد اور اخلاقی و انسانی زوال کا جیتا جاگتا منظر نامہ ہے۔ امریکہ کو اُس کی فرعونیت پر کسی موسیٰ کی ممکنہ ضرب کاری سے خبردار کیا،

شاعری کی غیر معمولی جرأت مندی کو ظاہر کرتا ہے۔
غزلیں اور افسانے بھی خوب بہت خوب ہیں' کس کس کا ذکر کیجیے!
(غلام مرتضےٰ راہی)

برادرم گلزار جاوید صاحب۔ مزاج بخیر!
چہارسُو (شمارہ مئی' جون ۲۰۰۶ء) اور آپ کی کاوشوں کا مزید احساس ہوا۔ پاک و ہند کے لکھنے والوں کو جس طرح آپ پیش کر رہے ہیں ایک اچھی روایت ہے اس لئے کہ اہلِ قلم کا وطن ہوتا ہے مگر ادب کی سرحدیں نہیں ہوتی اور اس کے نتائج دور رس ہوتے ہیں۔ یقیناً نیک ہوں تو پھر بھی اچھا لگتا ہے۔ حصہ نظم و نثر خوب ہیں۔ دویندر ساتھ اِسر کی تحریریں اور براہِ راست نے خوب مزا دیا۔ مہدی جعفر اور شمیم حنفی نے حق ادا کیا۔ تذکرہ کشور ورکر کا "دو جیسے لوگ بھول گئے" قابلِ ستائش ہے۔ خشایاد کا مضمون پڑھ کر پرانا دوست اعجاز رہی بہت یاد آیا۔ یوگیندر بہل تشنہ اور دیگر اہلِ قلم کو آداب۔ محسن بھائی (محسن احسان) پشاور آچکے ہیں۔ اُن کا دم غنیمت ہے۔ کبھی پشاور کا قصد ہو تو مطلع فرمائیں۔
(ماجد سرحدی)

جناب گلزار جاوید۔ آداب و نیاز!
"چہارسُو" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ اس عرصے میں شمارہ کی نگارشات توجہ سے پڑھی گئی ہیں۔ یہ خوبصورت شمارہ اپنے وجود میں ایسی تحریریں سمیٹے ہوئے ہیں جو روح کی تشنگی کو پورا کرتا ہے یہ شمارہ بھی آپ کی بے مثال مدیرانہ صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔
جناب دویندر اِسر کو پہلے پڑھا تو تھا مگر فن کے بارے میں پوری جانکاری آپ کے ذریعے سے ہی ملی ہے۔ بیاً آپ بہت اچھا کرتے ہیں کہ ایک مایۂ گرامی شخصیت کے بارے میں قاری کو آپ سے پوری جانکاری حاصل ہو جاتی ہے۔
کسی ایک افسانے کی میرے لئے تعریف کرنا ممکن نہیں ہے۔ "ایک دن" بہت سادہ مگر دل کو چھو جانے والا افسانہ ہے۔ دیپک بدکی صاحب کا "سرحدیں" پڑھ کر معلوم ہوا کہ انہوں نے کتنی غور و فکر کے بعد ان کتوں کے behaviour کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ انسان کی نفسیات پر لکھنا آسان ہے مگر جانوروں کی نفسیات زیادہ توجہ چاہتی ہے۔ "کوکر بھی نہ رہا کہ" ایک اچھا رومانی افسانہ ہے۔ "لمحوں کی گرفت" ایک الگ طرح کا افسانہ ہے وہ افسانہ کئی دن میرے ذہن میں گھومتا رہا۔ جو افسانہ ایک قاری کے دل و دماغ میں گھر کر جائے وہ قابلِ داد ہے۔ جناب انجم جاوید کو میری طرف سے مبارک باد ضرور دیجئے۔ "تحریکِ ثانی" اُن لوگوں کے لئے نصیحت ہے جو بنا سوچے سمجھے زندگی میں اَن چاہے قدم اٹھا لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر افسانہ معیاری ہے۔ ایک اہم بات جس پر آپ کی توجہ چاہوں گی وہ یہ کہ میرا افسانہ "یہ کیسی محبت" (جو آپ کے رسالے میں میرا پہلا افسانہ ہے اور اُمید کرتی ہوں آگے بھی یہ سلسلہ قائم رہے گا) اس میں ایک لفظ میں نے "جسم" لکھا تھا "ہاں اتنا ضرور وعدہ کر لیا کہ یہ جسم اُس کا نام" آپ نے جسم کی جگہ جسم چھاپ دیا جس سے کہانی پر بہت اچھا اثر نہیں پڑا۔ ایک جسم کو آپ نے صرف "جسم" تک ہی محدود کر دیا۔ شعری حصہ میں کسی ایک کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ آپ جس محنت سے غزلوں اور نظموں کو بخوبی کرلڑی میں پروتے ہیں وہ قابلِ داد ہے۔
(ڈاکٹر رینو بہل)

برادرِ عزیز گرامی وقدر گلزار جاوید صاحب۔
"چہارسُو" کا زیرِ نظر شمارہ (جلد ۱۵ شمارہ مئی جون ۲۰۰۶ء) انجیل رتوں اَن دیکھے موسموں' ان کہی آہٹوں' چہچہاتے پرندوں' گیت گاتے مسافروں' لہلہاتے کھیتوں' جھومتی ہواؤں' اُمڈتے بادلوں' سرسراتی ندیوں' گنگناتی آبشاروں' سرگوشیاں کرتے پہاڑوں' سوچوں میں گم سمندروں' خوشبو بکھیرتے پھولوں پودوں' گدگداتی امنگوں اور ان دیکھے خوابوں سے منسوب ہے۔
اس میں تو مجھے کوئی شک و شبہ نہیں۔ آپ نے یقین سے لکھا ہے آپ اپنا شک دور کر لیجئے' شک و شبے کی گنجائش کہاں۔ شمارہ پڑھ کر یہی احساس ہوا آپ کا ہر شمارہ تخلیقی ادب کا شاہکار اور دنیائے ادب کے اعلیٰ معیار میں منفرد شمار ہوتا ہے۔ مجلسِ مشاورت میں ہم ایسے "قارئین" کو شامل کر کے "چہارسُو" نے حوصلہ مند بنا دیا ہے۔ مشورہ بذاتِ خود تخلیقی کیفیت اور رجحان کو فروغ دیتا ہے اور یہی چہارسُو کا تصور حیات ہے۔ مگر بہ.... دور "چہارسُو" کی حیاتِ اشاعت کو کسی کی نظر نہ لگے۔
آپ نے مشکل کو آسان اور سہل کو مشکل سے دور رکھا ہے۔ یہ کامیابی آپ کی حوصلہ مند "سُو" کا حصہ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ "زر سالانہ" آپ کی دلی دردمندی کا مظہر ہے اور ادب نواز ادب دوست ادبا و شعراء اور قارئین کی جانب ایک لطیف' حقیقت پسندانہ اشارہ ہے۔ ہر شمارہ ادیب و شاعر کو "بیقرار" حصہ دیتا ہے اور معیاری ادب کے قاری کو ادب کے معیار کا خوگر بناتا ہے۔ روحِ ادب کو پاکیزگی اور بانی مدیرِ اعلیٰ سید ضمیر جعفری مرحوم و مغفور کی روح کو تازگی عطا کرنے میں "چہارسُو" اپنا مثبت کردار جس خوش اسلوبی اور خوش خلقی سے نبھا رہا ہے وہ مثال کے قابل ہے۔ گلزار جاوید مدیرِ مسئول "چہارسُو" کا دوسرا نام بلکہ عرفیت ہے اور اس عرفیت کی صداقت بیا جاوید مدیرِ معاون کے بغیر نامکمل ہے اور یوں "زندگی کے ساتھ ساتھ" چہارسُو کا سفر جاری و ساری اور رواں دواں ہے۔
یہ تو ہے "چہارسُو" کا سراسر (پہلا صفحہ) اب ہر صفحہ اول تا آخر ادبی اصطلاح میں مجموعی اعتبار سے چہارسُو قابلِ مطالعہ اور لائقِ استفادہ ہے۔ آخری صفحات جس کی مزین تصویر ہیں۔ زبانِ خلق نقارۂ چہارسُو ہے جو بیطرفی سے

وابستگی کی دلیل ہے۔ (ظفر تاج)

مدیر محترم۔ سلام و رحمت!

اس مرتبہ 'چہارسُو' کا سرورق قاری سے ہم کلام ہوتا ہے کہ "قرطاسِ اعزاز" دویندر اِسر کے نام ہے۔ یوں یہ اپنی نوع کا نہایت جداگانہ انداز 'اعزاز' لگتا ہے... اور دراصل ہر مرتبہ جس حُسنِ ترتیب و جمال و تزئین سے قرطاسِ اعزاز بشمول دیگر تخلیقات ادب کے شائقین و قارئین تک پہنچتا ہے اس کے پس منظر میں کی جانے والی محبت، شاقہ اور سچی لگن 'کسی ادبی عبادت' سے کم نہیں اس لئے اس کار خیر کے لئے۔ حرف حرف سطر سطر چہارسُو پہ تفکر و تحسین کے پھول نچھاور ہوتے ہیں اور ذہن رابطے ہوتے لگتے ہیں۔ جدھر دیکھتے ہیں اُدھر چہارسُو ہے۔ اس پہ مستزاد چہارسُو کے زیرِ نظر شمارے کا انتساب۔ کسی خوبصورت نثری نظم سے کم نہیں تھا!

اس مرتبہ افسانوی حصہ بہت سرسبز و شاداب رہا۔ ڈاکٹر رینو بہل کی کہانی 'محبت' کے موضوع پہ عمومی ڈگر سے ہٹ کے گئی پھر اس کا اختصار اسے اور مختلف کر گیا۔ 'ایک دن' کی تمام تر جاذبیت اس کے مختار کی بیانیے و مختصر فقروں کی ادائیگی میں ہے جو ایک عام دن کو بھی خاص دن میں تبدیل کر دیتی ہے۔ نُسرت عدیل پڑھ کر اس پر افسانے کا کم اور نہایت دلچسپ پُر مزاح مضمون یا لطیف انشائی تحریر کا زیادہ احساس ہوا مزید یہ کہ شعور سے لاشعور تک "مضامین پطرس" کے کتبے بھی اپنی خصوصیات و تجربات سمیت ساتھ ساتھ رہے۔ 'تحزن' کے سنگ سنگ میں تہذیبی و اخلاقی، معاشرتی و سماجی قدروں کی توڑ پھوڑ سے اُبھرتی اور کرداروں سے ماہرانہ بہت محنت کے ساتھ بُھتی کہانی 'عام روش سے ہٹ کے اپنے منطقی انجام تک پہنچتی ہے۔ سانپوں کے بارے میں پڑھنا' جاننا اور دیکھنا انسانی فطرت کو ہمیشہ تجسس و حیران کرتا چلا آیا ہے اسی لئے پُراسراریت بھی مُسلّم ہے جو لمحوں کی گرفت' کے داستانوی اسلوب میں اختتام تک اپنے نکتۂ کمال کو پالیتی ہے۔ 'تحریکِ ثانی' کے سیدھے' کھرے و سچے سبھاؤ میں قاری کے لئے اخلاقی ضوابط و قواعد کی وضعداری' شرعی حدود کی پاسداری اور پند و نصیحت کا پہلو موجود رہتا ہے جو انتہا درجہ بھی ہے اور انتہا درجہ بھی۔ انجام کار فریقِ ثانی کا منکشف ہوا حال کو اخلاقی و جذباتی دھچکا لگانے کے لئے ضربِ کاری رہا جبکہ قاری کے لاشعور میں دُور کہیں یہ انکشاف موجود رہا۔

'تخلیقی عصر' کے مطالعے سے ڈاکٹر رینو و ڈاکٹر عمران سے اُن کی تازہ تخلیقات کے حوالے سے تعارف اچھا لگا۔ ڈاکٹر رینو کی اُردو زبان و ادب سے شیفتگی بہت سراہنے کے لائق ہے اور ڈاکٹر عمران کی کہانیاں بھی دلپذیر ہیں جس کے موضوعات پہ بھی مختلف دنیاؤں کے تہذیب و تمدن سے شناسائی کے ساتھ ساتھ 'مسائل کے سلجھاؤ کی راہیں بھی کہیں کہیں ہموار کرتی ہیں۔

"نشانِ رہ" میں.... شاید اسی کا نام محبت ہے' سے شیفتہ کے حالات و واقعات زندگی بالخصوص شعری و ادبی خدمات صحیح تناظر میں جاننے کا موقع ملا' بالخصوص معاصرین شعراء کے انداز کو متقبول و معروف کرانا نیز اُردو شاعری کے محاسن کو شعری انداز میں پیش کرنا کسی راہنمائی و رہبری سے کم نہیں لگتا ہے۔ اُستاد شیفتہ نے درج ذیل شعر ہر دور کے لئے شعری خصوصیات کے اعتبار سے مرتب کیا تھا۔

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ' لفظ خوش انداز' صاف ہو!

خلیل صاحب نے "اعجاز رحمٰی کی یاد میں" مُسپرِ دِ قلم کر کے نہ صرف اُن کی یادوں کو تر و تازہ و معتبر خوبیوں کو دُہرایا بلکہ علمی و ادبی حیثیت کے تعین سے پُر خلوص حقِ دوستی بھی ادا کیا۔ (شگفتہ نازلی)

محترم گلزار جاوید صاحب! بہت آداب۔

چہارسُو کا تازہ شمارہ ہمیشہ کی طرح تازگی سے بھرپور ہے۔ مُشتر زیدی صاحب کا شعر:

لہو کی تیز گزرتی ہوئی رواں ندی
نئی بہار کا سورج نکلنے والا ہے

ہم سب کو پکار رہا ہے پتہ نہیں ہماری ساعتوں پر سے پردے کب اُٹھیں گے۔ بقول قیصر تجمّی صاحب:

بے ترتیب سی دل میں دھڑکن لئے ہوئے
پھرتے ہیں ہم لوگ لبوں کو سیئے ہوئے

اس شمارے میں جلیل عالی اور ظہیر نوری صاحبان کی غزلیں اچھی لگیں اور نجم جاوید صاحب کا یہ شعر:

یہ ایک سانپ سے کہتا تھا اک سخن جوگی
کمالِ فن مجھے تیرا تجھے میرا کر دے

بہت خوب ہے۔ ستیہ پال آنند کا "سانپ اور سانپ" اور جتیندر بلو کا "فاصلہ" بہت اچھے لگے۔ آپ کا 'ہم رُخ ہوں یہ' "اس سلسلے کی کڑی ہے جس کے ذریعے آپ ہمیں جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہانی اچھی ہے اور بہت بروقت بھی' خدا کرے کہ ہم فوری سبق ہی لے لیں۔ شاہد واحدی کی نظم "آدمیوں کی ہم سفر" لکی نظم ہے جس کی آج اشد ضرورت ہے ورنہ یہاں ملنے دینے والے زیادہ ہیں اور جہاں سب اپنے اپنے میں لگے ہوں وہاں عاصمہ جہانگیر اور ان کے قبیل کی دیگر خواتین اور حضرات کی تعداد بہت کم ہے مگر انھیں سلام کہ اپنے مقصد کے لئے پھر بھی سرگرم ہیں۔ قیصر تجمّی کی "مجھے کچھ بھی نہیں کہنا" میں شکایت بڑی محبت سے کی گئی ہے۔ حمیدہ معین رضوی کا 'شیلٹ تحریک کا ادبی اظہاریہ' "معلوماتی بھی ہے اور سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ (فیصل عظیم)

محترم و مکرم گلزار جاوید صاحب! سلام و رحمت۔

"چہار سُو" کا ہر شمارہ بروقت اور باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے۔ "قرطاسِ اعزاز" اس ادبی جریدے کا امتیاز اور اختصاص ہے۔ دیویندر اِسر کے حوالے سے موجودہ شمارہ نہایت وقیع ہے۔ اُن کی عالمانہ تحریروں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ دیویندر اِسر کے بارے مضامین ان کے ہمہ جہتی کام کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ "چہار سُو" کی خصوصی عطا یہ بھی ہے کہ اس نے تقریباً ہر شمارے میں کسی بڑی ادبی شخصیت کا تعارف (اُس کے تخلیقی کام) کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ گویا ہر شمارہ ایک حوالہ جاتی ادبی دستاویز ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کا کوئی طالب علم، کوئی محقق اور کوئی نقاد "چہار سُو" کی گراں قدر خدمات کو فراموش نہیں کرسکتا۔ حرفِ تحسین و تہنیت قبول فرمایئے۔

(ڈاکٹر غفور شاہ قاسم)

گلزار جاوید جی! السلام علیکم۔

"چہار سُو" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس عنایت کے لیے آپ کا بے حد شکر گذار ہوں۔ "چہار سُو" کا زیرِ نظر شمارہ آپ نے جن اُجلی رتوں اور مظاہرِ فطرت سے منسوب کیا ہے وہ آپ کی محبت اور فسانہ نگارِ فطرت کا عکاس ہے۔ دیویندر اِسر پر گوشہ بھرپور اور قابلِ مطالعہ ہے۔ غزلیں، نظمیں اور افسانے آپ کے حسنِ ذوق کے غماز ہیں۔ آپ جس محنت اور محبت سے "چہار سُو" مرتب فرماتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

(سجاد مرزا)

محترم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون۔

مئی جون کا شمارہ موصول ہوا۔ اس مرتبہ بھی چہار سُو اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس شمارے میں آپ نے مشہور افسانہ نگار دیویندر اِسر کا گوشہ شائع کیا ہے جو قابلِ تحسین ہے۔ براہِ راست میں آپ نے ان کا انٹرویو بڑے اچھے انداز میں کیا ہے جو قاری کو ان کی شخصیت کے بارے میں کافی مواد فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دیویندر اِسر پر مہدی جعفر، شمیم حنفی اور تنویر کشور وکرم کے مضامین بھی بہت جامع اور جاندار ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی خوبصورت ہے۔

(صابر عظیم آبادی)

محترم گلزار جاوید صاحب!

ممنون ہوں کہ آپ نے "چہار سُو" کا تازہ شمارہ بھجوایا۔ میں اسے پڑھ رہا ہوں اور لطف اٹھا رہا ہوں۔ یہ آپ کی شاندار صلاحیتوں کا مظہر ہے اور آپ کے اس فیصلے کی بھی داد دیتا ہوں کہ آپ شخصیات پر شمارے مختص کر رہے ہیں یقیناً آنے والے زمانے میں تحقیق کے حوالے سے طلباء کے لیے یہ نہایت اہم شمارے ہوں گے۔ میری اپنی خواہش تھی کہ ملتان کے بعد میں راولپنڈی/اسلام آباد سے ہم عصر کا دوبارہ اجراء کرتا اور کچھ شماروں کا مواد بھی اکٹھا کر رکھا تھا میں حسن عسکری صاحب اور رشید حسن خاں صاحب پر نمبر نکالنا ارادہ رکھتا تھا لیکن ہارٹ اٹیک، ڈپریشن، بائی پاس نے تمام ہمت اور ارادے متزلزل کردیے ہیں۔ بیالیس، تینتالیس کی عمر میں ان بیماریوں کے بعد دوستوں کا مشورہ ہے کہ صرف اپنی ملازمت اور بقیہ وقت آرام پر توجہ مرکوز رکھوں۔ آپ کو اپنی کتاب "دبستان" پیش کرنا چاہتا ہوں جو ادیبوں کے انٹرویو پر مبنی ہے۔ اس کا دوسرا حصہ بھی آج کل زیرِ ترتیب ہے۔ گزشتہ دو تین برسوں سے میں کتابوں کا سالانہ جائزہ تحریر کر رہا ہوں جو پاکستان میں بھی چھپ رہا ہے اور لندن میں بھی۔ جائزہ کی ایک کاپی آپ کے مطالعہ کے لیے ارسال ہے۔

(اسد فیض)

محترم المقام گلزار جاوید صاحب!

ماہنامہ شب سلامت..... 'چہار سُو' کا شمارہ تو اپنے موضوع حسن، فکر اور جمال دعائیوں کے ساتھ صادر ہوا۔ اس مشفقانہ کرم فرمائی پر ہم آپ کو تشکر دارم کہتے ہیں۔ قرطاسِ اعزاز کی شخصیت دیویندر اِسر کی ذات و فن کے اعتراف میں مختص گوشہ بہ نظرِ عمیق ملاحظہ کیا۔ دیویندر اِسر صحیح معنوں میں ایک جہان گوتی ہیں۔ اُن کی تحریریں از حد متاثر کرتی ہیں، طال اللہ عمرہٗ۔ گجی ناز کے باب میں بھی احباب کا کلام دل خوش کن تھا، کس کس کا نام لیا جائے۔ صد احسنت۔

(پرویز ساحر)

پیارے گلزار جاوید۔

مئی کا مہینہ پاکستان میں کچھ اسی انداز میں گذرا، جس انداز میں آپ نے چہار سُو کا تازہ شمارہ (مئی جون ۲۰۰۹ء) ان الفاظ میں منسوب کیا ہے.... "اُجلی رتوں، ان دیکھے موسموں، ان کہی آہٹوں، چہچہاتے پرندوں، گیت گاتے مسافروں، لہلہاتے کھیتوں، جھومتی ہواؤں، ٹھنڈے سایوں، سرسراتی ندیوں، کھلکھلاتی آبشاروں، سرگوشیاں کرتے پہاڑوں، سوچوں میں گم سمندروں، خوشبو بکھیرتے پھول پودوں، گنگناتی امنگوں اور ان دیکھے خوابوں سے منسوب ہے....!" میں اپنی پاکستان یاترا کے ہر لمحے کو ان ہی الفاظ کے ساتھ اُن تمام دوستوں کے نام منسوب کرتا ہوں جو اُجلی رتوں، موسموں، آہٹوں، چہچہاتوں، مست ہواؤں، سرگوشیوں، مسکانوں، قہقہوں، محبتوں، جذبوں، سنگیت کے سُر لیے تُروں، امیدوں اور آرزوؤں کی مانند اس سفر کے دوران ہر لحظہ میرے ساتھ رہے۔ ہمیشہ کی طرح آپ سرِ فہرست رہے، سنگ سنگ رہے اور اس سفر کو آپ نے حسین یادوں کے بھرپور خزانوں سے مالا مال کردیا۔ محبتوں کے یہ سارے موسم، موسموں کی ساری رنگینیاں اور ان کے تمام خوشنما رنگ آپ کی جھولی میں!

پاکستان کا یہ سفر میرے لیے بیچ بیچ ایک یاترا تھی۔ تین سے آٹھ مئی تک لاہور میں بیگم خیرنی رضوی کے بیٹے کی شادی کی تمام رسومات میں شرکت کی۔ خیرنی کہتی ہیں کہ لدھیانہ (بھارت) میں ان کا مائیکہ ہے اور ہم دل و جان سے خوشی محسوس کرتے ہیں کہ ہم خیرنی کے بھائی ہیں اور اس شادی میں ہم بھی

عزت حاصل ہوئی جو ایک مکین کے گھر بھائی کو ہوتی ہے۔ اس دوران اظہر جاوید (مدیر تخلیق) مجلس اہلِ سخن لاہور، تنظیم تھوسہ، مدیر ''سورج'' صحافی سرفراز سعید، مقبول ملاوی اور کئی اور دوستوں نے ادبی محفلیں سجائیں۔ شائستہ نزہت نے سنگھانہ کلب میں پُر تکلف دعوت دی۔ ان محفلوں میں حمید اختر، انور سدید، خواجہ ذکریا، امجد اسلام امجد، سیما پیروز، تسلیم ورانی، تنظیم بشیر، بشریٰ اعجاز، زرین یٰسنا، عطیہ پروین، اختر شمار، صدیقہ بیگم اور کئی دوسرے پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ۹ مئی کو ریاض پالس، مدیر ادب عالیہ اختر مغل اور چیئرمین پاکستان رائٹرز فاؤنڈیشن کی دعوت پر وہاڑی کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے دوست الیاس بھٹی جو بطورِ خاص نیو یارک (امریکہ) سے تشریف لائے تھے اور جناب شیخ سلیم اختر (کنٹرولر کسٹمز لاہور) نے دورانِ سفر نہ صرف ہمارا ساتھ دیا بلکہ بے پناہ محبتوں اور خلوص سے نوازا۔ ریاض پالس سے ہماری کوئی ذاتی جان پہچان نہیں تھی کوئی خاص تعلق بھی نہیں تھا اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف وہاڑی میں بہت بڑے پیمانے پر جشنِ ہمر، تقریب کا انعقاد کر ڈالا بلکہ پاؤں میں چوٹ کے باوجود مسلسل پانچ دنوں تک سائے کی مانند ہمارے ساتھ رہے۔ ان کی محبت اور کوششوں کا صدقہ محترمہ فرحت پروین، رخسانہ نور، منو بھائی اور آصف ہمایوں لاہور سے، جناب شجاعت بیگ اور خوش بخت شجاعت کراچی سے، ڈاکٹر وحید احمد اسلام آباد سے اور ممتاز اظہر ملتان سے تقریب میں شرکت کے لئے بطور خاص وہاڑی تشریف لائے۔ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں بھی ہمیں ایک تقریب میں شرکت اور شعبہ اردو کے طلبا کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ ملتان ہی میں ایک میڈیا کانفرنس میں شرکت کے علاوہ سابقہ فیڈرل منسٹر جناب ملک تاج راھون اور حبیب بنک پاکستان کی طرف سے منعقدہ دو مختلف تقریبات میں شرکت کرنے کی خوشی حاصل ہوئی۔ ایف ایم ریڈیو پاور 99 نے ایک گھنٹے کا ایک خصوصی پروگرام ہمارے ساتھ Live نشر کیا۔

گگو ایک قصبہ ہے جو تقسیم وطن سے قبل ضلع منٹگمری میں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ساہیوال میں اور آج کل یہ ضلع وہاڑی میں ہے اور یہی جگہ ہماری جنم بھومی بھی ہے۔ ضلع وہاڑی کے دیہی علاقوں کی سوندھی مٹی کی بو باس سے سرشار ہوتے ہوئے ہم پورے ساٹھ برس بعد پاکستانی اور چیچہ وطنی ہوتے ہوئے گگو کی اپنی مقدس دھرتی کو سلام کرنے پُرنم آنکھوں اور بھرے من سے اس مقام پر حاضر ہوئے جہاں ہمارے ننھے قدموں نے ڈگ بھرنے سیکھے تھے اور جہاں کی ہواؤں نے ہمیں زندگی کی مہک عطا کی تھی۔ ہم ساہیوال کے اس مکان میں بھی گئے جہاں ہمارے والد رہا کرتے تھے اور جہاں وہ گنج کاٹن فیکٹری میں ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے۔ ہم ریاض پالس اور شیخ سلیم اختر کے احسان مند ہیں جن کی بدولت ہم اپنے بچپن کی معصومیت سے ہمکنار ہو کر اس احساس میں جیئے جو شاید سب سے اہم، زندہ اور بھرپور ہو سکتا ہے۔

ہفتہ بھر ہم راولپنڈی اور اسلام آباد میں اپنے چھوٹے بھائی اور پریوار کے ساتھ رہے۔ ہمارے بھائی کا نام گلزار جاوید ہے۔ گلزار بھول گئے کہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والا جریدہ چہار سُو پریس میں جانے والا ہے۔ وہ اپنی دیگر کاروباری اور سماجی مصروفیات بھی بھول کر صرف اور صرف ہمارا سایہ بن گئے۔ ان کے لائق فرزند وقار جاوید، جو مصروف ترین شخص ہیں، نے بھی ہمیں اپنا بیش قیمت وقت دیا اور راولپنڈی و اسلام آباد کے گلی محلوں، سڑکوں اور بازاروں کے پُرپیچ راستوں پر نہ صرف ہماری راہنمائی کی بلکہ اپنی گہری ذہانت، بلند سوچ اور اعلیٰ قابلیت سے ہمیں بے حد متاثر بھی کیا۔ اکبر حمیدی ہمارے دوست ہیں اور ان دنوں کافی علیل ہیں۔ ایک شام ہم نے ان کے ساتھ گزاری۔ ایک بھرپور شام کا لطف ہمیں اپنے عزیز دوست افسانہ نگار منشا یاد نے عطا کیا۔ ہمیشہ کی طرح سلطان رشک مدیر نیرنگ خیال نے اپنی رہائش گاہ پر ایک پُرتکلف دعوت کے ساتھ دو درجنوں ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا موقع فراہم کیا۔ اپنے ایک اور عزیز دوست کہانی کار رشید امجد سے ملاقات بھی دو تین بار ہوئی۔ گلزار جاوید مدیر چہار سُو راولپنڈی کے زیر اہتمام اور فخر زمان چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان کے تعاون سے 17 مئی کو رائٹرز ہاؤس اسلام آباد میں ایک شاندار ادبی تقریب منعقد ہوئی جس میں فخر زمان، گلزار جاوید، آغا امیر، خواجہ مسعود، منشا یاد، سلطان رشک، انعام الحق جاوید، طارق شاہد اور بہت بڑی تعداد میں قلمکاروں صحافیوں نے اسلام آباد کلب میں چیدہ ادبی شخصیتوں کے ہمراہ کھانے کی دعوت کا اہتمام کیا۔ یہیں پر ہماری ملاقات محترمہ پروین آغا سے ہوئی۔ اُن کے شوہر آغا صاحب کا تعلق لدھیانہ سے ہے۔ پروین صاحبہ پروین شاکر ٹرسٹ کی چیئرپرسن ہیں اور اس پریوار سے برسوں پرانے ہمارے مراسم ہیں۔ ان سب سے مل کر ہمیں بہت اچھا لگا۔ ہمارے معزز احباب میں احمد فراز صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ان دنوں وہ بھارت کے دورے پر تھے۔ جناب فتح محمد ملک اور یوسف ظاہر صاحب اسلام آباد سے باہر تھے۔

پاکستان میں قیام کا آخری ہفتہ پھر سے لاہور میں گزرا اور اس دوران ہم نے ڈاکٹر وزیر آغا، جناب احمد ندیم قاسمی اور آپا قدسیہ بانو سے ملاقات کی۔ ہماری دوست محترمہ فرحت پروین اور بشریٰ اعجاز نے دعوتوں کا اہتمام کیا۔ کے۔ ایم۔ اعظم صاحب نے پانچ ستارہ ہوٹل آواری میں ایک پُرتکلف دعوت دی جہاں دیگر دوستوں کے علاوہ تبسم کاشمیری صاحب سے بھرپور ملاقات رہی۔ ایک اور دعوت شیزان ہوٹل میں ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید کی طرف سے ہوئی۔ لاہور میں قیام کے دوران آخری روز چھبیس مئی قبل از دوپہر ایک پُرتکلف دعوت مع محفلِ دوستاں کا اہتمام ہمارے پرانے اور پیارے دوست عطا الحق قاسمی نے اپنی رہائش گاہ پر کیا جہاں شہزاد احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، احمد عقیل روبی، امجد سلیم، سید شعیب، عزیز خالد اقبال، یاسر اعظم کاسری، ڈاکٹر اجمل نیازی،

منزہ صدف اور ارشد جاوید کے علاوہ کئی دوسرے قلم کاروں سے ملاقات کا موقع ملا۔ اور بعد دوپہر الوداعی ملاقات ہم نے بیگم بشریٰ رحمٰن سے کی۔ روزنامہ جنگ لاہور کے ادبی ایڈیٹر جناب رؤف ظفر سے ہم نے انٹرویو کا وعدہ کر رکھا تھا جسے ہم دیر رات پورا کر سکے۔ اگلی سویرے ہوائی اڈہ پر الوداع کہنے کے لئے یا غنی ہالس شیخ سلیم اختر اور کمشنر جناب پیر نصیر الدین موجود تھے۔

یہ سفر ہمیشہ کے لئے محبتوں اور دوستیوں کا سفر تھا اور چلتے چلتے ہوں کہ اُن حسین لمحوں کا سفر تھا جسے میں اپنی یادوں سے شاید کبھی الگ نہ کر سکوں گا۔ بات چہارسُو کے انتساب سے شروع ہوئی تھی۔ جس طرح ان دیکھے خوابوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا اسی طرح محبتوں اور یادوں کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ سلسلے بنے رہنے چاہئیں۔ جیون کے سکھ کے لیے یہ ضروری ہیں۔ دویندر اسّر کا مقام ظاہر کرنے کے لئے مبارکباد۔ بلاشبہ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جو بطور فنکار دانشور، مفکر، نقاد، "بڑی زبان کا بڑا ادیب" ہونے کی حقیقت کا روپ دیتی ہیں۔ براہ راست سے اس بڑے ادیب کا نکھرا اور سنورا ہوا روپ سامنے آتا ہے۔ تذکرہ کشور کرم کا مضمون "دوئے جسے لوگ بھول گئے" دویندر اسّر کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف کراتا ہے۔ مہدی جعفر نے ان کی افسانہ طرازی پر اور شمیم حنفی نے اُن کی مکالمہ نگاری پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ قارئین یقیناً ان قلمی کاوشوں سے مستفید ہوں گے۔

موجودہ شمارے میں سات افسانے اور ان سات افسانوں میں شمشاد احمد کا "ایک دن" دیپک بدکی کا "سرحدیں" اور محمد ارشاد جاوید کا "تخریبی ثانی" "بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ شمشاد احمد نے نفسیات کے تاروں سے ذہن کو جھنجھوڑا ہے۔ دیپک بدکی نے ایک بیباک کہانی لکھ کر سرحدوں پر انسان کی قسمت کو جھنجھوڑا ہے اور محمد ارشاد جاوید نے ایک مخصوص سماج کی انسانی زندگی کے رسم و رواج پر نفسیاتی چوٹ کی ہے۔ سب کے لئے زورِ قلم ہو زیادہ۔

حنیف ترین نے طویل نظمیں لکھ کر اُردو کے شعری ادب میں اپنی خاص پہچان بنائی ہے۔ خلیل ادیب نے اعجاز راہی کی یاد میں ایک یادگاری مضمون لکھا ہے اور ان یادوں کا نذرانہ کیا ہے جو ذوقی ہیں اور پیاری بھی ہیں۔ اعجاز راہی کی خوبصورت شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ تخلیق ہمسر کے تحت علیم سکندر علی نے حسب سابق کتابوں پر خوبصورت تبصرے شائع کئے ہیں۔ رن رابطے چہارسُو کی انفرادی حیثیت کو اجاگر کرتی ہے۔ قلمکار دوستوں کی محفل خوب جمی ہے۔ حیدر حسین رضوی نے اپنے طویل خط میں جہاں معلومات مہیا کی ہیں وہاں تنقید کے موضوع پر گہری گہری بھی کہی گئی ہیں۔ اس موضوع پر ایک مکالمہ بھی شروع ہو سکتا ہے۔

چہارسُو خوب نکھر چکا ہے۔ اس کی لاثانی خوبصورتی کو قائم رکھنے میں آپ کامیاب رہیں گے ان امیدوں اور محبتوں کے ساتھ۔

(کیول دھیر)

بقیہ: کیول دھیر کی کہانیاں

اس سیلاب میں جنگ کے جنون سے پاگل ہوئے وہ جنگ باز ڈوب جائیں گے جو انسان اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ جو امن، پیار اور خلوص کے قاتل ہیں۔

☆ یہ دنگے کیوں ہوتے ہیں ڈاکٹر ابھیدیم کے الفاظ بھٹک رہے تھے "خدا نے تمام انسانوں کو ایک سا بنایا ہے پھر انسان انسان کا خون کیوں بہاتا ہے۔ ہم اپنے ہی جیسے لوگوں کو جلاتا کیوں ہے۔ کیوں ڈاکٹر بابا؟"

☆ مجھے جنگ سے شدید نفرت ہے جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں، یہ مسائل کو جنم دیتی ہے۔ اس سے نفرت کی آگ دہکتی ہے۔ اس سے انسانیت قتل ہوتی ہے۔

☆ کریم نگر کی جوگی پارک بستی امن و آشتی اور بھائی چارے کا مسکن تھی، دیکھتے ہی دیکھتے مذہبی جنون اور نفرت کا شکار ہو گئی۔ ہندو گوردوارے جانے سے کترانے لگے۔ سکھ مندروں کی طرف سے منہ موڑ گئے۔ گلیوں کوچوں میں جو عورتیں کبھی آپس میں مل بیٹھ کر دکھ سکھ کی باتیں کیا کرتی تھیں صرف اپنے ہی فرقے کی عورتوں سے ملنے جلنے لگیں۔ کاروبار میں بھی اپنے اپنے فرقے کے لوگوں کو ترجیح دی جانے لگی۔ بعض لوگوں کی جنونی کیفیت اس حد تک بڑھی کہ وہ سفر بھی اپنے ہی فرقے کے لوگوں کی سواری میں کرنے لگے۔

ان واقعات کے بارے میں پڑھتے ہوئے بار بار دونوں ترقی پذیر پڑوسی ممالک کے ایک جیسے سیاسی اور سماجی حالات اور مسائل کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دونوں ممالک کے عوام ایک جیسی صورت حال سے دوچار رہتے ہیں۔ ادھر اگر گوردوارے اور مندر میں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے تو یہاں مساجد اور امام بارگاہوں میں۔ یہ کس کی سازش ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے۔ ہم ایک دوسرے پر الزام تراشی کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنے اصلی دشمن کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ مذہبی جنون پیدا کر دیا جاتا ہے اور ہر کوئی بارود کے ڈھیر پر بیٹھا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات کو بہانہ بنا کر فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ "بھوکا ننگ" میں بازار میں کیچڑ کاؤ کے پانی کے چند چھینٹے پڑنے سے بات بڑھ جاتی ہے اور اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات اور دہشت گردی کے سلسلے میں ان کی بہت سی کہانیاں ہیں جو امن اور انسانیت کا درس دیتی ہیں لیکن "دہشت" نامی کہانی بہت ہی گہرے اور دیرپا تاثر کی حامل ہے۔ غالباً ایسی ہی کہانیوں کی بنا پر ڈاکٹر وزیر آغا جیسے اہم نقاد اور دانشور نے ان کے بارے میں کہا کہ "ان کے ادب کے ذریعے قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسان دوستی، آپسی بھائی چارے اور محبت کی فضا قائم کرنے کے عزم سے میں بہت متاثر ہوا ہوں"

بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں امن اور انسانی بھلائی کے بہت سے تمغے اور ایوارڈ بھی اسی لئے ملے ہیں۔ میں ان کی درازی عمر اور تخلیقی توانائی کی دعا کرتا ہوں۔